

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد ۲

لفادار

حضرت مولانا صفوی عبدالحمید صاحب سواتی

خطیب جامع مسجد نور گوہر بھٹوالہ

طبع سولہ

(بمملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ و آیت ۱۳۱ تا ۱۳۲)
 حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سہالی خطیب جامع مسجد نور کوہ جرنوال
 الفان لعل دین - ایم اے علوم اسلامیہ
 ۴۹۶ صفحات
 پانچ سو (۵۰۰)
 سید الخطاطین حضرت شاہ فیض الحسنی مدظلہ
 محمد امین الدقاق درہی کوہ جرنوال
 مطبوعہ دروس القرآن فاروقی کتب کوہ جرنوال
 ۱۵۵ روپے

نام کتاب
 افادات
 مرتب
 صفحات
 تعداد صفحات
 مرقع
 نگار
 قیمت

دسمبر ۲۰۰۷ء بمطابق ذیقعد ۱۴۲۸ھ

ملنے کے پتے

- (۱) مطبوعہ دروس القرآن محلہ فاروقی کتب کوہ جرنوال (۵) کتب خانہ رشیدیہ، ریلوے بازار، راولپنڈی
- (۲) دارالافتاء، دارالحدیث، دارالعلوم کوہ جرنوال (۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرہان پور، کیتھمن
- (۳) مطبوعہ قادیان، الفضل، دارالحدیث، دارالعلوم (۷) مطبوعہ علمیہ، نزد جامعہ اسلامیہ، کاتھمن، کاتھمن
- (۴) مطبوعہ سید احمد شہید، دارالحدیث، دارالعلوم (۸) اسلامیہ کتب خانہ، اٹک، اٹک
- (۵) مطبوعہ رشیدیہ، برقی روڈ، کوہ

فہرست مضامین

دروس القرآن پارہ ۱ جلد ۱

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۶	استقامت کی ضرورت	۱۵	پیش لفظ (زالعن علی بن عباس) ایم اے علوم اسلامیہ لاہور
"	مجاہد	۱۹	سخنبد گھنٹی (ذکر شرف فاضل در نصرة العلوم و دین الدار)
۳۷	سجاد	۳۳	درس اول (آیت ۱۲)
۳۸	درس دوم (آیت ۱۳)	"	سورۃ اور آیت
"	محکمات، متشبیہات، مقطعات	"	آیت کے مختلف معانی
۳۵	۱۲۱ م سورۃ اور ان کی شکلیں	۲۵	سورتوں اور آیتوں کی ترتیب
"	حررت، تعلقات پر مضمون کے باب ۱	۲۷	سورتوں کی اندر محیط طوالت
۳۶	حضرت صدیق اکبرؓ	۲۷	ذبح تسمیہ
"	حضرت علیؓ	"	مکی اور مدنی سورتیں
"	حضرت ام شمسؓ	۲۸	ترتیب تلاوت کی نسبت
"	حضرت ابن مسعودؓ	"	فہرست سورۃ
۳۷	حضرت ام رانہؓ	۲۹	مضامین سورۃ
"	مقطعات اسمائے الہی ہیں	۳۰	نام اور کوائف
۳۸	مقطعات اسمائے قرآنی ہیں	۳۱	سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں ربط
"	مقطعات بحیثیت تبلیغ	"	مضامین
۳۹	اہم اخص شعلی رائے	"	معرفت الہی
"	عبد الشہین عباس کا قول	۳۲	ثبوت نبوت

۵۵	انسانوں سے تین گروہ	۴۰	ابو ہریرہؓ کی تحقیق
۵۶	کفر و معنی	"	شیخ ابن عربی کا قول
"	کفر کی مختلف اقسام	۴۱	نزول مقطعات معجزہ سرور کائنات
"	کفر و انکار	"	امام بیہقی کا قول
۵۷	کفر و خود	"	امام شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ
۵۸	کفر و غرور	۴۲	مولانا مودودی کا نظریہ
"	کفر و نفاق	"	مذہب اہلبی کا قول
"	کفر و شک	"	عزت خضر
۵۹	کفر و بہت	۴۳	درس سوم ۱ (آیت ۵۱)
"	کفر و تامل	"	لفظ ذلت کی حکمت
۶۰	عملی کفر	۴۵	لفظ ذرینب کا مفہوم
"	کفر و دہریت	۴۶	مولانا سیح السنہ کی تفسیر
۶۱	ایک اشکال اور اس کا جواب	"	منہجین کے لیے ہدایت
۶۲	درس پنجم ۵ (آیت ۷۱)	۴۸	تقویٰ کی تعریف
"	گزشتہ سے بیروت	۴۹	تقویٰ کے تین درجات
"	ان آیات کا مسدق کون ہیں	"	مستحق کون ہیں
۶۵	مہر لگانے کا مطلب	۵۱	ایمان بالغیب
۶۶	دلوں کی بیاہی	۵۲	اقامت صلوٰۃ
۶۷	اعضائے ریسرچ میں باز پرس ہوگی	"	انفاق فی سبیل اللہ
۶۸	اعضائے ریسرچ میں سے قلب کی اجمیریت	۵۳	کتاب کاوی پر ایمان
۶۹	غدا ب عظیم کی وجہ	"	ایمان بالآخرت
"	اعضائے ریسرچ کام میں ایک ہے	۵۴	ہر بیت ہفتہ درگ
۷۰	درس ششم ۱ (آیت ۱۲۸)	۵۵	درس چارم ۱ (آیت ۷۱)

۹۰	منافقین کی مثال	۷۱	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	انذہبوں کی مختلف قسمیں	۷۲	منافقین کا گروہ
۹۳	منافقین کی بنی	۷۳	منافقین کی قسمیں
۹۵	درس ششم : (آیت ۱۲۰ تا ۱۲۹)	۷۴	نفاق دینی باری ہے
"	گزشتہ سے پیوستہ	۷۵	فادنی اور مض
۹۶	منافقوں کی دوسری مثال	۷۶	منافقین کی دھوکہ دہی
"	اعتقادی اور عملی منافق	۷۷	حکومتی سطح پر نفاق
"	دل کی چار قسمیں	۷۸	غداپ عظیم اور غداپ ایسم میں فرق
۹۷	ایمان اور نفاق کی مثال	۷۹	درس ہفتم : (آیت ۱۲۳ تا ۱۲۶)
"	قلب کی چھ حالتیں	۸۰	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بارش کی مثال	۸۱	حقیقی ایمان
۹۹	منافقین کی بے بسی	۸۲	معیار حق
۱۰۰	درس و حکم : (آیت ۱۲۱ تا ۱۲۲)	۸۳	انسان اور اس کا دل
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۴	حقیقی انسان کون ہیں
"	مخاطبین قرآن	۸۵	بیوقوف کون ہیں
۱۰۲	چار ہم مضامین	۸۶	منافقوں کی دوسری پالیسی
"	ترتیب	۸۷	استہزاء من اللہ کا مفہوم
۱۰۳	صفات النبی	۸۸	ہدایت کے بدلے ٹھکراہی
"	معرفت النبی	۸۹	درس ہشتم : (آیت ۱۲۷ تا ۱۲۸)
۱۰۵	عبادت النبی	۹۰	گزشتہ سے پیوستہ
۱۰۶	وجود النبی پر دلائل	۹۱	کتب آسمانی اور اسناد
۱۰۹	درس یازدہم : (آیت ۱۲۹ تا ۱۳۰)	۹۲	تفسیر انعام القرآن
"	توجہ عبارت کے لیے شرط ہے۔	۹۳	مثال کی حکمت

۱۳۰	۱۱۰	گزشتہ سے پیوستہ	۱	لائق توجہ
۱۳۱	۱۱۱	حقیر چیزوں کی مثالیں	۲	کب اتنا اور اس کا جواب
۱۳۲	۱۱۲	حیا کی مختلف قسمیں	۳	عبادت کیوں ضروری ہے
۱۳۳	۱۱۳	ہدایت اور گمراہی	۴	عبادت کے لائق صرف ذات باری ہے
۱۳۴	۱۱۴	فاسق کا معنی	۵	زمین کے فوائد
۳۵	۱۱۵	ہرود و منافقین کی عمدہ نشانی	۶	آسمان اور پانی کی نعمت
۱۳۶	۱۱۶	قطع رحمی	۷	لفظ نہ کا معنی
۱۳۷	۱۱۷	صلہ رحمی	۸	نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں
۱۳۸	۱۱۸	فساد فی الارض	۹	شرک فی المثلت
۱۳۹	۱۱۹	نافقین کی ناکامی	۱۰	شرک فی العادت
۱۴۰	۱۲۰	درس چہار و ہجتم ۱۴ (آیت ۲۸ تا ۲۹)	۱۱	شرک کی دوسری قسمیں
۱۴۱	۱۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۱۲	شرک خفی
۱۴۲	۱۲۲	اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر	۱۳	اطاعت بغیر اللہ
۱۴۳	۱۲۳	موت و حیات تصرف الہی میں ہے	۱۴	درس دواز و ہجتم ۱۴ (آیت ۲۲ تا ۲۵)
۱۴۴	۱۲۴	محاسبے کا عمل	۱۵	گزشتہ سے پیوستہ
۱۴۵	۱۲۵	میت دفن کرنے کے آداب	۱۶	قرآن پاک خاص معجزہ ہے
۱۴۶	۱۲۶	تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں	۱۷	عبد با عزت لفظ ہے
۱۴۷	۱۲۷	موت سامان عبرت ہے	۱۸	قرآن بطور جلیج
۱۴۸	۱۲۸	شیار میں اسل باحت ہے	۱۹	منکرین قرآن کی سزا
۱۴۹	۱۲۹	آسمانوں کی تخلیق	۲۰	ایمانداروں کے لیے بشارت
۱۵۰	۱۳۰	علیم کل موت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے	۲۱	بچپوں میں مشابہت
۱۵۱	۱۳۱	عبادت الہی لازم ہے	۲۲	بائتہ بیویاں
۱۵۲	۱۳۲	درس پانز و ہجتم ۱۵ (آیت ۳۰)	۲۳	درس سیز و ہجتم ۱۵ (آیت ۲۶ تا ۲۹)

۱۴۰	جنت سے نزع	۱۴۰	گزشتہ سے بیروت
۹۱	زمین ہی اصل ٹھکانہ ہے	۱۴۱	موضوع
۱۴۲	درس ہشودھم (آیت ۲۹ تا ۳۴)	۱۴۸	ہر ضعیف بادشاہ ہوگا
۱۴۳	گزشتہ سے بیروت	۱۴۹	تخلیق انسانی سے قبل کے اوراق
۱۴۴	حضرت آدم علیہ السلام کی قرب	۱۵۰	قرشتوں کا مادہ تخلیق
۱۴۵	حضور علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام پر فیصلت	۱۵۱	بغات اور شیاطین
۱۴۶	زمین پر اترنے کا حکم	۱۵۲	انسان کا مادہ تخلیق
۱۴۷	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کی حاجات	۱۵۳	حضرت آدم علیہ السلام خلیفۃ اللہ ہیں
۱۴۸	جنت کے تحفے	۱۵۴	مسک خدات
۱۴۹	حضرت آدم علیہ السلام کا مقام نزول	۱۵۵	درس شانزدہم (آیت ۳۲ تا ۳۴)
۱۵۰	بعض اہل مہم السلام کے پیشے	۱۵۶	گزشتہ سے بیروت
۱۵۱	توبہ کی قبولیت	۱۵۷	آدم علیہ السلام کو کن چیزوں کے نام سکھائے گئے
۱۵۲	توبہ کی نثر الط	۱۵۸	ہوائیہ کا امتحان
۱۵۳	نہیں یہ اترنے کی حکمت	۱۵۹	آدم علیہ السلام کی کامیابی
۱۵۴	توبہ کی حقیقت	۱۶۰	درس ہفدہم (آیت ۳۴ تا ۳۶)
۱۵۵	توبہ کے متبعین	۱۶۱	قرشتوں کی سجدہ ریزی
۱۵۶	کفار و مکذبین	۱۶۲	خدا تعالیٰ کے سرکوب ہر سجدہ حرام ہے
۱۵۷	درس نوزدھم (آیت ۳۶ تا ۳۸)	۱۶۳	قرشتوں کے سجدہ کی بعض ترکیبات
۱۵۸	نور بن اسرائیل	۱۶۴	ابلیس کا انکار
۱۵۹	بنی اسرائیل پر انعامات	۱۶۵	حمد اولین گناہ ہے
۱۶۰	بنی اسرائیل کی تہ شکنی	۱۶۶	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں
۱۶۱	ایمان بالقرآن	۱۶۷	شجر ممنوعہ
۱۶۲		۱۶۸	شیطان و سور

۲۱۲	۱۸۹	دنیا کی محبت	خیریت خاص نعمت ہے
۲۱۳	۱۹۰	تنبیس اور کتنا حق	مرد چالیس کی اہمیت
۲۱۴	۱۹۱	درسِ بستم ۲ (آیت ۴۳ تا ۴۶)	بنی اسرائیل کی گوسا پرستی
۲۱۵	۱۹۲	گنہگار سے بیعت	مختلف قوموں کے ایک دوسرے پر اثرات
۲۱۶	۱۹۳	قبولِ حق سے انکار کی وجوہات	مسئلہ حلال
۲۱۷	۱۹۴	حبِ مال و جاہ کی بیماریاں	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی
۲۱۸	۱۹۵	بیماریوں کا علاج	پکڑے گئے پجاریوں کا قتلِ عام
۲۱۹	۱۹۶	نماز جامع عبادات ہے	درسِ بست و ستر (آیت ۵۵ تا ۵۷)
۲۲۰	۱۹۷	نماز باجماعت	ربط آیات
۲۲۱	۱۹۸	قول و فعل میں تضاد	رویت انہی کی خواہش
۲۲۲	۱۹۹	صبر و صلوٰۃ کی برکات	بنی اسرائیل کو سزا
۲۲۳	۲۰۰	رجوع الی اللہ	رویت الہی اس جہان میں ممکن نہیں
۲۲۴	۲۰۱	درسِ بست و یکٹ (آیت ۴۴ تا ۵۰)	بنی اسرائیل کو جلاک کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا
۲۲۵	۲۰۲	ربط آیات	جہاد سے فرار
۲۲۶	۲۰۳	بنی اسرائیل کی فضیلت	بادل کا سایہ
۲۲۷	۲۰۴	اسلامی تاریخ کی حفاظت	من اور سلوی
۲۲۸	۲۰۵	امت مسلمہ کی برتری	پنپنے آپ پر ظلم
۲۲۹	۲۰۶	برتری کا معیار تعزلی ہے	درسِ بست و چہار (آیت ۵۸ تا ۵۹)
۲۳۰	۲۰۷	مسند شفاعت	ربط آیات
۲۳۱	۲۰۸	فرعون سے نجات	بستی میں داخلہ
۲۳۲	۲۰۹	فرعون کی مذبذبابی	کچھہ شکر
۲۳۳	۲۱۰	درسِ بست و دو (آیت ۵ تا ۵۴)	استغفار کی برکات
۲۳۴	۲۱۱	نزولِ توراۃ	

۲۵۰	آیات النبی کا انکار	۲۳۱	حکم خداوندی میں تبدیلی
"	نبیاء عیسم السلام کا قتل	۲۳۲	عالمی قوانین اور حق شعور
۲۵۱	نافرمانی اور حد سے تجاوز	۲۳۳	وراثت میں لڑکی کا حصہ
۲۵۲	درس سبت و ہفتہ (آیت ۶۲)	"	ظلموں کا حشر
"	قانونِ نجات	۲۳۴	زمین کی آبادی اور بربادی
"	مذہبِ عالم	۲۳۵	درس سبت و پنجشنبہ (آیت ۶۰)
۲۵۳	اہل ایمان	"	رابطہ آیات
"	ہادؤ کا مغموم	"	بنی اسرائیل کا طلب آب
۲۵۵	یسودی کی وجہ تسمیہ	۲۳۶	استحقاقِ حقیقت
"	یسودی عقائد	"	استحقاقِ کافریت
۲۵۶	نصاری کی وجہ تسمیہ	۲۳۷	ضربِ گیمی
۲۵۸	نصاری کے عقائد باطلہ	۲۳۹	پانی کی تقسیم
۲۵۹	صابی کون ہیں	۲۴۰	ایک اعتراض اور اس کا جواب
"	صابیوں کے عقائد	۲۴۱	معجزہ اور کرامت
۲۶۱	حنیفی بقیہ صابی	۲۴۲	ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر
"	ایمان باللہ	۲۴۳	فائدہ فی الارض
۲۶۲	ایمان بالآخرت	۲۴۵	درس سبت و شششنبہ (آیت ۶۱)
"	اعمالِ صالحہ	"	رابطہ آیات
۲۶۴	درس سبت و ہشتشنبہ (آیت ۶۳-۶۴)	۲۴۶	غلامی کے اثرات
"	بنی اسرائیل کا عہد	"	طعاسر کی تبدیلی
۲۶۵	ارتقاءِ طور	۲۴۷	کاشتکاری و مشقت طلب کام ہے
۲۶۶	دین میں جبر نہیں	۲۴۹	پیشے بمطابق فضیلت
۲۶۷	اسماکِ باسکتاب	"	یہودیوں کی ذلت و رسوائی

۲۶۸	مصلحت النبی	قرآن کی پابندی
۲۶۹	آئی کی نشانیاں	بنی اسرائیل کی عمدہ شکنی
۲۷۰	باؤخر مجبور ہو گئے	درس بست و نہ (آیت ۶۵ تا ۶۶)
۲۷۱	فصول و صومات کا شانہ	یہود کا مقدس دن ہفتہ
۲۷۲	واقو قتل	مجمعہ کی فضیلت
۲۷۳	احیائے موتی بھور مجزہ	یہود کی قانون شکنی
۲۷۴	قتل و زنت سے جوہت	یہود کے تین گروہ
۲۷۵	درس کی وڈو (آیت ۱۰۴)	انسان بد رہن گئے
۲۷۶	قادت قلبی	جیل سازی بڑی خصلت ہے
۲۷۷	پتھروں سے زیادہ سخت دل	جائز جیل سازی
۲۷۸	پتھروں کے فوائد	تبدیلی اشکال کی توجیہ
۲۷۹	سجدہ تقرب الی اللہ کی علامت ہے	نشان عبرت
۲۸۰	بعض اکابر دین	درس سکی (آیات ۱۶۷)
۲۸۱	مسلمانوں کی ناکامی کی وجہ	رابط آیات
۲۸۲	درس سکی و سہ (آیت ۵ تا ۷)	واقعہ ربط
۲۸۳	رابط آیات	وجہ قتل
۲۸۴	یہود کی طرف سے نا اہلی	قانون قدامت
۲۸۵	احکام میں تحریر	کثرت سوال سے بچو
۲۸۶	یہود کی بہت دومی	نبی کے قطع حلقی
۲۸۷	یہود کے ساتھ موافقت اور ان کی مخالفت	ٹھانڈا رہے
۲۸۸	منہ حقین کی چاکیاں	نوشہ لہجہ باز سے
۲۸۹	یہود کی موجودہ روز دینی	درس سی ویکٹ (آیت ۱۰۰ تا ۱۰۳)
۲۹۰	تورہ میں تحریر	رابط آیات

۲۲۲	درس سی و ہفتم (آیت ۸۲ تا ۸۶)	تحریر اور مسلمان
۲۲۳	گزشتہ سے پیوستہ	تحریر کرنے والوں کو دئیے
۲۲۴	نمونہ نوح اور جہاد طنی	درس سی و چہارم (آیت ۸۰ تا ۸۲)
۲۲۵	بنی اسرائیل کی عہد شکنی	یہودیوں کے باطل عقائد
۲۲۶	یہودیوں کی باہمی لڑائیاں	عہد ندادندی
۲۲۷	مسلمانوں کی حالت زار	باطل عقائد کی بنیاد
۲۲۸	سنت تعالیٰ نام الغیب ہے	مسلمانوں کے باطل عقائد
۲۲۹	درس سی و ہشتم (آیت ۸۷ تا ۹۰)	قازق نجات
۲۳۰	کتاب نور رسول	کافر اور مشرک دائمی جہنمی ہیں
۲۳۱	حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور معجزات	جنت کی بجائی
۲۳۲	روح القدس	درس سی و پنجم (آیت ۸۳)
۲۳۳	انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سلوک	ربط آیات
۲۳۴	یہودیوں کا زعم باطل	توحید کے دو پہلو
۲۳۵	یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت	بنی اسرائیل کے مختلف عہد
۲۳۶	نہود اور نزول قرآن	معرفت الہی
۲۳۷	انگریزوں کا عمل	الدین سے حسن سلوک
۲۳۸	بنی انغر الزوال علیہ السلام سے حسد	قرابتداروں کے حقوق
۲۳۹	غضب پر غضب	یتیم، مسکین اور فقیر
۲۴۰	درس سی و نہم (آیت ۹۱ تا ۹۶)	درس سی و ششم (آیت ۸۳)
۲۴۱	گزشتہ سے پیوستہ	گزشتہ سے پیوستہ
۲۴۲	دعوت ایمان	تہذیب اخلاق
۲۴۳	نبیاء علیہم السلام کا قتل	حسن سکون
۲۴۴	یہود اور پرستی	نماز اور زکوٰۃ

۲۵۰	موت کی آرزو	۲۵۰	نبیاں بیوی میں جہانی
۲۵۱	طویل العمر کی خواہش	۲۵۱	نافع اور مضار علم
۲۵۲	موت و حیات کی طلب	۲۵۲	بیوروہوں سے موفقت
۲۵۳	درس چیل (آیت ۱۱۰-۹۷)	۲۵۳	درس چیل و دو (آیت ۱۰۴-۱۰۷)
۲۵۴	شانِ نزل	۲۵۴	رابط آیات
۲۵۵	نزل وحی کی مختلف صورتیں	۲۵۵	بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی
۲۵۶	مقرب فرشتے	۲۵۶	نصوحیہ اسلام کی نظر ثقات
۲۵۷	جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی	۲۵۷	اہل ایمان کو خطاب
۲۵۸	اہل ایمان کے لیے بشارت	۲۵۸	مشتبہاتِ ظن کے استعمال کی ممانعت
۲۵۹	فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے	۲۵۹	پیسمر کے لیے عطیہ رکھنا استعمال درست نہیں
۲۶۰	مقربین کا عادی لغتی ہے	۲۶۰	نبو اکامیل سے حد
۲۶۱	واضح نشانیاں	۲۶۱	تفسیر آیات کی وجوہات
۲۶۲	کتاب اللہ سے روگردانی	۲۶۲	بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے
۲۶۳	درس چیل ویکٹ (آیت ۱۰۲-۱۰۳)	۲۶۳	درس چیل ویکٹ (آیت ۱۰۲-۱۰۳)
۲۶۴	شیطان کا اتباع	۲۶۴	رابط آیات
۲۶۵	حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگر ہو چکا الزام	۲۶۵	بیوروہوں کے سوالات
۲۶۶	جادو کے ذرائع	۲۶۶	شرعیہ کے حالات
۲۶۷	ہر دوت اور ہر دوت کی معنی شہادت	۲۶۷	نہرین محمدی
۲۶۸	ہر دوت اور ہر دوت کے واقعہ سے انکار	۲۶۸	کثرتِ سوالات کی ممانعت
۲۶۹	سحر کیا ہے ؟	۲۶۹	اہل کتاب کے باطنی ارادت
۲۷۰	کیا ہر دوت اور دوت انسان تھے ؟	۲۷۰	محمد بن زین بیکاری سے
۲۷۱	کیا سارا جادو کفر ہے ؟	۲۷۱	غیر مسلم ماحول اقوام
۲۷۲	جادوگر کی سزا	۲۷۲	محمد بن زین بیکاری سے

۴۱۱	خوش و مضبوط	۲۹۱	قرآن پاک کے غلات سازس
۴۱۲	استقبال قبلہ	۲۹۲	نماز اور زکوٰۃ
۴۱۳	درس چیل و شش ۴ (آیت ۱۱۹ تا ۱۲۱)	۲۹۳	نیکی کا بدلہ نیکی
"	اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے	۲۹۴	درس چیل و چہار ۴ (آیت ۱۲۲ تا ۱۲۴)
۴۱۵	تشبیہ اور شرک	"	ربط آیات
"	مُحَمَّدٌ كَاسْمِ	"	یسور و نصاریٰ
"	مَلِكٍ لِّدَوْلَةٍ	۲۹۶	نجات کا دار و مدار
۴۱۶	صفت اربع	۲۹۷	اتباع خداوندی
"	اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبت	۲۹۸	نیک نیتی
۴۱۷	اللہ تعالیٰ سے کلام کی خواہش	۲۹۹	اعمال صالحہ
۴۱۸	حضور علیہ السلام کے معجزات	"	فرقہ بندی ذریعہ نجات نہیں ہے
"	حضور علیہ السلام کے لیے تسلی	۳۰۰	قانون نجات
۴۲۰	درس چیل و مفت ۴ (آیت ۱۲۲ تا ۱۲۴)	"	اجر عظیم
۴۲۱	گذشتہ سے بہتر	۳۰۱	درس چیل و پنج ۴ (آیت ۱۲۵ تا ۱۲۷)
"	رہنمائی کے لیے اہل کتاب کی شرط	"	یسور اور نذرانی آنے سے سامنے
"	ہدایت الہی ہی اصل ہدایت ہے	۳۰۲	کتاب کا دیہ بنو قیس
۴۲۳	اہل کتاب میں سے اہل ایمان	"	حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام تراشی
"	حق قیادت	۳۰۵	مشرکین کا نظریہ
۴۲۴	سفرین کے لیے خارو	"	آخری فیصلہ عدالت الہی میں ہوگا
"	محق و باطل کی پہچان	۳۰۶	تحویل قبلہ
۴۲۵	بنی اسرائیل پر انعامات	"	جہاد میں رکاوٹ
۴۲۶	قیامت کا نقشہ	۳۰۷	تمام بہرہ رسانی قابل تغیر ہیں
۴۲۷	درس چیل و مرثیہ ۴ (آیت ۱۲۸ تا ۱۳۰)	۳۰۸	منہج کے آداب
"	گذشتہ دروس پر ایک نظر	۳۰۹	

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

اما بعد

الْرَّحْمَنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن پاک ہی وہ ضابطہ حیات ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اس دنیا میں بھی اس دہین کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں بھی جنت کی بے پایاں نعمتوں سے ہلال برکت ہے۔ یہی وہ لاکھ عمل ہیں جس نے عرب کے صحرائیوں کو قرمذلت سے نکال کر ہم عروج تک پہنچایا۔ تاریخ اٹھ کر دیکھئے زندہ نازل قرآن میں پورا عرب کس قسم کے ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ کون سی بڑی ہے۔ بوقرآن پاک کے اولین مخاطبین میں نہ پائی جاتی تھی، وہ کونسا غیر فطری امتیاز ہے، جس میں غائب، نہتے ایڑوں سے، آقا و غلام، عربی و عجمی کی صورت میں موجود نہ تھا۔ منڈیوں میں عورتوں اور بچوں کی خبیثہ ذہنیت ہوتی تھی۔ بچہ کیوں کہ زندہ ہو کر کر دیا جاتا تھا، وہ لوگ سیاسی نظم و نسق کے نام سے آشنا تھے، وہاں نہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی، نہ کوئی ضابطہ اور قانون تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خدائی تھا۔ کسی کی جان وہ نہ محفوظ نہ تھی، جنگل کا قانون رائج تھا اور جس کی لاشیں اُس کی بھینس والا معیار تھا۔

خانیہ بنہ یب نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ لوگ جائز ناجائز، پاک، ناپاک اور حلال و حرام سے نا آشنا تھے، زنا، براء، چرنی، قتل و غارتگری کے دلدلہ تھے۔ ایک دلدل سے کوئی پردہ نہ تھا، نیچے طواف ہوتے، اخلاقی گھبراوٹ کا یہ حال تھا کہ باپ کی موت کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے بہت ہستی زبردست پر تھی، توحید نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی، طرح طرح کے توہمات

کاشکارتھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے دعویدار اُن کی تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب حضور نبی کریم ﷺ روزِ رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک ہوئی، نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اور جب اسی حوالہ کی پروردگارِ جلیل اور، خواندہ قوم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ بے لگام قوم دنیا کی مذبذب ترین قوم بن گئی، قیصر و کسریٰ اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے، راجن راجن بن گئے۔ ————— چور اور ڈاکو امین بن گئے، حسب و نسب پر فخر کرنے والے کالے کھوٹے حبشی غلام کو سنیہ ناکتے گئے، سیاست سے نابلد قوم۔ مذبذب ترین قوموں کو سبق سکھانے لگی، ضرب و حرب کے وہ معرکے دکھائے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک اسلام کا پرچم بائیس لاکھ مربع میل پر لہرانے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں قرآنی تعلیمات کے ثمرات دنیا کے گوشے گوشے میں نظر آنے لگے، مگر مقامِ افسوس ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے مسلمان پوری دنیا میں ذلیل ہوئے، ایک ارب کی آبادی اور دنیا میں چالیس سے زیادہ ملکوں پر حکمرانی کے باوجود مسلمان قوم ذلت و کمزورتی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ قومیں جو ان کے نام سے کانپا کرتی تھیں، آج ان پر مسلط ہیں، مسلمان پشاور کے دستِ نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اسرائیل جیسا بنڈل بھڑا جب چاہتا ہے ان کے محلے میں گھس کر انہیں شکار بنالیتا ہے۔ وجہ ظہر ہے۔ بقول علامہ اقبال:

وہ معوز تھے زمانے میں مملکت ہو کر اور ہم خوار ہیں تارکِ قرائ ہو کر

جب سے مسلمانوں نے قرآن پاک کا دامن چھوڑا ہے، ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں، مسلسل ناکامیوں کا شکار ہیں۔ بلاشبہ تمام غیر مسلم اقوامِ مت و داعدہ ہیں، اُن کی پیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان قوم منکون اور تنہا دستِ بحر بن کر رہے، اس مقصد کے حصول کے لیے اُن کے پاس ایک ہی نسخہ ہے کہ کسی طرح مسلمان قرآنِ کریم سے دستِ رخصت ہو جائیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان قرآنی پروگرام پر عمل کر کے ہی غائب آئے تھے اور اس پروگرام کے محسن جانے سے ہی مغلوب ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت بھی وہ یہ کہتے تھے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالنُّوفِ بِهِ لَعَنَّاكُمْ تَقْبِلُونَ ۝ دیکھنا تمہارے کانوں میں قرآن کی آواز نہ پہنچے پائے۔ بلکہ خراب شرمچا، تاکہ کوئی دوسرا بھی سن کر اس کا گرویدہ نہ ہو جائے۔ تمہاری کامیابی کا یہی راز ہے۔ آج جس وہ لوگ یہ نسخہ آزمائے۔ مگر ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہیں، قرآن پاک کی تعلیمات سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ یہ کلام مقدس بآبی صورت میں تو ہم سے دور نہیں، ہم اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ

کر اپنے طاغوتوں میں سجاتے ہیں، کبھی کبھی قلاوت بھی کر لیتے، حسن قرأت کی مخلص بھی جہالتے ہیں، مگر کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قرآن پاک سے دریافت کریں کہ تیرے نزول کا مقصد کیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری قرآن پاک کے ادب و احترام تک ہی محدود ہے۔ اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا کسی اور قوم کا کام ہے۔ یاد رکھئے، اگر آج ہم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو بارگاہ رب العزت میں کتنی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی جب خود رسول شکایت کریں گے۔ **يَسْرِبُ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا** یعنی اے مولا کریم! میری قوم نے قرآن پاک کو نظر انداز کر دیا تھا۔

قرآن پاک کو بیخام گھر گھر پہنچانے کے لیے مفسرین کرام نے ہر زمانے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ اور زبانی اور تحریری صورت میں قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ضرورت صرف ان لوگوں کی ہے جو قرآنی پروگرام کو لے کر اٹھیں اور دنیا میں ایک دفعہ پھر اسلامی انقلاب برپا کر دیں۔

دوسرا قرآنی کا یہ سلسلہ بھی اپنی بساط کے مطابق قرآن پاک کے علوم و معارف کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ آئیے ہم قرآن پاک کی آواز کو کانوں کے ذریعے دل میں جگہ دیں، اس پر غور و فکر کر کے اس سے رہنمائی حاصل کریں اور پھر عمل پیرا ہو کر اپنا کھویا ہوا قار دوبارہ حاصل کر لیں، نہ صرف دنیا کو امن کا گنوار بنادیں بلکہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔ **وما عيلنا الا البلاغ**۔

الحمد للہ سلسلہ دوسرا قرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر جلد اول جو کہ سورۃ فاتحہ پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے۔ جلد دوم پارہ اول مکمل پر مشتمل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس منصوبے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ ایسے کام کے لیے پوری زندگی درکار ہوتی ہے۔ کام وسیع اور کوشش ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس کام کے لیے آج جس طرح وسائل مہیا ہیں اور کارکنان کی پوری ٹیم جس طرح قرآن پاک کے ساتھ والہانہ محبت اور دلی لگاؤ کے ساتھ مصروف کار ہے، ہم اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مہربانی سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچے گا۔

اس جلد پر کام شروع کرتے وقت اس کی ضخامت کے متعلق تردد تھا کہ آیا یہ جلد پوری سورۃ بقرہ

پر مشتمل ہوگی یا اسے پارہ اول تک محدود کرنا پڑے گا۔
 — پارہ اول کے مسودے کی ضخامت اور اس پر صرف ہونے والے وقت کے پیش نظر آخری فیصلہ ہوا کہ سورۃ بقرہ کو دو حصوں میں شائع کیا جائے، پہلا حصہ مکمل پارہ اول پر مشتمل ہوا اور دوسرے حصہ میں پارہ دوم اور سورۃ کا بقیہ حصہ از پارہ سوم آجائے۔ یہیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے اور قارئین کو اندازے سے کچھ زیادہ ہی انتظار کرنا پڑا اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے پارے پر کام جاری ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ سورۃ بقرہ کے ہر دو حصے تقریباً برابر برابر ضخامت کے ہوں گے۔ اور اس کے بعد ہر جلد ایک یا ایک سے زائد مکمل سورتوں پر مشتمل ہو کر گی اس طریقے سے ہر جلد مکمل پارہ جات پر مشتمل تو نہیں ہوگی، تاہم مکمل سورتیں اس میں آسکیں گی اسلئے صافحین نے اسی طریقہ کو اپنہ فرمایا ہے۔

اگرچہ وقت کے لحاظ سے تو نہیں مگر کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ کام جس قدر وسیع اور کٹھن ہے، اس کے لیے اسی قدر مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ہمارے کوشش ہوگی کہ کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے بڑے مزید وقت دیا جائے تاکہ ہر آمدہ جلد کے لیے انتظار کی گھڑیاں کم سے کم ہو سکیں، قارئین کرام سے التماس ہے کہ اس سلسلہ اشاعت سے وابستہ جملہ کارکنان خصوصاً صوفی صاحب محترم کی درازی عمر اور صحت اور اس عظیم کام پر استقامت کی دعا کریں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ

احقر العباد

الحاج، نعل دین، ایم اے (علوم اسلامیہ)
 شالامار ٹاؤن، لاہور

سخنہائے گفتنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ
خَاتَمِ الْاَنْبِیَاۡہِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَاَزْوَاجِهِ وَتَابِعِهِ
اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ

• خیر امت: کا خطاب پانے والی قوم ان جس قدر دیگر گروں حالات، پستی اور
تہ تنزل کے جس خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔ وہ کسی گوش شنوا اور جہتم بنیائے محفی نہیں۔ اعمال و
اطلاق اسلام کی قید سے تقریباً آزاد ہو چکے ہیں۔ ایسا رہبر دی، مشترک اجتماعی مقاصد اور ملی ترقی کی
کوشش کے بجائے، نفس پرستی، خود غرضی، اور ذاتی تفوق مقصد حیات بن چکا ہے، دفتروں میں
عزت کی غمیت اور استیصال اس قدر عام ہے کہ پناہ بجا بردولت والا شخص جس کی عزت پر پہلے ہاتھ ڈالے
اور کمزور آدمی کے لیے جائز حقوق کا حصول بھی تقریباً ناممکن ہے اور حصول انصاف عقاب ہے۔ دوسروں کو
پچائی کا سبق دینے والی قوم نے آج خود جھوٹ کو روزی کھانے کا ذریعہ بنالیا ہے، عربیانی و فحاشی عروج پر
ہے، فرقہ وارانہ کشمکش، فوجی استبداد، مارشل لا کی طاغوتی حکومتیں، جدید آلات و انجانات کا غلط استعمال
تصویری فتنہ، مد سے زیادہ آرام طلبی اور رفاہیت بانغ کا فساد، کھیل و تماشا کی کثرت، اسلام کو اپنے
غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا، ملوکیت کی عشرت پسندیاں، اسراف اور بہت طرازیوں، اللہ تعالیٰ
کی کتاب کی غلط تفسیریں اور باطل تاویلیں، رسومات و بہعات کی فراوانی، اور دھوکا بازی اور فریب دہی
جس دوسری تمام قوموں کو مات کر دیا ہے، اور ان کے ماضی کا تمام ریکارڈ توڑ دیا ہے، قوم کی دیانت،

شرافت، صداقت اور امانت کا حال کسی سے مخفی نہیں، اِنَّكَ الْمُصَوِّرُونَ اِخْوَةَ (تمام مِلّان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی تعلیم پانے والی قوم کے ممالک اور افراد آپس میں نبرد آزما ہیں۔ آئے دن قتل میں اضافہ، گھر کے اندر عزت اور باہر جان محفوظ نہیں، اشتراکیت، سرمایہ داری کی لعنت کے عروج، یسائیت، ایسوی ازم کی تباہ کاریوں، مبنی و ازم کی تنگ نظری سے متاثرہ قوم، زبان پر اسلام اسلام اور عمل اس کے برعکس اور اسلام کی میٹھ میں ایک زہر آلود خنجر ہے۔

بائیں ہمہ مسلم معاشرہ میں ایسے افراد بھی موجود ہیں۔ جو کہ صحیح معنوں میں قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تمنا رکھتے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے ساتھ دلی بہمدردی اور ان کی اس حالتِ زار پر درد دل رکھنے والے حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ کہ وہ ان کو صحیح قرآنی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔

بھگوانہ تعالیٰ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب دہم مجاہد کا انداز بیان سادہ اور دلپند ہے۔ تلمیس ابناء و اور تکلف سے دور لیکن پُر مغز، جامع اور مسلک سلف کے مطابق منشا قرآن کا صحیح مظہر ہے۔ اور داعی الی الخیر برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے کیا۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ نے اردو میں بے حد مفید ترجمے کیے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے حکیمانہ تفسیر لکھی۔ اور دیگر بزرگوارانِ دین نے بھی اپنی اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ متأخرین میں حضرت تھانویؒ، کا بیان القرآن، حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور تفسیر، تفسیر عثمانی اور حضرت لاہوریؒ کا ترجمہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تفسیر معارف القرآن اور اس قسم کے دیگر تراجم اور تفسیر مستند اور ہر اعتبار سے سے خلق خدا کے لیے نافع ہیں۔ اور دل میں کلام الہی پر عمل کا سچا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں۔

معالم العرفان فی دروس القرآن بھی اسی پاکیزہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور چند وجوہ کے اعتبار سے ممتاز بھی ہے۔ عام فہم طرز، انداز بیان میں مخاطبین کے ذہنوں کا لحاظ، واقعات کا سلسلہ انتہائی مربوط اور دورِ حاضر کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کی رعایت، مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی واضح نشاندہی، تفسیری سلسلہ کے شبہات اور جدید دور میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے شبہات کا بڑے لطیف انداز میں حل تحقیق کے نام پر پتھر لپٹ کرنے والوں اور جدت پسند حضرات کی ٹھوکہ دہی کی نشاندہی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، فقہی مسائل اور جدید دور کے مسائل کی الجھی ہوئی گتھیوں کا قرآن و سنت اور سلف صالحین کے

مسک کے مطابق لکھا ہوا تاریخی واقعات اور کہیں کہیں مفترین سلف اور ان کی کتب کا تعارف غلط دلیلی اور تصوف کا افادی پہلو۔ ویسے بھی حضرت صوفی صاحب دہم مجہد کا نام نامی ہی کسی کتاب کے مستند ہونے کے لیے کافی ہے۔

آج کل مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لیے بڑی پر زور کوششیں ہو رہی ہیں۔ تقاریر، جلسے، اخباری مضامین، لٹریچر، مباحثے، پیچھے اور تصنیفات کے ذریعے باہمی اتفاق پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اہل میں جو چیز نا اتفاق کی جڑ ہے۔ اور کوئی ترجمہ نہیں کرتا۔ یعنی مخالف پر تنقید میں حد اعتدال سے تجاوز، آپس کے اختلافات کی شدت اور ایک دوسرے سے نعرہ کا ایک بہت بڑا سبب زبان کی درشتی اور تیزی ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ دروس القرآن میں باطل مذہب کی پروری پر ردیدہ اور گمراہ فرقوں کے غلط عقائد و مسائل اور نظریات پر نئے ششہ از میں تنقید ہے۔ لیکن اعتدال کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور عام آدمی پر بھی حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اور قرآن و سنت کا صحیح مشاہدہ سامنے آ جاتا ہے۔ اور حق کا متلاشی حق کو پہچانتا ہے۔

سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے باقرائیں ہیں۔ اس سے پیشتر سورۃ فاتحہ پر مشتمل جلد اول شائع ہو چکی ہے۔ یہ جلد سورۃ بقرہ کے سولہ رکوعات یعنی پہلا آیت پر مشتمل ہے۔ سورۃ بقرہ میں سینکڑوں مضامین بیان ہوئے ہیں لیکن اس کا مرکزی مضمون یہود کے غلط عقائد کا بیان اور ان کی تردید، ان کی خباثت اور تنزیل کے اسباب، ان کی سیاسی غلطیاں اور روحانی بیماریاں اور ان کی کھین ہے۔ امت مسلمہ بھی آج انہیں حالات سے دوچار ہے۔ جس میں بنی اسرائیل تھے۔ مجرصادق صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی حالات کی پیشین گوئی آج سے چودہ سو سال پہلے فرمائی تھی۔ لَیْسَتِیْنَ عَلٰی اُمَّتِیْ کَمَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اَلْبَتَّہُ مُزِدِّہِیْنَ اَمَّتْ پُر بھی ایسا ہوگا حَذُّوْا الثَّغْلَ بِالثَّغْلِ (ترمذی)

جس طعن بنی اسرائیل پر آیا جیسا کہ جرتے کے ساتھ جوتا ملے۔ تو اس طعن آن کے بعد مسائل کا حل بھی صرف اور صرف قرآن پاک میں ہی ہے۔ قرآن پاک کا فاضل دہم دیکھنے اور اذعان کو کتاب الہی کے قریب تر کرنے کے لیے دروس القرآن یقیناً بہترین رہنما ہو سکتی ہے۔ علماء، طلباء، خطباء اور خواہم بلکہ ہر طبقے کے لیے یہاں مفید ہے۔ تفسیر کے ساتھ ساتھ عام فہم، سلیس اردو اور معنی خیز ترجمہ بھی سامنے آ رہا ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب دہم مجہد اور انجمن مجاہد شاعت قرآن کے جملہ اراکین جو کہ دروس القرآن کی طباعت اور ان دروس کو کیسٹوں

کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب
ایم اے علوم اسلامیہ اور اس میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے ان کی اس سعی کو قبول
فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہو نیکی تو رفیق عطا فرمائے آمین۔

فقط

محمد شرف (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)

۵ صفر ۱۴۰۵ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء



سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَكِّيَّةٌ نَبِيَّتُهُ هِيَ مَائِدَانِ وَسِيَّتْ وَثَمَانُونَ آيَةً وَالْعَبْدُ ذُكُوْعًا
سورة بقرہ مدنی ہے اور یہ دو سو چھیاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

آلۃ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ②

ترجمہ۔ آلۃ ① یہ کتاب، نہیں شک اس میں یہ رہنمائی کرتی ہے متقوں کی ②

سورة کے موضوع اور نام سے پہلے قرآن کریم کی سورتوں سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے، اس کے بعد سورة بقرہ کے نام کے بارے میں کچھ بیان ہوگا۔

لفظ سورة س کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے قِطْعَةٌ مِّنَ الْاٰیٰتِ
یعنی آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ۔ گریچند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو

اسے سورة کہا جاتا ہے۔ کسی سورة کے لیے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ
سورة عصر، سورة کوثر اور سورة نصر تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورة بقرہ سب سے لمبی سورة
ہے۔ اور اس کی دو سو چھیاسی آیات ہیں۔

سورة کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ اسی
طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے
جیسے اَلْحٰی یا حٰی۔ اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا جیسا ق۔ ن وغیرہ اور
بعض آیات اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورة مزمل کے
دوسرے رکوع والی آیت ہے۔

آیت کا معنی علامت اور اس کا دوسرا معنی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ

سورة اور
آیت

آیت کے
مختلف معانی

ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھلوں وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: لَا آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ اس میں علمندوں کے لیے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔ سورۃ روم میں فرمایا وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا یہ بات اللہ تعالیٰ کے دلائل قدرت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے نفسوں میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔

قرآن میں آیت کا لفظ عبرت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا کیا یہ بات لوگوں کو ہدایت نہیں کرتی کہ کُمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُونِ ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا یَصْشُونَ فِي مَسْكِنِهِمْ جو اپنے مکانوں میں چلتے پھرتے تھے اِنْ فِي ذَلِكَ لَا آيَةٍ لِّأُولِي الْأَبْصَارِ اسی طرح آیت کو معجزے کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام نے معجزات پیش کئے جن کا مطالبہ قوم کے لوگ کرتے تھے۔ سورۃ رعد میں دو مقامات پر آیا ہے وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا الْوَيْلُ لَنَا مَنْ نَزَّلَ عَلَيْهِ آيَاتُ رَبِّهِ كَفَرًا كَيْتَ هِيَ كَأْسٌ مُّسْكِرٌ کفار کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا گویا آیت کا معنی معجزہ بھی ہوتا ہے۔

آیت کا معنی حکم بھی آتا ہے۔ جیسے يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکام پڑھ کر سنا رہا ہے۔ یا جیسا کہ سورۃ عنکبوت میں فرمایا وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ اور ہمارے احکام سے کافر ہی انکار کرتے ہیں۔

تاہم ان تمام تر معانی کے باوجود جب آیت کا لفظ سورۃ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی سورۃ کا ایک حصہ یا جزو ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات مل کر سورۃ ترتیب پاتی ہے جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا تھا، قرآن پاک کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ بقرہ ہے۔ پھر آل عمران اور سورۃ نساء ہے۔ یہ ترتیب اجتہادی نہیں بلکہ ترقیعی ہے۔ یعنی یہ ترتیب صحابہ کرامؓ کی دی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ

سورتوں اور آیتوں
کی ترتیب

حضور علیہ السلام کی مقرر کردہ ترتیب ہے۔ اسی طرح ہر سورۃ میں آیات کی جو ترتیب ہے مثلاً
 پہلے الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اس کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور پھر
 هٰذَا یَوْمَ الدِّیْنِ یہ ترتیب بھی لقمہ حق ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **صَلُّوا هَذِهِ
 الْاٰیَةَ فِی السُّورَةِ الَّتِیْ یُذْکَرُ فِیْهَا کَذٰوْکَذًا** یعنی اس آیت کو فلاں مقام پر
 رکھ دو، تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے فرمان کے مطابق آیات کو ترتیب دے لیا۔ انہوں نے اپنی
 طرف سے آگے پیچھے نہیں کیا۔ بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کی۔ حدیث
 میں صاف طور پر آتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے: **اِسْءِ
 فَلَانْ** مقام پر رکھ دو۔ تو صحابہ کرامؓ ویسے ہی کرتے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق کچھ اختلاف
 پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین محققین فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
 قطعی فرمان نہیں ہے تاہم تہمور کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد کے
 مطابق ہی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہی موجودہ ترتیب
 کو قائم کیا۔

سورتوں کے اقسام
 بلحاظ طوالت

قرآن پاک کی پہلی سات سورتوں یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ یونس تک کو
 سبع طوال یعنی سات لمبی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چودھویں پائے میں سورۃ نحل تک
 کو ثانی یعنی طوال کے بعد دوسرے نمبر والی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد حجرات تک کی سورتوں
 کو تینیں کہا جاتا ہے۔ تین سے مراد وہ سورتیں ہیں جو کم و بیش ایک سو آیات پر مشتمل ہوں
 اس کے بعد وانس تک سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ آگے مفصلات کے بھی تین گروپ
 ہیں۔ حجرات سے لیکر سورۃ بروج تک کو طوال مفصل بروج سے لے کر سورۃ یٰسین تک کو وسط

۱۔ تفسیر اتقان فی علوم القرآن للسیوطی ص ۶۲ مطبوعہ سیس اکیڈمی لاہور۔

۲۔ تفسیر اتقان ص ۶۱ ۳۔ ترمذی ص ۴۴۔

۴۔ ترمذی ص ۴۴، تفسیر اتقان ص ۶۱ مسند احمد ص ۱۰۰، متذکر حاکم ص ۲۳۳

۵۔ روح المعانی ص ۶۲ ۶۔ روح المعانی ص ۶۱

مفصل اور پھر آخر تک کو قصار مفصل کہا جاتا ہے۔ قصار کا معنی چھوٹی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے ناموں کی مختلف وجوہات ہیں۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی حروف ہیں ق۔ ص۔ ط۔ ی۔ ن۔ وغیرہ بعض سورتوں کے اسماء ان کے پہلی آیت کے کسی لفظ پر رکھے گئے ہیں۔ جیسے سورۃ کوثر کا نام اس کی پہلی آیت اَعْطَيْتَكَ الْكُوثَرَ سے لیا گیا ہے۔ کسی سورۃ کا نام اس سورۃ میں مذکور مشہور واقعہ سے ماخوذ ہے۔ جیسے بقرہ کہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اسراء میں معراج کا واقعہ آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں اعزاف کا واقعہ ہے۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ سورۃ الاعراف کا نام بھی واقعہ اعراف کی وجہ سے ہے۔ سورۃ یونس کا نام یونس اس لیے ہے کہ اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

زمانہ نزول کے لحاظ سے سورتوں کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی مکی اور مدنی سورتیں جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں ورنہ کہلاتی ہیں۔ خواہ وہ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران نازل ہوئیں یا طائف میں یا کسی اور سفر کے دوران۔ مدنی سورتیں وہ ہیں، جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد جو بھی سورتیں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ قیام مدینہ کے دوران یا تبوک یا خیبر یا کسی اور مقام پر وہ سب مدنی سورتیں کہلاتی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے زمان و مکان کے لحاظ سے کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ مثلاً جو سورۃ حصہ یعنی اقامت کی حالت میں نازل ہوئی۔ وہ حضرمی کہلاتی ہے۔ اور جو سفر کی حالت میں اتری اس کو سفری سورۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح رات کے وقت نازل ہونے والی سورۃ لیلیٰ اور دن کے وقت اترنے والی نہاری کہلاتی ہے۔

بعض سورتیں دفعۃً یعنی یکدم نازل ہوئی ہیں۔ ان کو دفعی سورتیں کہتے ہیں اور بعض سورتیں تدریجی کہلاتی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ تدریجاً نازل ہوئی ہیں۔ کبھی چند آیتیں نازل ہو گئیں۔ پھر درمیان میں وقفہ آگیا پھر کچھ نازل ہو گئیں۔ یہ تدریجی سورتیں ہیں۔ بعض سورتیں ایسی ہیں جو کہلاتی تو مدنی ہیں مگر ان کے کچھ حصے مکی دور میں نازل ہوئے مثلاً

یہی سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔ مگر اھن الرسول سے لے کر آخر تک کی آیتیں مکی زندگی کا حصہ ہیں۔ مشہور روایت میں آتا ہے کہ معراج کے دوران حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین تحفے دیے گئے۔ یعنی پانچ نمازیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں۔ اور ان لوگوں کے لیے خوشخبری جو شرک میں ملوث نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا معراج مکی زندگی میں ہو۔ لہذا یہ آخری آیتیں مکی زندگی کی ہیں۔ اگرچہ سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔

ترتیب تلاوت
کی حکمت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ترتیب نزول کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورتیں آئیں اور اس کے بعد مدنی سورتوں کا بیان ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم تمام نوع انسانی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اور مختلف انسانوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے وہ سورتیں رکھی ہیں جو جامع اور مانع ہیں اور ان میں ہر قسم کے احکام پائے جاتے ہیں۔ اور یہ عام طور پر مدنی سورتیں ہیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر فیضانِ عقائد کا ذکر ہے۔ ان میں ہر قسم کے احکام نہیں پائے جاتے۔ تو گویا پہلے مدنی اور مکی سورتوں کو لانے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ ہر قسم کے احکام سے مانوس ہو جائیں۔

فضیلت سورۃ

حدیث پاک میں سورۃ بقرہ کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ یعنی اپنے گھروں کو قبروں کی طرح نہ بنالو۔ بلکہ وہاں نمازیں بھی پڑھا کرو۔ نیز یہ بھی فرمایا وَإِنَّ الْبَيْتَ الَّذِي تَقْرَأُ الْبَقْرَةَ فِيهِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ یعنی جس گھر میں سورۃ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہو۔ وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا، مسلم شریف کی روایت میں اس طرح آتا ہے يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَأَهْلِيهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهِ تَقْدِمُهُ سُورَةُ الْبَقْرَةِ وَالْعُمُرَانِ یعنی قیامت کے روز قرآن پاک اور اس کے اہل کو لایا جائے گا۔ ان کے آگے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہوگی۔

یہاں پر یہ بات یاد ہے کہ اہل قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک پر عمل کرتے ہیں۔
 آج کل تو جھگڑا لوی اور پرویزی وغیرہ اہل قرآن کھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ گمراہ اور منکرین قرآن ہیں۔
 ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں تَفْلِكُمُ اسُودَةُ الْبُقَرَةِ فَإِنَّ أَخْذَهَا
 بَرَكَةٌ یعنی سورۃ بقرہ سیکھو کیونکہ اس کا سیکھنا باعث برکت ہے۔ وَتَرْكُهَا حَسْرَةٌ
 اور اس کا ترک کرنا باعث حسرت ہوگا۔ نیز فرمایا لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَسَنَامُ الْقُرْآنِ
 سُورَةٌ الْبُقَرَةُ ہر چیز کی ایک کوہان یا بندی ہوتی ہے۔ اہل قرآن کی کوہان سورۃ بقرہ ہے
 یعنی یہ سورۃ قرآن پاک میں اس طرح نمایاں ہے جس طرح اونٹ کی پشت پر کوہان نمایاں ہوتی ہے۔
 فرمایا سورۃ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے ہِيَ سَيِّدَةُ آيَةِ الْقُرْآنِ آيَةُ
الْكَرْسِيِّ یہ قرآن پاک کی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ یعنی آیت الکرسی۔ گویا سب بڑی اور سب سے
 فضیلت والی آیت اسی سورۃ میں ہے۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ سورۃ بقرہ فُطِطَ
 الْقُرْآنُ یعنی قرآن کا خیمہ ہے جس میں ہر چیز آجاتی ہے۔ فرمایا اقْرَءُوا الزَّهْرَ أَوْ يَنْ
الْبُقَرَةَ وَالْعَمْرَنَ دو روشن سورتیں پڑھو۔ یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران۔ یہ قیامت
 کے روز اس طرح آئیں گی جس طرح دو بادل ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بڑی چمک ہوگی
 یہ سائبان کی طرح اوپر آئیں گی۔

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ الْبُقَرَةُ سَنَامُ الْقُرْآنِ
 سورۃ بقرہ قرآن کریم کی کوہان ہے۔ اس کی ہر آیت کے ساتھ انٹی۔ انٹی فرشتے اترتے ہیں
 ہیں۔ یعنی ہر آیت کے نزول کے وقت ملائکہ کا نزول ہوتا تھا۔ فرمایا اس کی اہمیت اللَّهُ وَمَا إِلَهُ
إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ کو اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے سے نکال کر سورۃ میں شامل کیا ہے
 اسی آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم بھی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں مختصر طور پر بہت سے مضامین آجاتے ہیں۔ مثلاً اس میں اللہ تعالیٰ مضامین سورۃ

۱۔ منہ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔ ۱۴۲۸۔ ۱۴۲۹۔ ۱۴۳۰۔ ۱۴۳۱۔ ۱۴۳۲۔ ۱۴۳۳۔ ۱۴۳۴۔ ۱۴۳۵۔ ۱۴۳۶۔ ۱۴۳۷۔ ۱۴۳۸۔ ۱۴۳۹۔ ۱۴۴۰۔ ۱۴۴۱۔ ۱۴۴۲۔ ۱۴۴۳۔ ۱۴۴۴۔ ۱۴۴۵۔ ۱۴۴۶۔ ۱۴۴۷۔ ۱۴۴۸۔ ۱۴۴۹۔ ۱۴۵۰۔ ۱۴۵۱۔ ۱۴۵۲۔ ۱۴۵۳۔ ۱۴۵۴۔ ۱۴۵۵۔ ۱۴۵۶۔ ۱۴۵۷۔ ۱۴۵۸۔ ۱۴۵۹۔ ۱۴۶۰۔ ۱۴۶۱۔ ۱۴۶۲۔ ۱۴۶۳۔ ۱۴۶۴۔ ۱۴۶۵۔ ۱۴۶۶۔ ۱۴۶۷۔ ۱۴۶۸۔ ۱۴۶۹۔ ۱۴۷۰۔ ۱۴۷۱۔ ۱۴۷۲۔ ۱۴۷۳۔ ۱۴۷۴۔ ۱۴۷۵۔ ۱۴۷۶۔ ۱۴۷۷۔ ۱۴۷۸۔ ۱۴۷۹۔ ۱۴۸۰۔ ۱۴۸۱۔ ۱۴۸۲۔ ۱۴۸۳۔ ۱۴۸۴۔ ۱۴۸۵۔ ۱۴۸۶۔ ۱۴۸۷۔ ۱۴۸۸۔ ۱۴۸۹۔ ۱۴۹۰۔ ۱۴۹۱۔ ۱۴۹۲۔ ۱۴۹۳۔ ۱۴۹۴۔ ۱۴۹۵۔ ۱۴۹۶۔ ۱۴۹۷۔ ۱۴۹۸۔ ۱۴۹۹۔ ۱۵۰۰۔ ۱۵۰۱۔ ۱۵۰۲۔ ۱۵۰۳۔ ۱۵۰۴۔ ۱۵۰۵۔ ۱۵۰۶۔ ۱۵۰۷۔ ۱۵۰۸۔ ۱۵۰۹۔ ۱۵۱۰۔ ۱۵۱۱۔ ۱۵۱۲۔ ۱۵۱۳۔ ۱۵۱۴۔ ۱۵۱۵۔ ۱۵۱۶۔ ۱۵۱۷۔ ۱۵۱۸۔ ۱۵۱۹۔ ۱۵۲۰۔ ۱۵۲۱۔ ۱۵۲۲۔ ۱۵۲۳۔ ۱۵۲۴۔ ۱۵۲۵۔ ۱۵۲۶۔ ۱۵۲۷۔ ۱۵۲۸۔ ۱۵۲۹۔ ۱۵۳۰۔ ۱۵۳۱۔ ۱۵۳۲۔ ۱۵۳۳۔ ۱۵۳۴۔ ۱۵۳۵۔ ۱۵

نے منعم عظیم لوگوں کے بجز اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اسی طرح کھراہ لوگوں کے اوصاف اور ان کی نشانیاں بیان کی ہیں۔ جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں اس سورۃ مبارکہ میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت کا ذکر دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے ساتھ آیا ہے ختم نبوت کا بیان ہے۔ اور وحی کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ انسان کے مکلف ہونے کا بیان ہے۔ اور پھر وحی الہی کی احتیاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنے تمام زمائل کو حل نہیں کر سکتے۔ انہیں زندگی کے ہر موڑ پر وحی الہی کی دستگیری کی ضرورت ہے۔

اس سورۃ میں عبرت حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع کو بیان کیا گیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ان کے فضائل کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کے اسلاف پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بیان ہے۔ اور موجودہ بنی اسرائیل کی خباثتوں، شرارتوں، ان کے غدار اور ضد کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں ملت ابراہیمی کا ذکر ہے۔ بیت اللہ شریف کے کعبہ ہونے کا ذکر ہے۔ تہذیب، امداد اور تعلیم کے ارکان، تدبیر منزل اور سیاست من کا ذکر ہے۔ غیر اللہ کی نذر و نیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس میں قوانین مملکت اور خلافت کبریٰ کے اصول بیان کیے گئے ہیں کہ امیر کیسا ہونا چاہیئے۔ اور فوج کے لیے کیا قوانین ضروری ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی پہچان کرائی گئی ہے۔ سخاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخل کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ سود کی حرمت اور تجارت کے قوانین کا بیان ہے۔ عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ معاشرتی امور سے متعلق نکاح، طلاق، قسم، ایلا وغیرہ کے احکام ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کا بیان ہے۔ عقوبات میں قصاص اور دیت کے احکام ہیں۔ اصلاح معاشرہ، جہاد اور اتفاق فی سبیل اللہ، غرض اس سورۃ مبارکہ میں سینکڑوں ہزاروں مضامین بیان ہوئے ہیں

اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔ بقرہ عام طور پر گائے کے لیے بولا جاتا ہے تاہم عربی زبان میں یہ لفظ گائے اور بیل دونوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر وضاحت کرنی ضروری ہو تو بیل کے لیے ثور کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ بہر حال اس سورۃ مبارکہ میں جس بقرہ کا ذکر ہے کہ وہ نر ہو یا مادہ ہو۔

نام اور کوائف

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ مردہ گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہو گیا تھا یا خود بخود ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر خود بخود زندہ ہو گیا۔ تو دوسرے سینکڑوں ہزاروں مرنے والے خود بخود کیوں نہیں زندہ ہو جاتے۔ اور اگر وہ مردہ گائے کا گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہوا، تو گائیں بھی بشارت ذبح ہوتی ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ ہر مرنے والے کو زندہ کر کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا وہ مردہ نہ تو خود بخود زندہ ہو گیا۔ اور نہ ہی مرنے والے کا گوشت لگانے سے۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوا جو صانع اور قادر مطلق ہے۔ لہذا اللہ رب العزت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سمجھ میں آتی ہے۔ اور یہ سورۃ مبارکہ کی سب سے اہم بات ہے۔

ثبوت نبوت
اس سورۃ میں دوسری اہم بات نبوت کا ثبوت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کا پتا لگانے کے لیے جو طریقہ بتایا، وہ کامیاب ہوا۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہو گئی جب ایک نبی کی نبوت ثابت ہو گئی۔ تو قلم انبیا علیہم السلام کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ نیز یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نبی کی بات کو بغیر تفتیش کے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس میں حیل و حجت نہیں کرنی چاہیے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے بتائے گئے طریقے میں حچان بین شروع کر دی۔ کہ جس گائے کو ذبح کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہ کسی ہونی چاہیے اور اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ لوگ اپنے نبی کے حکم کے مطابق فوراً عمل کرتے ہوئے گائے ذبح کر دیتے، تو مسئلہ فوراً حل ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے اوپر جس قدر سختی کی، اُسی قدر قیدیں بڑھتی چلی گئیں۔

استقامت
کی ضرورت
اس واقعہ میں تیسری اہم چیز استقامت ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عقیدے عمل اور اخلاق پر قائم رہے۔ اگر استقامت میں لغزش آجائے گی۔ تو کئی قسم کے فساد پیدا ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے آدمی کے قاتل نے اس جرم کا ارتکاب اس لیے کیا تھا۔ تاکہ مقتول کو راستے سے ہٹ کر چچا کا سارا مال حاصل کر لے۔ گویا اس نے استقامت کو چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ استقامت بڑی چیز ہے اس کو چھوڑنے سے ذلت و رسوائی کا منہ کرنا پڑتا ہے۔

اس واقعہ کی جو حق بات مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دین اور ایمان کے راستے میں کوشش

اور جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ جوانی کے عالم میں انسان کی عقل مغلوب ہوتی ہے۔ انسان پر خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس عمر میں اکثر لوگ مجاہدہ میں ناکام ہوتے ہیں۔ جب انسان پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ تو ظاہری قوتیں کمزور ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف جہالت انسان کے قلب و ذہن میں سخت ہو چکی ہوتی ہے لہذا اس عمر میں بھی انسان مجاہدہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہذا اس کی بڑی اہمیت اور بہت زیادہ ضرورت ہے۔

اس واقعہ کی پانچویں اہم چیز معاد یعنی حیات بعد الممات کا ثابت ہونا ہے۔ یہ پورا واقعہ معاد ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَذٰلِكَ يُخَيِّرُ اللّٰهُ الْعَمَلٰتِیْ یعنی جس طرح اس مُرُءے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، اسی طرح معاد میں سب کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔

یہ تمام دین کے بنیادی اور اہم اصول ہیں۔ باقی چیزیں ان کے ضمن میں آتی ہیں اس ایک واقعہ میں خدا تعالیٰ نے دین کے بنیادی مسائل اور معارف سمجھائے ہیں۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔

اس درس میں سورۃ بقرہ کے فضائل اور اس کے مجموعی مضامین کا مختصر بیان ہوا۔ ائمہ درس میں انشاء اللہ کے تعلق بیان کیا جائے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الْعَمَّ ① ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②

ترجمہ: ① اَلْعَمَّ یہ کتاب میں شک اس میں۔ یہ راہنمائی کرتی ہے متقین کی ②

محکمات. متشابہ
مقطعات

گذشتہ درس میں سورۃ بقرہ کی فضیلت، اس کے نام اور اس کے موضوعات کا اجمالی تذکرہ ہوا تھا۔ اس درس میں حروف مقطعات میں سے الف، لام، میم کے متعلق بیان ہوگا۔

اصولی طور پر یہ بات معلوم کر لینی چاہیے کہ قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ہیں۔ پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آیات کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب اور مراد بھی معلوم ہے۔ گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں۔ قرآن پاک کی اکثر آیتیں محکمات ہیں۔ آیات کی دوسری قسم متشابہات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا معنی

تو معلوم ہے۔ مگر ان کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ مثلاً آیت کریمہ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں رَحْمَن عَرْش اور استوائی کے معانی معلوم ہیں۔ مگر اس کی حقیقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ غامض اور دقیق ہے۔ گویا معنی تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ مگر جلوہ گر ہونے کی کیفیت ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی آیات متشابہات کہلاتی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات کہلاتی ہیں۔ یہ مفرد حروف ہیں جو قرآن پاک کی انیس سو تینوں کے ابتداء میں آتے ہیں۔ سورۃ بقرہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جو اَلْعَمَّ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات پر ن۔ ص۔ ق۔ ال۔ ی۔ ہ۔ ط۔ وغیرہ کے حروف آتے ہیں۔ مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کا معنی واضح ہے۔ اور نہ ان کی مراد معلوم ہے۔

احکامِ مذہبی
لہذا حکمتیں

تاجم ہر قسم کی آیات کے احکام پر ایمان لازماً ضروری ہے۔ خواہ ان احکام کی حکمتیں واضح ہوں یا غیر واضح۔ مثلاً نماز پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کے سامنے تواضع کرتا ہے۔ اور اپنے منعم کا شکر ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ جو کہ عبادت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات پیش کرنے کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اسی طرح روزہ کا مقصد نفس کو دہانا شہوت کو مغلوب کرنا ہے۔ تاکہ انسان میں تقویٰ کی روح پیدا ہو سکے۔ بھوک اور پیاس سے خواہشات نفسانی پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح حکمت ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس میں دو بڑی حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مساکین کی حاجت پوری کی جاتی ہے تاکہ کوئی غریب بھوکا پیاسا نہ رہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان بخل کے مادہ سے پاک ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے مال سے زکوٰۃ نکالتا ہے گا اس میں بخل کی بجائے سخاوت کا دو پید ہوگا۔ لہذا زکوٰۃ کی حکمت بھی واضح ہے۔

اب بعض احکام ایسے ہیں جن کی حکمتیں بڑی گہری ہیں۔ اور برآمدی انہیں نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً حج کے ارکان منجملہ ان کے بیت اللہ شریف کا طواف۔ منیٰ اور عرفات کا وقوف ہے۔ حجرت کی رمی ہے۔ ان احکام کی حکمتیں غامض اور دقیق ہیں۔ مگر ان پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر مکلف کے لیے لازم ہے۔ اور جن احکام کی حکمت واضح نہیں۔ ان کے متعلق زیادہ کہہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان احکام کی ہر حالت میں تعمیل کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ احکام آیات محکمات کے ہوں یا آیات متشابہات کے ہوں۔

حروف مقطعات
مغربی حکمت

اسی طرح حروف مقطعات کے بارے میں بھی زیادہ کرید کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں سے کوئی بھی ایسا معلوم نہیں ہوا۔ جس نے حروف مقطعات کی کرید کی ہو۔ جس طرح حضور علیہ السلام نے فرمایا صحابہؓ نے تسلیم کر لیا مگر بعض ذہین تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ وہ معاملہ کی تہ تک سنجیدہ رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن حروف کے معانی ہی معلوم نہیں۔ ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ چنانچہ

صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی بعض علمی ذہن کے لوگ تھے۔ جو ان کے متعلق سوال کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں بھی بعض لوگوں نے ان الفاظ کے معانی پوچھے۔ بعض نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ تو انہوں نے تقریب ذہن یعنی ذہن کو قرآن کریم کے قریب کرنے کے لیے کچھ معانی بتا دیے۔ اس کے بعد دوسرے مفسرین کرام نے بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان الفاظ کے معانی بیان فرمائے مگر ان میں سے کوئی بھی معنی قطعی نہیں ہے۔ محض احتمال اور ظن غائب سے کچھ معانی بیان کر دیے ہیں تاکہ ذہن قرآن پاک سے مانوس رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے اقوال ملتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ

حضرت ابو جہر صدیق کا قول ہے: لِكُلِّ كِتَابٍ رِسْوَةٌ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی راز کی بات ہوتی ہے۔ یعنی ہر کتاب کی ہر چیز واضح نہیں ہوتی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز پوشیدہ بھی ہوتی ہے۔ جو عام انسانوں کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں: وَرِسْوَةُ الْقُرْآنِ أَوَّلُ السُّورِ یعنی قرآن پاک کے اسرار اس کی ابتدا میں حروف مقطعات ہیں حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ لِكُلِّ كِتَابٍ صَفْوَةٌ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی چھائی ہوئی یا منتخب بات ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم میں ایسی بات حروف تہجی السّٰوۃ وغیرہ ہیں۔ جنہیں بر آدمی کا سمجھنا ضروری نہیں۔

حضرت علیؓ

حضرت ام شجیہؓ

اہم عام رہن سر جلیل المعروف شجیہؓ نے پانچ سو صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ اور ان سے علم حاصل کیا ہے۔ آپ ام ابو حنیفہؓ کے اساذ ہیں۔ جب آپ سے حروف مقطعات کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا: رِسْوَةُ اللَّهِ فَلَا تَطْلُبُوا يَرِ اللَّهُ کے راز ہیں۔ ان کے پیچھے مت پڑو۔ ہو سکتا ہے تم انہیں سمجھنے میں ناکام رہو اور کسی غلط چیز میں مبتلا ہو جاؤ۔ لہذا تم انہیں صرف پڑھ لیا کرو۔

حضرت ابن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کے ہر حرف کی تلاوت پر

سے تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۱ تفسیر کبیر ص ۲۱۱

سے تفسیر عزیزی مش ۱۴۰۱ تفسیر کبیر ص ۲۱۱

دس نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔ جو مومن ان حدود کو پڑھے گا۔ اسے تیس نیکیاں حاصل ہوں گی
یہی بہت بڑی غنیمت ہے۔ لہذا اُن کے معانی تلاش کرنے میں کوشش نہ کرو۔

حضرت امام رازیؒ

امام رازیؒ پچھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بڑے عظیم مفسر قرآن گزے ہیں۔ جس قرن تیسریں
صدی میں امام ابن جریر طبریؒ اور چوتھی صدی میں ابو جبر جصاصؒ ہوئے ہیں اسی طرح آپ کا مقام
تھا ابو جبر جصاصؒ حنفی تھے۔ اور امام رازیؒ شافعی تھے۔ امام ابن جریر خود مجتہد صاحب مذہب تھے۔
اور کسی کے مقلد نہیں تھے۔ ابو جبر جصاصؒ نے صرف احکام کی تفسیر کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کی صرف
ان آیات کی تفسیر لکھی ہے، جن میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ البتہ امام رازیؒ نے چھیستویں پارے
تک مکمل تفسیر کی ہے۔ اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ چنانچہ بقیہ تفسیر آپ کے نہایت قابل
شاگردوں نے کی۔ اس تفسیر کی آخری دو جلدیں امام رازیؒ کی اپنی تالیف نہیں۔ بلکہ آپ کے تلامذہ
کی ہے۔ ان آخری جلدوں کا مقابلہ پہلی جلدوں کے ساتھ کرتے ہیں، کہ کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا
اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ شرف عطا فرمایا۔

حدود مقطعات کے متعلق امام رازیؒ کا قول یہ ہے کہ آلہ سورۃ بقرہ کا دوسرا
نام ہے۔ ایک نام بقرہ ہے۔ اور دوسرا آلہ ہے۔

مقطعات
اسمائے الٰہی ہیں

بعض فرماتے ہیں کہ آلہ اور دیگر حدود مقطعات کفایع ۳۲، ۱۲
عَلَّقَ وَغَیْرَہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک ہیں۔ امام رازیؒ نے ایک ہدایت ذکر کی ہے۔
کہ اللہ تعالیٰ کے چھ ہزار نام ہیں۔ اس نے اپنے تمام نام آسمانی کتابوں میں نازل فرمائے ہیں۔
سوائے ایک کے جو اُس نے مخصوص کر لیا ہے۔ اور کسی کو نہیں بتایا۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ آلہ
بھی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسا کہ آلہ کے متعلق امام ابن کثیرؒ نے
لکھا ہے تَذٰکِرُنِیْ حَمْدُہُ وَالرَّمْحُ شَلٰجُہُ ابُوہُ حَمْدُہُ کا واسطہ ہے کہ کتاب ہے۔ کہ لڑائی
گھوڑ دو۔ فہلّا تَلَا حَمْدُہُ قَبْلَ التَّقْدِیْرِ۔

۱۰ تفسیر کبیرہ ج ۱۰
۱۱ تفسیر ابن کثیر ج ۱۰

۱۰ تفسیر کبیرہ ج ۱۰
۱۱ تفسیر کبیرہ ج ۱۰

اس کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ اب جب کہ نیزے کھٹک رہے ہیں۔ اب واسطہ پیش کرتا ہے۔ ح کا واسطہ پہلے کیوں نہ دیا، کہ ہم لڑائی شروع نہ کرتے۔ اب ہم لڑائی نہیں چھوڑ سکتے اس مقولہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ح جو حروف مقطعات میں سے ہے یہ اللہ کا نام ہے۔

بعض اس کی توجہ یوں کرتے ہیں کہ حروف مقطعات اللہ کا پرانا نام نہیں بلکہ بعض اسماء کی طرف اشارات ہیں مثلاً الف کا اشارہ اس کے ذاتی نام اللہ کی طرف ہے۔ ل سے مراد رحمن ہے۔ اور اسی طرح لک کا اشارہ کافی کی طرف ہے ل کا اشارہ اسم لطیف کی طرف ہے۔ اور ہ سے مراد مالک اور اسم مجید ہے۔

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات قرآن پاک کے نام ہیں جیسے ح لیس۔ ا وغیرہ۔ حضرت امیر شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتب الفوز البکیر، خیر کثیر، اور بزم مع میں حروف مقطعات پر بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کشفی طہ پر یہ فہم دیا ہے۔ کہ جس سورۃ کی ابتداء میں یہ حروف آتے ہیں اس سورۃ کا خلاصہ اور عنوان ان حروف میں مذکور ہے۔ ان حروف سے سورۃ کے مضامین کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ ایسے ہی ہیں۔ جیسے کسی شخص کے لیے مفتی، قاضی، امیر سلطان، یا حاکم وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یا اس طرح سمجھ لیں۔ جیسے تعلیمی ڈگری بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی، ڈاکٹر (ڈاکٹر آف لٹریچر، وغیرہ کے الفاظ ہوتے ہیں۔ انہی سے کسی کی شخصیت کی علمی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح حروف مقطعات کے ذریعے کسی سورۃ کا خلاصہ یا اس کی سرخی بیان کی جاتی ہے۔

مقطعات
اسماء قرآنی ہیں

امام ممبر دہلوی صدی کے بڑے صوفی، نحوی اور لغت و ادب کے امام تھے۔ اپنی مشہور کتاب "کامل" ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ان فصیح و بلیغ حروف مقطعات میں پہنچا ہے"

مقطعات
بیشیت چیلنج

۱۔ تفسیر طبری ص ۸۷۰ تفسیر کبیر ص ۶

۲۔ تفسیر طبری ص ۸۷۰ تفسیر کبیر ص ۶

۳۔ تفسیر کبیر ص ۶

۴۔ الفوز البکیر ص ۱۰۱ مطبوعہ لاہور

کہ اے دنیا والو! یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے انہی حروف میں قرآن پاک نازل کیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے: فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ ۚ تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ اگر تم بھی ایسا کر سکو تو مان لیں گے کہ قرآن بھی خدا تعالیٰ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے۔

عربی زبان بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ نزول قرآن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عربی زبان کی ترقی شروع ہوئی اور اس عرصہ میں وہ اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ عرب لوگ اس زبان کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ غیر عربوں کو غمبی یعنی گونگے کہتے تھے۔ عربی زبان کا شعر و ادب کا ذخیرہ کمال درجے کا ہے۔ ہمارے درسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ تو اسی ترقی یافتہ زبان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا ہے "قَدْ نَأْتِيَنَّكَ لَكُمُ الْقَعْلُونَ" عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا اہم اور استاد بنایا تھا۔ انہی اہل زبان کے سامنے آکر کھینچنے کا چیلنج پیش کیا گیا۔ کہ اگر کوئی ہے تو اس جیسا کلام بنا کر لائے۔ مگر کوئی بھی اہل زبان اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔

اہم انخسٹ اور مفسر تغیر خازن کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ حروف مقطعات قسم
اہم انخسٹ ۲۰ کی رائے کے معنوں میں استعمال ہوتے ہوں۔

بعض فرماتے ہیں کہ ان حروف کو قرآن کے انقطاع کے لیے لایا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ پر ختم ہوئی۔ تو دوسرا کلام شروع کرنے کے لیے آئے ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے زمانے میں جی بحث و تمحیص کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے تھے۔ جو اس قسم کے معاملات میں تحقیق کرتے تھے۔ چنانچہ آپ سے آئے کا معنی دریافت کیا گیا۔ تو فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَنَا اللَّهُ اعْلَمُ

یعنی میں تمہارا اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ گویا آسے مراد اَنَا ل سے مراد اللہ اور م سے مراد اَعْلَمُ ہے۔ اسی طرح الْقَصَص سے مراد اَنَا اللہ اُفْقَد ہے یعنی میں تمہارا اللہ ہوں، جو تمہارے لیے ہر چیز تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ اَلْکَل کا مطلب ہے اَنَا اللہ اَرٰی میں تمہارا اللہ ہوں جو تمہاری ہر بات کو دیکھتا ہوں۔

اہم ماوردی
کی تحقیق

امام ماوردی صاحب احکام السلطانہ پختہ زمانے کے بہت بڑے محقق ہونے میں ————— وہ فرماتے ہیں کہ اَلْکَل کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلْعَرَبِکُمْ اور اس کی تفصیل ہے نَزَّلَ عَلَیْکُمُ الْکِتَابَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں: اَلْکَل کا معنی اَقْلُ لَزِیْمٌ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ذَلِکَ الْکِتَابُ یعنی ایمانزدوں کے لیے اولین ضروری چیز یہ کتاب ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہدایت کا منبع و مرکز یہی کتاب ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ آسے مراد اللہ ہے۔ ل سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے اور م سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

شیخ ابن عربی
کا قول

شیخ ابن عربیؒ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ کل وجود خداوند تعالیٰ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام درمیان میں ایک واسطہ ہے۔ جو اللہ سے فیض لے کر اُدھر پہنچاتا ہے۔ اور آخر الوجود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان تک فیض پہنچانے کا واسطہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

بعض فرماتے ہیں کہ اَلْکَل میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ان نیت کی تکمیل کے لیے ذَلِکَ الْکِتَابُ لَزِیْمٌ فِیْہِ اس عظیم کتاب کو نازل فرمایا۔

بعض فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہر ہر لفظ کی تلاوت کی جانی چاہیے تاکہ برکت اور ثواب حاصل ہو۔ خواہ اس کا مطلب سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ تاہم ثواب تو ہر ایماندار کو حاصل ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا ایک معجزہ ظاہر فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام تو اُمی ہیں۔ آپ نے کوئی نوشتہ و خوانہ نہیں کی جب تک کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ایک اُمی حروف تہجی کیسے پڑھ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کے اُمی ہونے کے باوجود ان الفاظ کا پڑھنا ایک غیر معمولی معجزہ تھا۔ حالانکہ نہ آپ نے کسی مکتب میں داخلہ لیا۔ اور نہ کسی استاد سے پڑھا۔ لہذا اس معجزے کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حروف مقطعات نازل فرمائے۔

نزل مقطعات معجزہ
سورہ کائنات کی تعلیم

اہم بیضاوی مسالو لکھنؤ کے عظیم مفسر ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیروں میں اہم صاحب کی تفسیر سب سے اہم ہے۔ آپ کا زمانہ مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا۔ آپ اللہ کی تائید اس طرح کرتے ہیں کہ حرف الف حلق کے انتہائی آخری حصے سے نکلتا ہے۔ لام درمیان سے م ہونٹوں سے نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ حروف آخر، اوسط اور ابتداء کی حصے سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے کلام کی ابتداء اوسط اور آخر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہونی چاہیے۔ گویا اہم بیضاوی نے حروف اللہ کو اللہ کے ذکر کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

حضرت امام شاہ
دلی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے کشفی اور ذوقی طور پر معلوم ہوا ہے کہ اللہ کا مطلب وہ غیر مادی فیض مجرب ہے۔ جو اس مادی اور متحیر مکان والے عالم میں آکر مقید ہو گیا ہے اور لوگوں کے ادب اور علوم وغیرہ کے مطابق ان کی سنگدلی سے متصادم ہے۔ یہ فیض مجرب اعمال فاسدہ، اقوال کاسدہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اور بہ عادت اور اخلاق ردیہ کا رد کرتا ہے۔ یہ اللہ تشریح اور تحقیق قدسی پیش کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ساری سورۃ بقرہ میں اللہ کا یہی اجمال معنی نظر آتا ہے۔ اس سورۃ میں

لوگوں کی نگ دل کا مقابلہ، قوانین کی تشریح اور تحقیق اور بڑے اقوال و صحائف اور بڑے اخلاق کی اصلاح کے متعلق ہی مضامین پائے جاتے ہیں۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ الف کا اشارہ استقامت علی الشریعہ کی طرف ہے۔ اِنَّ
الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا یعنی شریعت پر استقامت اختیار کرنی
چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ لام کا اشارہ مجاہدہ کی طرف ہے۔ یعنی وہ چیز جو ریاضت اور مجاہدہ کہنے
سے حاصل ہو۔ جیسے ”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا“
یعنی جو لوگ ہماری طرف مجاہدہ کریں گے۔ ہم ضرور ان کو راہ بتلائیں گے۔ اسی طرح حرف میم میں
یہ اشارہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجزن ہونی چاہیے۔

مولانا مودودی صاحب
کا تفسیر

مودودی صاحب نے اپنی کتاب تفسیر تفسیر القرآن میں ایک نہایت ہی غلط بات لکھی
ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ آلہ کا معنی پہلے زمانے میں معلوم تھا مگر بعد میں اسے لوگ بھول
گئے۔ اسکا مطلب کہ کچھ لوگ اس کے معانی جانتے تھے بعد میں اسے لوگ بھول گئے۔ یہ تو بالکل ہی غلط بات ذکر کر دی
کہ کسی کو بھی اسکا معنی نہ آتا ہو۔ مفسرین کو اس نے جو معانی بیان کیے ہیں وہ میں نے عرض کر دیے۔

مفسر فراہی
کا قول

مفسر قرآن فراہی کہتے ہیں کہ قدیم مصری زبان میں الف کو سر کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔
بعض زبانوں میں حروف جانور یا درخت کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ اس الف کے دو معنی استعمال
ہوتے تھے۔ ایک معنی گائے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سورۃ کو گائے کے ساتھ مناسبت ہے
کیونکہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ الف کا دوسرا معنی اللہ وحدہ لا شریک ہے۔
تو فراہی لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حروف اس محاورے کے مطابق استعمال کیے
گئے ہوں۔

حرف آخر

اہم جلال الدین سیوطی اور بہت سے مفسرین آخری بات یہ فرماتے ہیں گے۔ اَللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمُرَادِهِ کہ اللہ اہم دیگر حروف مقطعات کی مراد اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اَمَّا بِذَلِكَ وَصَدَّقْنَا بِهْمِ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں
 ہمارے عقل ناقص ہے۔ لہذا یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کے معانی ضرور ہی معلوم کر سکیں۔ اس کا
 احسن طریقہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دینا چاہیے۔ کہ ان حروف سے
 اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے، وہ برحق ہے۔ اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

اَمَّا وَصَدَّقْنَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الحزب الاول

۱۴۴

عزائم

الْقَا ۱ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۲
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُ
يُنْفِقُونَ ۳ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا
أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۵ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۴ أُولَٰئِكَ
عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ۶ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۵

ترجمہ: الْقَا ۱ یہ کتاب۔ نہیں شک اس میں۔ یہ رہنمائی کرتی
ہے متقینوں کی ۲ جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو۔ اور
جو روزی ہم نے ان کو دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۳ اور
وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اُس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اُس چیز
پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۴ یہی
لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہی لوگ مراد کو پہنچنے
والے ہیں۔ ۵

لفظ ذلک
کی حکمت

عربی میں ذلک اشارہ بعید کے لیے اور ہذا اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے
یہاں پر گفتگو اس کتاب یعنی قرآن پاک کے لیے ہو رہی ہے۔ لہذا اسم اشارہ ہذا
استعمال ہونا چاہیے تھا یعنی یہ کتاب۔ نہ کہ ذلک یعنی وہ کتاب۔ اس اشکال کے متعلق مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر اشارہ بعید استعمال کرنے کا مقصد اس کتاب کی عظمت اور شان

۱۔ تفسیر ابن المعالی ج ۱۔ ۲۔ تفسیر عزیزی قدسی ج ۱۔ پارہ ۱۔

کا اظہار ہے۔ لہذا ذَلِکَ الْکِتَابُ کا معنی یہ ہو گا۔ کہ یہ وہ کتاب ہے۔ جو اپنے کمال حقائق و دقائق، اسرار اور درجہ کی بندی کی وجہ سے مخاطبین کے فہم سے غائب اور انسانی افکار کی جوں کا توں نگاہ سے بہت بلند ہے لہذا اس کے لیے ذَلِکَ کا اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام ایک دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں میں قرآن پاک کے متعلق پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ چنانچہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ میں تیرے بجائوں میں سے تیرے جیسا ایک بنی برپا کروں گا۔ اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ اور وہ کلام یہی وحی الہی قرآن پاک ہے۔ تو یہاں پر ذَلِکَ الْکِتَابُ کا معنی ہے کہ یہ وہی کتاب ہے۔ جس کی پیشین گوئی پہلی کتابوں میں کی گئی تھی۔

یا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جسے پہلے لوح محفوظ سے بیت العزت میں نقل کیا گیا۔ اور پھر وہاں سے تیس سال کے عرصہ میں بتدریج بنی علیہ السلام پر نازل کیا گیا یا وہ ہے کہ بیت العزت آسمانوں میں ایک مقام ہے۔ جہاں پر قرآن پاک اولیٰک وقت منتقل کیا گیا تھا۔

لفظ لا ریب
کا مضموم

لَا رِیْبَ فِیْہِ کاعلم فہم معنی یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ نہیں یعنی چاہیے کہ کوئی دوسرا شخص اس کلام میں شک و شبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بلاشبہ کفار و مشرکین قرآن پاک کی صداقت پر شک کرتے تھے۔ اسی لیے تو تیسرے رکوع میں ان لوگوں کو حیلہ سلج کیا۔ "وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا" یعنی اگر تمہیں اس چیز میں کوئی شک ہے۔ جو ہم نے اپنے بند پر اتاری ہے۔ "فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ" تو اس جیسی ایک سورہ ہی بنا کر لاؤ۔ تمہاری قابلیت کا پتہ چل جائے گا مطلب یہ کہ مشرکین کو لازمہ اس کلام میں شک کرتے تھے۔ تو یہاں پر لَا رِیْبَ کا معنی یہ ہے کہ واقعہ اور شخص الامر میں اس کلام میں شک و شبہ والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی شک کرتا ہے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی اور دماغ کی خامی ہے۔ وہ شخص تعصب اور عناد کی وجہ سے شک کرتا ہے۔ ورنہ اس کتاب

میں تو کوئی خامی نہیں۔

حضرت شیخ المنہ
کی تفسیر

شیخ المنہ مولانا محمود الحسنؒ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں شک و شبہ کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اُس چیز میں واقعی کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس چیز میں تو کوئی شک و شبہ یا نقص نہیں ہوتا مگر شک کرنے والے کے اپنے دماغ کی خرابی اور خلل کی وجہ سے اُسے وہ چیز مشکوک نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت اس کا ایک ایک لفظ شک و شبہ سے پاک ہے اس میں نہ کوئی کذب بیانی ہے اور نہ ہی کوئی خلاف واقعہ چیز ہے۔ یہ تو محض شک کرنے والے کے اپنے ذہن کا فتور ہے۔ جو اس کلام پاک میں شک کرتا ہے۔ مشرکوں اور منافقوں کے دماغ خراب تھے جو قرآن پاک پر اعتراض کرتے تھے، آج کل کے ملحدوں کے ذہن بھی پر اگندہ ہیں جو قرآن پاک کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن پاک کی کوئی بات مشکوک نہیں۔ بلکہ یہ تو مبینع رشد و ہدایت ہے۔

حضرت مولانا شیخ المنہؒ برصغیر کی جانی بچانی شخصیت ہیں یہ میرٹھ سے ہیں انہیں کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے، شاہ کی جیل میں اسیری کے دوران کیا تھا۔ تقریباً دو سو توں کا حاشیہ بھی لکھا تھا مگر زندگی کے یاد پوسٹ ہو گئے۔ حاشیہ کا باقی بھر آپ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ ہی کی حسب منشا انجام دیا۔ آپ کا کیا ہوا ترجمہ قرآن بامحاورہ ہے۔ اور بلند ترین تراجم میں سے ہے۔

قرآن پاک کے اردو ترجمے بہت سے بزرگوں نے کیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کا ہے۔ یہ سب آسان لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے ذریعے الفاظ کے معانی سمجھنا نہایت مشکل ہے۔

آپ کے بعد دوسرا بامحاورہ اردو ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ہے۔ یہ بہترین بامحاورہ ترجمہ ہے آج تک علماء اہل اہل ترجمہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ شیخ المنہؒ

۱۔ ترجمہ قرآن ص ۱ مطبوعہ دارالتبلیغ نواحی

۲۔ صاحب درس حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی کے پاس دوران درس

کا ترجمہ پھر حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ آپ نے قرآن پاک کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ فن تجوید کے متعلق اور پھر ربط کے بارے میں، اور اصول کے بارے میں آپ کی کتب موجود ہیں۔ آپ کی تفسیر علمی ہونے کی بنا پر ذرا مشکل ہے۔ تاہم یہ بلند پایہ اردو تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علماء کرام نے ترجمہ کیے ہیں یہ آپ کے پاس جو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا احمد علی لاہوری کا ہے۔ انہوں نے نہایت آسان اور عام فہم ترجمہ کیا ہے اور اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

فرمایا یہ وہ کتاب مقدس ہے۔ جو شک و شبہ سے بالابے **اِهْدِي لِّلْمُتَّقِينَ** قرآن پاک متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہاں پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ ہدایت تو کون سے لوگوں کے لیے ہونی چاہیے تھی متقی تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہیں، ان کے لیے ہدایت ہونے کا کیا معنی؟

اس ضمن میں شاہ عبد القادر اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ متقیین سے مراد ہیں، بچکنے والے اور ڈرنے والے لوگ اور تقویٰ کی طرف جانے والے لوگ۔ یعنی جن میں ضد اور مخا نہ نہیں پایا جانا۔ بلکہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ اس قرآن کو پڑھیں گے، تو ان میں تقویٰ پیدا ہوگا، یہ متقی بن جائیں گے، مقصد یہ کہ اگرچہ آج یہ لوگ متقی نہ بھی ہوں، مگر اس قرآن پاک کی برکت سے آئندہ زندگی میں تقویٰ اختیار کر لیں گے۔ شاہ عبد العزیزؒ اس کا معنی سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بڑا عقلمند، نوجوان، بڑے مضبوط جسم والا شخص ہو۔ تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے فلاں ماں کا دودھ پیا ہے۔ دیکھو کتنا طاقتور ہے۔ گویا اس کی ماں کے دودھ میں وہ طاقت اور تاثیر ہے۔ جس سے اس قسم کے کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ **اِهْدِي لِّلْمُتَّقِينَ** کا مطلب یہی ہے کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے

قریب ہوں گے۔ اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے۔ کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ **هٰذِي لِلْعٰلَمِيْنَ** بھی آیا ہے۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔

تقویٰ کی
تعریف

حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں حضرت ابی بن کعبؓ بڑے قاری تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا۔ حضرت تقویٰ کا کیا معنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا **اَمَّا سَلَكَ طَرِيقًا ذَا شَوَاطِئَ** کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑ ہوں۔ تو انہوں نے جواب دیا ہاں! بہت دفعہ ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا۔ پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا **شَمَوْتُ وَاجْتَهَدْتُ** میں نے دامن سمیٹ لیا اور پورنی کوشش کی کہ کانٹے میرے جسم کے کپڑوں میں نہ الجھ جائیں اور میں سلامتی سے ایسے راستے سے نکل گیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا **فَذَلِكَ التَّقْوٰی** تقویٰ اسی کو کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں پیسے ہوتے کفر، شرک، گمراہی، بدعت اور دیگر خرابیوں سے انسان بچ کر نکل جائے۔ جو شخص ان چیزوں سے دامن بچ کر نکل گیا۔ وہی متقی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے تقویٰ کا مطلب پوچھا گیا، تو فرمایا اللہ کے حکم کے سامنے کسی اور کا حکم نہ مانے اور یقین رکھے کہ تمام کام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا جس شخص کا اعتقاد اور عمل یہ ہو وہ متقی ہے۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ تقویٰ کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا **اَلَا تَرٰی نَفْسًا خَيْرًا مِّنْ اَحَدٍ**۔ یعنی تم اپنے نفس کو کسی دوسرے سے بہتر نہ سمجھو۔ نہ یہی سمجھو کہ میں ہی کمزور ہوں اور میرا ہی قصور ہے جب تمہارے اندر یہ چیز پیدا ہو جائے تو متقی بن جاؤ گے۔ حضرت مجتہد الف ثانی کا قول ہے جگہ

برَأٰ کس معرفت خدا علم است کہ خود را از کافر خرمگ بستر دانہ

یعنی جو شخص اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر سمجھتا ہے۔ اس پر خدا کی معرفت حرام ہے آپ نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ کہ اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر نہ سمجھے۔ کیونکہ ہو

لے تفسیر کبیر ص ۱۱۱

لے تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۱

بیچھے اٹھ آپ نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کہتے تھے یہ رقم ان کو دوجن کا حق چھین رکھا ہے۔
مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے تقویٰ کی بات تھی۔
خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کسی حکم سے پوچھا کہ بھائی! تمہی کون ہوتا ہے، تو اس حکم نے جواب دیا متقی وہ ہوتا ہے
جو خدا کو مخلوق پر اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ وہ متقی ہوتا ہے۔

ایمان بالغیب

کتاب الہی کا ابتدائی تعارف کرنے کے بعد کہ یہ متیقن کے لیے ذریعہ ہدایت ہے
ارشاد ربانی ہے کہ متیقن وہ لوگ ہیں۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ جو غیب پر ایمان
رکھتے ہیں۔ غیب وہ چیز ہوتی ہے۔ جو ادراک، حواس ظاہرہ و باطنہ عقل و فہم اور خیال کی دوسرے
سے باہر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ فرشتے ہیں۔ برزخ اور آخرت
کا دن ہے۔ اس میں آخرت کے تمام معاملات شامل ہیں۔ یہ سب غیب ہیں۔ اس کی تشریح
سورۃ بقرہ کی آخری آیات الْأَمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ أَمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ میں آچکی ہے۔ ان تمام
چیزوں پر ایمان ہونا چاہیے۔ البتہ غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ بندوں کے لیے
سوائے وحی۔ الہام یا کشف وغیرہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کسی پر
الہام نہ کرے، تب تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا جب تک کسی نبی یا رسول پر وحی نہ کرے یا کشف
کے ذریعے کسی پر کوئی بات منکشف نہ کرے، اس وقت تک کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جب کسی
کو کسی بات کی اطلاع دے دیجائے، یا کوئی چیز ظاہر کر دی جائے۔ تو وہ غیب نہیں رہتا۔ غیب
وہ ہوتا ہے۔ جو عقل و حواس یا کسی اور ذریعے سے منکشف نہ ہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے
ساتھ مختص ہے۔ اسی کو علم الغیب والشہادۃ کہا گیا ہے جو بغیر کسی حواس، قوت یا آسے
کے جانتا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ علم کا معنی ہوتا ہے۔ جاننا اور معرفت کا معنی ہے پہچاننا اور ایمان
کا معنی ہے ماننا۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہودی بھی تو جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ انسان
مستی کس طرح ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ مستی وہ شخص ہو سکتا ہے جو
اولاً اپنے دلی جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہو۔
ثانیاً اپنی پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے والا ہو۔

ثالثاً یہ کہ اپنے بناء جنس پر اسی طرح رحم کرنے والا ہو۔ جس طرح اپنے آپ پر رحم کرتا ہے۔
گویا جس طرح خود اپنے آپ کو ہر تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی جذبہ ہوسرور
کے لیے بھی موجود ہو۔ جس شخص میں یہ تین علامتیں پائی جائیں گی وہ مستی بن جائے گا۔

محمد بن یوسف غریابی ایک بزرگ ہوئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوری
سے پوچھا کہ کیا بات ہے جہاں جائیں آپ ہی کا چرچا ہوتا ہے۔ لوگ آپ کے اس قدر
مدح ہیں۔ حالانکہ میں نے تو آپ کو رات کے وقت سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی آپ
کو ساری رات عبادت کرتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ آپ نے فرمایا، چپ رہو۔ یہ بات تقویٰ
پر مبنی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا کرے، اُسے مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

امام سفیان ثوری نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی طرح حکومت کے
معتوب ہے حتیٰ کہ منصور نے آپ کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا کہ سفیان جہاں سے
اُسے سولی پر لٹکا دو۔ وجہ یہ تھی کہ آپ حکومت کے غلط احکام پر تنقید کرتے تھے۔ انہیں ظلم
سے منع کرتے تھے۔ ایک موقع پر ساتھیوں نے عرض کیا، حضرت! منصور ابراہیم ہے آپ
کو گرفتار کر لے گا۔ وہ آپ کے لیے سزائے موت کا حکم پہلے ہی جاری کر چکا ہے۔ لہذا
آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کی کہ اے پروردگار! اگر
منصور مکے میں آجائے تو میں کعبہ سے بری ہو جاؤں گا۔ آپ نے ایسی سخت دعا کی کہ منصور
راتے میں ہی ہلاک ہو گیا۔ آپ کو بادشاہ نے بڑا لالچ دیا۔ پچاس ہزار روپے بطور عطیہ

اسی طرح مسجدیں بنانا اور ان میں ضروریات فراہم کرنا، اور دینی مدارس کا قیام بھی
 مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ میں آتا ہے۔ کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں
 یا نل لگوانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا۔ حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوسرے کو کروانا۔ اللہ تعالیٰ کے
 راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا، یہ سب بذات ہیں۔ جن پر خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ
 میں آتا ہے۔ اور باعثِ اجر و ثواب ہے۔ نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ
 خرچ کرنے کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے۔ کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں
 دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ ان کے مقابلے کے لیے جو مال خرچ کیا جائے۔
 اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات
 وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے، نوکر چاکر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے، یہ
 سب اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ کا صدق
 بنتا ہے۔

کتبِ سماوی
 پر ایمان

اس کے بعد فرمایا متقین وہ لوگ ہیں وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
 یعنی آپ پر جو کتاب ہدایت اور جو احکام نازل ہوئے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں وَمَا
 أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور جو پہلے پیغمبروں پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں
 یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ پہلی کتابوں پر صرف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان پر عمل کرنا
 ضروری نہیں، عمل ان احکام پر ہوگا۔ جو آخری کتاب قرآن پاک میں نازل ہوئے ہیں۔ قرآن
 پاک کے نزول اور حضور علیہ السلام کی شریعت کے نفاذ پر پہلے تمام احکام منسوخ ہو چکے
 ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے، ان پر عمل ضروری نہیں تاہم ان پر ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے
 پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ نازل فرمایا وہ برحق ہے۔ یہ اجزائے ایمان میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام آسمانی
 کتابیں برحق ہیں۔ تاہم قابلِ عمل احکام صرف قرآن پاک کے ہیں۔

مستقین کی آخری صفت یہ بیان فرمائی وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ وہ آخرت

ایمان بالآخرت

مگر مانتے نہیں۔ وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ یہودی بنی آخر الزماں کو
 "يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ" اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی
 اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتے۔ ہاں! ایماندار اور پھر متقی وہ ہیں جو غیب پر ایمان
 رکھتے ہیں۔ ملائکہ، برزخ، آخرت وغیرہ تمام چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ
 چیزیں بنی علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلائی ہیں۔ لہذا متقی وہ ہیں جو ان سب پر ایمان رکھتے ہیں
 کہ یہ چیزیں برحق ہیں۔ اَمَّا وَحَكِّقًا

اقامت صلوٰۃ

متقین کی دوسری صفت ہے۔ اقامت صلوٰۃ فرمایا متقین وہ ہیں وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
 جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یہاں پر يُقَوِّدُونَ الصَّلَاةَ یعنی نماز ادا کرتے ہیں۔ نہیں فرمایا۔
 بلکہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو کہ بڑا گہرا لفظ ہے۔ اقامت کا مطلب یہ ہے کہ قیام
 رکوع، سجود، تلاوت، فرائض، سنن، واجبات اور مستحبات وغیرہ کو احسن طریقے سے ادا کیا
 جائے۔ جو لوگ ان تمام چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز
 ادا کرتے ہیں، اقامت صلوٰۃ کرنے والوں سے وہی لوگ مراد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ
 نے اقامت صلوٰۃ کا معنی یہی کیا ہے کہ نماز کے تمام ارکان کو ٹھیک طہر پر ادا کیا جائے۔

انفاق فی
 سبیل اللہ

ایمان بالغیب اور اقامت صلوٰۃ کے بعد متقین کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی وَهَيَّأَ
 رَزَقَهُمْ يَنْفِقُونَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں
 خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف مدت میں سے پہلے نمبر
 پر زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطر تیسرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائیں۔ محتاجوں۔
 یتیموں۔ کمزوروں۔ یتامیٰ اور یتیم خانوں کی حاجت بدائی ہے۔ اس کے بعد وقف کی مدائی
 ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تاکہ اس کو
 آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور علیہ السلام سے عرض کیا
 کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ اپنے فرمایا وقف کر دو۔ چنانچہ وہ وقف
 کر دی گئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَسَوَّاهُمْ عَلَيْهِمْ أَنْذَرْتَهُمْ أَوَّلَهُمْ تَنْذِرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَسَّ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انکو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے ہر نگاہی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ⑦

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں پہلا گروہ مومنین کا ہے۔ جو ہدایت کو ظاہر اور باطناً قبول کرتے ہیں اور اسے اپنا کرتے ہیں۔ یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو ہدایت الہی کا ظاہر بھی انکار کرتے ہیں اور باطناً بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، لہذا کافر کہلاتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ ان کا تیسرا گروہ زبان سے تو ہدایت ربانی کا اقرار کرتا ہے۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ منافق ہوتے ہیں۔ آئندہ تیسرے ۱۲ آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔

ان میں سے پہلا گروہ جو متقین اور مومنین کا گروہ ہے اور فلاح پانے والا گروہ ہے البتہ دوسرے دونوں گروہ ناکام ہیں۔ پھر ان میں سے کافروں کا حال مختصر طور پر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کی مثالیں بھی دی ہیں۔ شبہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ

کے دن پر یقین رکھتے ہیں آخرت کے دن سے مراد قیامت کا دن یا دنیا کا آخری دن
 (LAST DAY OF THE WORLD) ہے۔ اسی لیے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اے
 دارالآخرت یا آخرت کا گھر بھی کہتے ہیں۔ گویا یہ بھی ایمان کے اجزاء میں سے ہے۔ اسی
 طرح فرشتے، آسمانی کتابیں، اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور توحید یہ سب ایمان
 کے اجزاء ہیں۔ تقدیر بھی ایمان ہی کا حصہ ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا
 اللہ تعالیٰ کے علم ارادے اور مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔
 فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى
 مِّن رَّبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ وَ اُولَئِكَ هُمُ
 الْمُفْلِحُونَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فلاح کے معنی مراد کو پہنچنے والے ہیں
 تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے جس پروگرام کو لوگ نماز میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
 کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پروگرام یہاں تک بتا دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس پروگرام کو تسلیم کر کے اس
 پر عمل کریں گے۔ فلاح پائیں گے۔ اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔ وہ فلاح حاصل نہیں
 کر سکے گی۔ اگرچہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھی سودہ حال ہو جائے۔ پروگرام کو واضح کر دیا گیا ہے
 یعنی ایمان، تقویٰ، انفاق فی سبیل اللہ۔ پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان،
 اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اسی کی وجہ سے دائمی نذاب
 سے نجات حاصل ہوگی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔

ہدایت یافتہ
 لوگ

سکتے ہیں کہ انگریز کا فکری وقت ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے۔
اور کفارِ انفس موٹا موٹا ہوتے ہوتے شیطان ہی بن جائے لہذا جب تک اپنے آپ کو اس سے
جھڑ نہ کھجھو گے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر وہ عامل نہ ہوتی تو متقی کیسے بن سکتے ہو
(محکم الاسلام) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شجرہ مبارکہ میں ایک شعر آتا ہے۔

زمن دارد سگے نصرتیاں عار کہ او بے گناہ و من گنہگار
یعنی مجھ سے تو نصرتیوں کا کتا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ گنہگار نہیں اور میں گنہگار ہوں عارضی
اور انکار ہی کا یہ معیار ہے۔ اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان شرک کی تمام
اقسام سے پاک ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو عذاب سے خلاصی پائے گا۔ ”وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ
الْمُتَّقِينَ“ کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا ہے۔

تقویٰ کے
تین درجات

تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کبیرہ گنہوں سے بچتا ہے اور چھوٹے گناہوں
پر صراحت کرے۔ اور تیسرا درجہ تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان مشکوک اور شبہات والی باتوں سے
بچتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کے ان تینوں درجات پر پورا اترے گا وہی کامل درجے کا متقی ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حسرت کے دن یعنی قیامت کے روز آواز آئے گی
کہ متقی لوگ کہاں ہیں متقی لوگ اٹھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کے سایے میں چلے جائیں گے۔

متقی کون ہیں؟

وہ تجلی ان پر ہر وقت سایہ فگن ہوگی اور کسی وقت ان سے علیحدہ نہیں ہوگی کسی نے حضرت معاذ بن جبلؓ
سے دریافت کیا کہ حضرت! متقی کون ہیں۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ متقی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے
آپ کو انواعِ شرک سے محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرتے رہے۔ متقیوں کی علامت
یہ ہے کہ اگر انہیں مصیبت آئے تو صبر کریں۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اگر رحمت
آئے تو خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں قرآن پاک کے احکام کے سامنے ہمیشہ مطیع و فرمانبردار رہیں
یہی لوگ متقی ہیں۔

بڑا خطرناک کردہ ہے۔

کفر کا معنی

عربی زبان میں کفر کا معنی کسی چیز کو چھپا دینا یعنی مخفی اور پوشیدہ کر دینا ہے۔ اسی لیے اہم بیضاویؒ کہتے ہیں کہ جس ڈوڑھی کے اندر پھل بند ہوتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ اودکان جوزین کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ جیسے سورۃ الحديد میں آتا ہے کَعْمَلُ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكَفَّارِ نَبَاُئُہٗ گویا کافر کا لفظ کان پر بھی بولا گیا ہے۔ بادل اور اندھیرا جو سورج کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ اس کو بھی کافر کہتے ہیں ۵

فِي لَيْلَةٍ كَفَرَ النَّجْمُ ثُمَّ عَقَابَهُمُ

یعنی بادل اور اندھیرا ستاروں کو چھپا لیتا ہے۔ تو لغوی اعتبار سے اس کا معنی یہ ہو گا۔ جیسا کہ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ سَكَّرُوْا لِحْوٰثِہٖۤ اَشْدَّ مِنْ شُرْکٍ وَّہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ جنہوں نے سنا کی وجہ سے حق کو چھپا دیا۔ مارک دالے اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں یعنی حق کو چھپا دیا۔ ظاہر ہی نہیں کیا۔

جب کفر کا اطلاق شریعت کی اصطلاح میں کیا جاتا ہے تو اس کا خاص معنوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو چیز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو۔ شک و شبہ دال بات نہ ہو، اُس چیز کا منکر کافر کہلاتا ہے۔ اور یہ انکار کفر کہلاتے گا۔ خواہ کسی ایک چیز کا انکار ہو یا تمام چیزوں کا۔

کفر کی مختلف اقسام

جس طرح شرک نفاق، المحاد، ارتداد، زندقہ، فسق، ایمان، توحید وغیرہ قرآن کی مختلف اصطلاحات ہیں۔ اور ان سب کا الگ الگ معنوم ہے اسی طرح کفر بھی ایک اصطلاح ہے اور اس کی مختلف اقسام ہیں۔ جو کہ مفسرین، محدثین، فقہاء اور علما نے بیان کی ہیں۔

کفر انکار

مبطلان کے کفر انکار ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص دل اور زبان دونوں سے شریعت کی قطعی چیز کا انکار کرے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْہُمْ اَشَدُّۤ اَعْدَآءُ اللّٰہِ لَہٗمْ ہٰذَا الَّذِیْ کَانَ یَعْنٰی کہ کوئی شخص حق کی بات کو جاننے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ لہذا یہ کفر انکار ہے

قرآن پاک میں کفر کی جس دوسری قسم کا ذکر آتا ہے۔ وہ کفر مجرد ہے۔ بحد کا معنی انکار
 ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ وَجَدُوا بِهَا شَيْءًا ظَاهِرًا ہے۔ کفر مجرد کی تعریف یہ ہے کہ آدمی دل
 سے پہچانتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ بات سچی ہے۔ مگر وہ اس کا زبان سے اقرار نہیں کرتا۔
 جیسا کہ فرعونوں کے متعلق فرمایا: وَجَدُوا بِهَا شَيْءًا ظَاهِرًا وَاسْتَيْقَنَتْ بِهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا
 وَكُفْرًا دَلِيلًا فِيهِمْ تَحْتَهُ۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین سچا ہے۔ مگر وہ اس کا انکار کرتے تھے
 یہ انکار ظلم اور تعدی کی بنا پر تھا۔ اس کو کفر مجرد کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا
 کفر ہی ہے۔ کیونکہ وہ دل میں حق بات کو سمجھتا ہے۔ مگر اقرار کی بجائے انکار کرتا ہے۔
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص بلعم بن باعور! ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ
 کی بارگاہ سے مرود ہوا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے
 زمانہ میں ایک بڑا حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت ہوا ہے۔ اس کا کفر بھی ایسا ہی تھا۔ اُس نے
 حق کو جانتے پہچانتے ہوئے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت
 محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں وحی نازل کی۔ مجھ پر کیوں نہیں کی۔ عربی زبان میں اس کا کلام
 موجود ہے۔ وہ شخص نبی! بدی اور قیامت تک کا تصور رکھتا تھا۔ وہ توراۃ اور انجیل کا قاری
 اور ہدایت کا طلب گار تھا۔ مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔
 اور آپ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ دل سے برحق سمجھتا تھا۔ وہ اتنا قابل آدمی تھا
 کہ اس کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی بڑا مومن آدمی ہو گا۔ حضور علیہ السلام نے اس
 کے متعلق فرمایا: أَنْتَ مُسَقِّنٌ مِّنْ رِّسَالِنَا وَلَوْ كَرِهَ الْغَافِلُونَ قُلْ لَّيْسَ بِي كِبَارٌ وَلَا يَكُنْ لَّيْسَ بِي كِبَارٌ وَلَا يَكُنْ لَّيْسَ بِي كِبَارٌ
 جیسی ہے مگر دل کا فربہ۔

ہمارے زمانہ میں ایک افسانہ نویس انگریز برٹا شاگردا ہے۔ بڑا صاحب علم تھا، اسلام
 کو وہ بھی سچا سمجھتا تھا۔ مگر کثرت سے اقرار نہیں کیا۔ یہی حال مشرک گاندھی کا تھا۔ وہ اسلام کو
 سچا مذہب کہتا تھا۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ عیسائیت اور ہندو مت کو بھی سچے مذاہب ہی

سمجھتا تھا۔ ملائکہ سچا مذہب تو صرف اسلام ہی ہے۔ اِنَّ السَّيِّئِينَ سَيِّدَ اللّٰهِ الرَّسُولُ
باقی سب ادیان باطل ہیں۔ یہی کفر تجرود ہے۔ کہ کسی چیز کو دل سے صمیم سمجھ کر پھر زبان سے
اس کا اقرار نہ کیا جائے۔

کفر کی تیسری قسم کفر عناد ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دل سے پہچانتا بھی ہے زبان

سے اقرار بھی کرنا ہے کہ یہ دین درست ہے۔ مگر قبول نہیں کرنا۔ اس کی مثال ابوطالب کا
کفر ہے۔ وہ حضرت علیؑ کے والد اور حضور علیہ السلام کے چچا تھے۔ وہ تھا کہ میرا عہد سچا ہے
صادق اور امین ہے۔ جو کہتا ہے۔ سچ ہے مگر اس نے ایمان اور توحید کو قبول نہیں کیا۔

اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہوا۔ وہ عجیب قسم کے دہم کا شکار تھا۔ محض اس ڈر سے اسلام قبول
نہیں کیا۔ کہ عورتیں طاعت کریں گی کہ موت کے ڈر سے باپ دادا دین چھوڑ دیا۔ یہ کفر عناد ہے

کفر کی چوتھی قسم کفر نفاق ہے۔ اس کا ذکر اگلی باتوں میں آ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ انسان زبان سے اسلام کی سچائی کا اقرار کرتا ہے۔ کلمہ بھی پڑھتا ہے۔ نمازیں بھی ادا کرتا ہے
زکوٰۃ دیتا ہے۔ بسا اوقات جہاد میں بھی شریک ہوتا ہے۔ مگر دوسرے تکذیب کرتا ہے یہ
کفر نفاق ہے۔ اور پھر نفاق بھی دو قسم سے ہے یعنی اعتقادی نفاق اور عملی نفاق۔ یہاں پر
جس نفاق کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اعتقادی نفاق ہے کہ اعتقادِ اول سے تسلیم نہیں کرتا عملی نفاق
کا ذکر بعد میں آئے گا۔ وہ اور چیز ہے۔

محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ چاروں کفر خطرناک ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی مبتلا ہو
گیا۔ وہ اللہ کے ہاں کبھی نجات نہیں پاسکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ یہ قطعی
بات ہے۔

کفر شک اس کے علاوہ بھی کفر کی کئی قسمیں ہیں۔ منجملہ ان کے کفر شک ہے۔ قرآن پاک میں

بعض منافقوں کے بارے میں آتا ہے۔ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَذَدُّونَ۔ دوسری
جگہ فرمایا بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ۔ یعنی ایسے لوگ شک میں ہی کھیل رہے ہیں۔

یہ کفر شک کہلاتا ہے۔

اسی طرح کفر کی ایک قسم کفر جہالت ہے۔ علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے
ساری عمر جہالت میں گزر جاتی ہے۔ نہ علم ہوتا ہے اور نہ وہ راہِ راست پر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے ایسے لوگوں کی جگہ جگہ پر مذمت بیان کی ہے: أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ان میں سے
اکثر لوگ نہیں جانتے یعنی علم نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ فرمایا: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ
يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ مطلب یہ کہ برابر
نہیں ہوتے۔ اس قسم کا کفر کفر جہالت ہے۔ جس میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

کفر تاویل کو اتحاد اور زندگی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو غلط مطلب
پہنا دیا جائے۔ اصل مقصد کچھ اور ہو مگر تاویل کے ذریعے کچھ سے کچھ بنا دیا جائے مثلاً غلام احمد پر ویز
قرآن پاک کی آیت أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ کا مطلب مرکزیت یا سنٹرل گورنمنٹ
مراد لیتا ہے کہ مرکزی حکومت کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح حج کا معنی اس نے عالمی کانفرنس
کیا ہے۔ حالانکہ حج ایک عبادت کا نام ہے۔ اس کے ارکان ہیں جن کو پورا کرنا ضروری ہے
اس لیے محض عالمی کانگریس یا عالمی کانفرنس کا نام دینا بالکل غلط ہے۔ پرویز نے اپنی کتابوں میں
لکھا ہے کہ خدا کے محکوم ہونے کا مطلب اپنی فطرت کا محکوم ہونا ہے۔ یہ بھی کفر والا معنی ہے۔ اس
نے ترجمہ القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ کا معنی قانون ہے۔ جہاں بھی اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے
مراد قانون ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی ذات یا ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے حُورٍ عِیْنٍ کا معنی
پاکیزہ فکر کیا ہے۔ گویا جنتوں سے مراد پاکیزہ فکر والے لوگ ہیں۔ حالانکہ حُورٍ عِیْنٍ کی اصطلاح
کو تمام مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ عورتوں کی ایک پاکیزہ مخلوق ہے۔

غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ازالہ ادھام میں محمد رسول اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ
خدا تعالیٰ نے قرآن میں میرا نام محمد بھی رکھا ہے اور رسول بھی۔ العیاذ باللہ۔ یہ کفر والا معنی ہے۔
اس سے پہلی آیت وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ کا معنی قادیانی یوں کرتے ہیں۔

بِالنَّبَوَةِ الْآخِرَةِ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو آخری نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آخری نبوت مرزا غلام احمد مرتد کی لیتے ہیں حالانکہ آخرت سے مراد دارالآخرت یا یوم آخرت ہے نہ یہ زمیوں کی تادیل کی مثال ہے۔ اسی طرح انہوں نے وَلَٰكِنْ رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ کا معنی یہ کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے مہر لگانے والے ہیں۔ یعنی اب جو نبی آتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر سے آتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہر لگا لگا کر دوسروں کو نبی بنا رہے ہیں (العیاذ باللہ)

الغرض کفر تادیل سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا معنی کرنا جو نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، نہ صحابہ کرام سے اور نہ سلف صالحین سے ثابت ہو، وہ کفر تادیل، زندہ قیام الحاد میں شمار ہوگا۔

مہر سید احمد خاں نے بہشت کا معنی مسرت اور خوشی کیا ہے۔ دوزخ کو غم اور پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ خوشی اور مسرت اچھے اعمال کا صلہ ہوتی ہے۔ اور رنج و غم بُرے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور دوزخ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہ بھی کفر یہ معنی ہے۔ کفر کی ایک قسم عملی کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نعمت کی قدر دانی کی بجائے اس کی ناشکری کی جائے۔ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، حضور! کفر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ناشکرگزاری اور نافرمانی۔ اکثر عورتیں اس قسم کے کفر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ عورتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے تَكْفُرُ بِنِ الْعَشِيرَةِ یعنی تم خاوند کا کفر کرتی ہو۔ ناشکرگزاری کرتی ہو۔ یہی عملی کفر ہے۔ فرمایا کہ خاوند زمانہ بھر راحت و آرام مہیا کرتا ہے اگر ایک مرتبہ بھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جاتی ہے۔ ترک کرتی ہو، تیرے گھر آکر مجھے کبھی کبھی نصیب نہیں ہوا کفر من نعمت اکثر عورتوں کے مزاج میں داخل ہوتا ہے۔ یہ اعتقادی کفر نہیں بلکہ عملی کفر ہے۔

محدثین اور فہمکے کلام عملی کفر کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ بعض عملی کفر ایمان کے بالکل منافی ہوتے

عملی کفر

کا اقرار نہیں کرتے کہ وہی ہر چیز کرنے والا ہے۔ بلکہ زلمے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ کفر و کبریت کلام ہے۔
 اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ ءَا نْذَرْتَهُمْ مِّنْ یَّوْمٍ اَوْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یَکْفُرُوْنَ
 ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ کفار کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔
 اگر ایسا ہے تو پھر انہیں ایمان کی تبلیغ و دعوت سے کیا حاصل؟

ایک اشکال اور
 اس کا جواب

مفسرین کرام وضاحت فرماتے ہیں کہ اس مقام پر لفظ سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ یعنی ان کفار کے لیے برابر ہے۔ خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ سَوَآءٌ عَلَیْکَ کے الفاظ نہیں آئے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ان کو تبلیغ کرنا یا نہ کرنا آپ کے لیے برابر ہے۔ یہ تو ان کے لیے برابر ہے۔ کہ انہیں کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا تو فرض ہے کہ آپ فریضہ تبلیغ انجام دیتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہے۔ آپ کے لیے حکم یہی ہے "فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتْ الذِّکْرٰی" آپ نصیحت کرتے چلے جائیں، چاہے وہ انہیں فائدہ دے یا نہ دے۔ آپ کو اس تبلیغ کا ہر حالت میں اجر ملے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنْذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾

ع

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۶﴾ اللہ تعالیٰ نے ہر ٹکادی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۷﴾

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دو سکرگروہ گنہگار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ متعین کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دو سکرگروہ کا بیان ہے اور دوسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جو ظاہر اور باطن اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکسار کرتے ہیں۔ اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ کفر کی تشریح اور اس کی مختلف اقسام گزشتہ درس میں مختصر بیان کر دی گئی تھیں۔

گزشتہ درس میں اس اشکال کا تذکرہ ہوا تھا کہ اگر کافروں نے ایمان ہی نہیں لانا خواہ انہیں ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے، تو پھر انہیں تبلیغ کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا کہ ڈرانا یا نہ ڈرانا کفار کے لیے برابر ہے۔ نہ کہ خود مبلغ کے لیے، کیونکہ مبلغ تو ہر حالت میں اجر کا مستحق ہے، خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے۔

دوسرا سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت سے کافر

ان آیات کے مصداق کون ہیں

اگرچہ ایمان نہیں لائے۔ مگر دوسرے بہت سے ایمان لائے۔ ابوسفیانؑ کافر ہی تو تھے۔
وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ ابوجہل جیسے بدترین دشمن کا بیٹا عکرمہؓ ایمان لایا۔
مشہور جبریل خالہ بن ولید بھی بڑی دیر کے بعد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ تو اس کا
جواب یہ ہے۔ کہ یہاں یہ کفار سے مراد وہ کفار ہیں۔ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے
کہ ان کی استعداد خراب ہے۔ ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے۔ ان کے متعلقہ شیعہ، ابولہب، ابو
ابوجہل جیسے کافر مراد ہیں۔ جن کا خاتمہ حالت کفر پر ہوا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جب
قرآن کریم نازل ہوا تو انہیں اسلام کی دعوت پیش کی گئی۔ مگر وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایمان نہ
لائے۔ ماسوائے اکا دکا آدمی کے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ہم پہلی کتابوں
پر ایمان لائے ہیں۔ لہذا ہمیں اس کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے
وہ انتہائی درجے کے متعصب لوگ تھے۔ یہ روش انہوں نے عباد کی وجہ سے اختیار کی۔
چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں کثرت سے یہود کا ذکر آئے گا۔ بلکہ اس سورۃ کا موضوع ہی یہود کی
اصلاح ہے۔ یہود کا ذکر یسیرۃ رسولؐ سے شروع ہو کر اختتام پارہ اول پھر
دوسرے پارے تک چلا گیا ہے۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔
تو پھر انہیں اسلام کی دعوت دینے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ بلکہ انہیں دعوت دینا تو خلاف انصاف
معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ کہ یہود کے ہدیہ
کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے۔ کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں
ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہیں گے۔ اس کی مثال ایسے
ہی ہے۔ جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب کسی مریض کو دیکھ کر بتائے کہ اسے ٹی بی کا مرض لاحق
ہے۔ لہذا اب یہ یقین درجے عبور کر کے چوتھے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔۔۔ مریض کی موت

یقینی ہے۔ ظاہر ہے کہ مریض کی طاقت ڈاکٹر کے کئے سے نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی موت کا سبب تو وہ بیمار ہی ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ یا اس میں مزید دخل اس کی جہ پر بیماری یا بے احتیاطی کو ہوگا جو اس نے اختیار کی۔ اسی طرح کفار کے ایمان نہ لانے کا سبب ان کی اپنی روش ہے انہی کے لئے کافران۔

الغرض! فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ؕ جُنَّ لَوْ كُنُوْا اِنَّا لَنَافِیْۤہُمْ ؕ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا اَبْرَۃَ لَكَ بِہُمْ ؕ اِنْ هُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ؕ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

مہر لگانے کا مطلب

انہیں کفار کے متعلق ارشاد ہوتا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِہُمْ وَعَلٰی سَمْعِہُمْ ؕ یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور اُنہیں ابْصَارِہُمْ عَشَاوۃٌ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ یہاں پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی اُن کے دلوں پر اور کانوں پر ٹھپے لگائے ہیں، اور آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ تو پھر اُن سے کتنا ایمان لازماً ہدایت اختیار کرو۔ کہاں تک درست ہے۔ اس کا حل مفسرین کرام یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ مہر لگانا یا پردہ ڈالنا بطور سزا کے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے عقائد اور سرکشی کی وجہ سے ٹھپے لگائے ہیں۔ کسی کو ماں کے پیٹ میں ہی مہر لگا کر ہدایت کا راستہ بند نہیں کر دیا۔ قرآن و حدیث میں اس بات کی تصریح موجود ہے حدیث شریف میں آتا ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلٰی الْفِطْرَةِ ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ ماحول اور تربیت کے مطابق یہودی، مجوسی یا کھنڈیسی وغیرہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فطرت سلیمہ کو بگاڑ لیتا ہے۔ اور کفر، شرک اور نفاق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْہَا بِکُفْرِہُمْ" اللہ تعالیٰ نے اُن کے کفر اور اس پر اصرار کی وجہ سے ٹھپہ لگا دیا نہ کہ روز اول سے ہی انہیں بلاوجہ مہر بند کر دیا۔ قرآن پاک کی آیت بتاتی ہے۔ "فَوَلَّہِ مَا تَوَلّٰی" آدمی جس

طرف جانا چاہتا ہے۔ خدا اسی طرف کی توفیق دیتا ہے۔ توفیق تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مگر ارادہ تو انسان کا ہوتا ہے۔ اور ارادے کی حد تک انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اُسے کسب کہتے ہیں۔ گویا ارادہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے **وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ** آخر کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک تندرست آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرا شخص بسترِ کامریض ہے۔ اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی تندرست آدمی اپنے ہاتھ سے کوئی نقصان کرے، کوئی برتن توڑے کسی کو تھپڑ مارے تو وہ اس فعل کا ذمہ دار ہوگا۔ اور قابلِ گرفت ہوگا۔ برخلاف اس کے کسی رُخسے والے آدمی سے غیر ارادی طور پر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ تو بیچارہ مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ سے تو ارگہر کسی کی ہلاکت کا سبب بھی بن جائے، تو اس کے ذمے قصاص نہیں ہوگا بلکہ بیت ہوگی۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اسی کو شریعت میں کسب کہا جاتا ہے چنانچہ جو شخص بقائم ہوش و حواس اپنے ارادے سے صحیح طے سے رد گردانی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور آنکھوں پر پردہ چائل کر دیتے ہیں۔ مہر لگانے کا یہی مطلب ہے۔

دلوں کی سیاحی

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے **تُعَرَّضُ الْفِتَنَ عَلَى الْقُلُوبِ كَالْخَصِيرِ هُوَذَا عُوْذَا دُلُوں پر فتنے وارد ہوتے ہیں جس طرح سناکھٹا جوڑ کر چٹائی تیرا ہو جاتی ہے اسی طرح دلوں پر فتنے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ٹھپہ لٹک جاتا ہے۔ یہ فتنے گمراہی کی باتیں ہیں جو ایک ایک کر کے انسان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ان فتنوں کو قبول کر جاتا ہے اس کا دل سیاہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پورے کا پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور انسان اس شیخ**

پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا اور بُرائی کو بُرائی نہیں جانتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے لٹے کو اٹا کر کے رکھ دیا جائے یعنی ہینڈ اوپر اور منہ نیچے کی طرف کر دیا جائے۔ تو اس میں کوئی چیز نہیں سما سکتی۔ اسی طرح انسان کا دل بھی الٹا ہو جاتا ہے۔ نیکی کی کوئی بات اس میں جگہ نہیں پاتی۔ برخلاف اس کے جو شخص دل پر وارد ہونے والے فتنوں کو قبول نہیں کرتا، اس کا دل نیکی کی طرح سفید ہو جاتا ہے۔ اُسے کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور طہیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ پہلی مرتبہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر سیاہ داغ پڑ جاتا ہے اگر بندہ توبہ کرے، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لے تو سیاہ داغ دھل جاتا ہے اور دل پھر سفید ہو جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کرنے کی بجائے دوبارہ گناہ کا مرتکب ہوا تو سیاہ داغ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کے ارتکاب پر دل کی سیاہی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَحَاطَتْ بِہِ خَطِیْئَتُہٗ" اس کے گناہوں نے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس کا دل معصیت، کفر اور شرک میں گھر گیا ہے۔ اسی حالت کے متعلق فرمایا "کَلَّامِلٌ عَلٰی قُلُوْبِہِم مَّا کَلَّامٌ یَّکْبُوْنُ" خبردار! سن لو! ان کے دل پر زنگ چڑھ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا اپنا کیا دھڑ ہے۔ یہی وہ شیج ہے جس کے متعلق فرمایا "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِم" یعنی اللہ تعالیٰ نے بطور سزا ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے۔

اعضائے زیر کے
باتے میں باور
ہوں

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے تین اہم اعضاء یعنی دل، کان اور آنکھوں کا ذکر کیا ہے۔ دل محض گوشت کا ایک ٹکڑا ہی نہیں بلکہ اس کو عقل قلب اور فواد سے بھی تعبیر کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سوچ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور قوت ارادہ کا تعلق قلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی قوت ارادی کو فواد کہا گیا ہے قرآن پاک میں موجود ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِکَ كَانَ عَنْہُ مَسْکُوْرًا" یاد رکھو! کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق ہوال ہو گا۔ یہ اعضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ انسانی جسم میں یہی چیزیں علم کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم نعمتیں انسان کو ودیعت کی ہیں۔ یہ اس کے لیے حصول علم کے ذرائع ہیں۔ جو شخص ان ذرائع کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی مثال حسرت مولانا اشرف علی تھالوی نے یوں دی ہے۔ جیسے کوئی امیر کبیر کسی کی تنخواہ مقرر کر دے۔ کہ بھائی تم غریب ہو ہر ماہ یہ وظیفہ وصول کر لیا کرنا۔ وہ شخص ہر مہینے اپنا مشاہرہ وصول تو کرتا ہے۔ مگر کسی مصرف میں لانے کی بجائے اسے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ یہ پانی میں ڈبو دیتا ہے۔ امیر دیتا رہتا ہے اور غریب ضائع کرتا رہتا ہے۔ آخر کار اس امیر کو کسنا پڑتا ہے۔ کہ یہ شخص کس قدر نیک حرام ہے۔ کہ میں نے اس پر رسم کرتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کیا ہے۔ مگر یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا چنانچہ اس کا وظیفہ بند کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس شخص کو افسوس بلکہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کی آمدنی ختم ہو گئی ہے۔ تو اس قسم کے شخص کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ یہ بیوقوف مسر کا ہی مستحق ہے۔

عذاب عظیم
کی وعید

یہی حالت اس شخص کی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دل عطا کیا۔ کان اور آنکھیں دیں مگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کو بروئے کار نہیں لاتا۔ تو آخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی، اور ایسا شخص نیک حرام قرار پائے گا۔ یہی وہ حالت ہے۔ جس کے متعلق فرمایا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے لہذا ان کے لیے عذاب عظیم مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔

اعضائے بدن کا
مركز ایک ہے

یہاں پر جن تین اعضاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں قلوب جمع ہے۔ سمع واحد اور البصار جمع کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں کہ قلب کی حالت تو ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ لہذا بہت لوگوں کی وجہ سے اسے جمع فرمایا۔ اور ان اگرچہ ہر انسان کے دو ہیں مگر ان دونوں کی حکمت اکٹھی ہوتی ہے۔ ان کا مرکز ایک ہے۔ لہذا اس کے لیے واحد کا صیغہ بولا۔ اور آنکھیں دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں سے اکٹھا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ اور ایک کو بند کر کے کسی ایکے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہذا ان کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلے دو اعضاء یعنی دل اور

کانوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر ٹپہ دگا دیا گیا ہے۔ اور آنکھوں کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ان کو استعمال نہیں کرتے ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ کفر، شرک اور برائی کا پردہ ہے۔ جو آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ صحیح بات نظر ہی نہیں آتی۔ جب کسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ان کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔ جو آگے چل کر انہیں ملے گی۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے گروہ انسانی کا حال بیان فرمایا۔ جنہوں نے ظاہراً اللہ باطناً کفر کو اختیار کیا۔ اور ہدایت سے محروم ہے۔ ان کی سزا کا ذکر بھی اجمالاً کر دیا۔ اہل الفاظ کے ضمن میں وجوہات بھی ذکر کر دیے۔ ان کا حال محسنہ طور پر بیان فرمایا ہے۔ آگے منافقین کا ذکر آئے گا۔ چونکہ یہ زیادہ خطرناک گروہ ہے۔ اس لیے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ قسراً گروہ ہے

الْعَمَّ
درس ششم

البقرة ۲

آیت ۱۲ تا ۱۳

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِينَ ۝۸ يَخْدَعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ
إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝۹ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ
فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰ بِمَا كَانُوا
يَكْذِبُونَ ۝۱۱ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا
إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝۱۲ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ
لَا يَشْعُرُونَ ۝۱۳

ترجمہ: اور بعض لوگوں میں سے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ
پر اور قیامت کے دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ۝۸ وہ دھوکا دیتے ہیں
اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور حقیقت میں وہ نہیں دسکتے مگر اپنی
جانوں کو، اور وہ سوچتے بھی نہیں ۝۹ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس
وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں ۝۱۰ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں
فساد نہ کرو تو کہتے ہیں بیشک ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۝۱۱ سنو!
بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر یہ سمجھتے نہیں ۝۱۲

ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر چکا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے
جو ظاہر اور باطن ہدایت کو قبول کرتے ہیں۔ وہ مومن و متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار
آیتوں میں ان کا حال بیان ہوا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ظاہر اور باطن ہدایت الٰہی کا انکار
کرتا ہے۔ وہ کافروں کا گروہ ہے۔ اگلی دو آیات میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے اب ان
آیات میں تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ ہے جو ظاہر میں تو ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان

کے باطن میں کفر ہوتا ہے۔ اگلی تیرہ آیات میں منافقین کی خرابیاں، ان کی سازشوں اور چال بازیوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مثالوں کے ذریعے سارا معاملہ سمجھایا ہے۔

منافقین کا گروہ قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض سورتیں صرف منافقین کے نام پر ہیں مثلاً سورۃ منافقون، اسی طرح نزول کے اعتبار سے آخری سورۃ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

امام ابو بکر جصاصؓ بہت بڑے مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ امام زبید بن بکرؓ بھی بہت بڑے عالم گزشتے ہیں انہوں نے علوم عربیہ میں کامل نامی عظیم کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ نفاق کا اشتقاق نَافِقًا الْیَرُدُّعَ سَبَّہِ جس کا معنی ہے جنگلی چوہے کا بل مشہور ہے کہ گورہ یا جنگلی چوہے کے چار بل (سوراخ) ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شکاری کو دھوکا دیتا ہے یہ کسی ایک سوراخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شکاری اس کو کھوٹتے ہیں، تو وہ کسی دوسری طرف غائب ہو جاتا ہے۔ منافق کا حال بھی یہی ہے۔ یہ شرک کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے جنگلی چوہے کی طرح یہ بھی خَدَّاعَ یعنی دھوکے باز ہوتا ہے۔ شریعت میں منافق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں لِمَنْ يُظَاهِرُ الْإِيْمَانَ وَيُخْفِي الْكُفْرَ جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کفر کو چھپاتا ہے۔

اب منافق کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا منافق وہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس پر مطمئن ہے۔ دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متنبہ رہتا ہے۔ وہ ظاہراً اور باطناً شک میں ہوتا ہے ایسا منافق حُذِّبُذِّیْنِ بَیْنَ ذَٰلِكَ کا مصدق ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کا اعتقاد فاسد ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے، وہ یہی اعتقاد ہی منافق ہیں۔ جن کے حقیقہ سے میں کفر بھرا ہوا ہے۔

منافقین کی
قسمیں

فضیلت کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں مَرَضٌ کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے۔ کہنے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں۔ نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان مچھائی کا کام کر رہا ہے۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے۔ اور یہ بیماری خونِ صغیر وغیرہ کی ظاہری بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور اتحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا کیونکہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری ہے۔ کہ جب علاج نہیں کیا جاتا تو بیماری بڑھ جاتی ہے دیکھ لیجئے اسلام کو ترقی نصیب ہو رہی ہے۔ مگر منافقوں کی بیماری مددِ بدوز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے باطن میں پوشیدہ حسد اور کینہ، اسلام کی مخالفت اور بدعتیگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کو فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا اب اس بیماری کا نتیجہ یہ ہو گا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ اور یہ سزا انہیں اس جرم کی پاداش میں ملے گی۔ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ زبان سے حق کا اقرار کرتے تھے۔ اہل ایمان کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ مگر دل سے کفر کے ساتھ ہوتے تھے۔ گویا وہ زبان سے جھوٹ بولتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ان کے اس جھوٹ کی وجہ سے انہیں مومنوں کا عذاب کا مزہ چکھنا ہو گا۔ یہ ان کے نفاق یا حسد یا کفر کی سزا ہے۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ منافقین اپنے نفاق کی وجہ سے فساد فی الارض کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس سلسلے میں جب ان سے کہا جاتا ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا

فساد فی الارض

فِي الْأَرْضِ كَرِزِينَ فِي فَنَادٍ بِرَبِّهِمْ قَالُوا إِنَّمَا خُنَّ مُصْلِحُونَ. تو کہتے ہیں کہ ہمیں فساد کی کون کمرہ سکتا ہے۔ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں۔ اعتدال کی حالت کو اصلاح اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں۔ لڑائی بھڑکانا، فتنہ برپا کرنا، کافروں سے دوستی، مسلمانوں سے دھوکا، ان کے رازوں کا افشاء، گنہگاروں کا اظہار، دین کی اہمیت، قوانین شریعت کی خلاف ورزی یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک فساد اور اصلاح محض معاش کی درستگی ہے۔ یہ لوگ نظام حق کو لگاڑتے ہیں۔ عبادت الہی کی بجائے کفر و شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی فساد ہے۔

اہل طبریٰ اور ابن کثیر متعدد مفسرین کرام سے — روایت کرتے ہیں کہ اِصْلَاحُ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ بِالطَّاعَةِ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ اطاعت ہوگی تو ارض و سما کے معاملات درست ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں ہوگی تو زمین پر فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور منافق یہی کچھ کرتے ہیں۔

منافقین کی
دھوکہ دہی

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا يَخُذْ عُنُونُ اللَّهِ یہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ دھوکا تو دیا گیا ہے۔ جہاں کوئی حالات سے ناواقف ہو۔ اللہ تعالیٰ تو عظیم کل ہے اے دھوکا کیسے دیا جاسکتا ہے۔ اس اشکال کے متعلق اہم بیضاویؒ اور دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زبان سے کہتے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کے پیروکار اور فدائی ہیں، مگر قلب کفر سے بھرپور ہے۔ ایمان کی مقدار ایک رائی کے دانے کے برابر ہی نہیں ہے۔ اور ویسے فساد کے طور پر بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو اہل اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ گویا خدا تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ معتمد یہ کہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال موجود ہے إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّهُمْ بَايِعُوا اللَّهَ یعنی اے پیغمبر! جو لوگ آپ کے دست مبارک

پر بیعت کرتے ہیں، وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا "مَنْ يَطُيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ" جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور کی رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

منافقین کا طریقہ واردت بھی وہی ہے۔ جو ایک عام دھوکا باز کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس طریقہ سے ہم اپنے مفاد بھی حاصل کر لیں گے۔ اور ہمیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ اس طرح ہم اس بد عقیدگی پر قائم رہ سکیں گے۔ گویا اسلام کا دعوے بھی کرتے رہیں۔ اور کفر کے پروگرام کو بھی ساتھ ہی جاری رکھتے ہیں۔

حالانکہ یہ دو متضاد پروگرام ہیں اور کسی صورت میں ان کے درمیان ہم آہٹی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسلام کا پروگرام نہایت ترقی یافتہ پروگرام ہے۔ جب کہ کفر انتہائی رجعت پسندانہ نظام ہے۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔

ایک طرف توحید، ایمان، اور تقویٰ کا پروگرام ہے۔ اور دوسری طرف کفر، شرک اور باطنی بیماریوں کا نظام ہے۔ معاصی اور جنگ و جدل کا نظریہ رکھنے والے ہی لوگ فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ اصل فساد ہی ہیں۔ جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں وَلٰكِنْ لَا يَتَعَرَّوْنَ مَعْرَ یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور فساد ثابت ہو گیا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو آج کل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں۔ یہ بھی حق و باطل کو یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے۔ اسلام کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی رائج ہے۔ اور اسلامی قوانین بھی جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں پروگرام اکٹھے نہیں چل سکتے، صرف ایک نظام کو اپنانا ہو گا۔ ورنہ فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ایک

حکومتی سطح
پر نفاق

نظام کا معنی ہی فساد ہے اور دوسرے کا ایمان، تو یہ اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے، کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ بات اشارہ کر دی ہے۔

عذاب عظیم اور
عذاب الیم
میں فرق

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے قبل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا: **وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ** اور منافقوں کے متعلق فرمایا: **وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ** یعنی کافروں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اور منافقوں کے لیے دردناک عذاب۔ اس کے متعلق شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ کافر مردود اور مجرّم اذلی ہے۔ اس کی استعداد تو ابتدا ہی سے خراب ہے۔ کافروں نے اپنی استعداد کو بگاڑ کر بالکل مجرّم کی حالت اختیار کر لی ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب اول سے آخر تک بڑا ہی ہوگا۔

جہاں تک منافقین کا تعلق ہے۔ ان میں استعداد تو موجود تھی، مگر انہوں نے اس استعداد میں بگاڑ پیدا کر کے اپنے اندر خود مجرّمی پیدا کر لی۔ جب سزا کی نوبت آئے گی، تو ان کو اس کا احساس ہوگا اور دکھ پیدا ہوگا۔ کہ افسوس ہمارے اندر استعداد تو موجود تھی مگر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ لہذا ان کو مولم عذاب ہوگا۔ یعنی جس قدر احساس ہوگا۔ اسی قدر تکلیف ہوگی۔

اس کے علاوہ مفسرین کرام ایک اور بات بھی بیان فرماتے ہیں: کہ کافروں نے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔ وہ تو اول و آخر کافر ہی رہے۔ برخلاف اس کے منافقین نے اگرچہ دل سے حق کو قبول نہیں کیا، مگر زبان سے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہے۔ اور جو آدمی کسی چیز کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔ اس کا حکم اور ہوتا ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب الیم مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بھرت پھل پیدا کرنے والے علاقے کے لوگ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں۔ جہاں الے پھل نہیں ہوتے۔ تو انہیں احساس مجرّمی ہوتا ہے۔ اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ بڑا مشورہ تھا کہ ابدالی نے جب پانی پت کا مھر کر رکھا۔ تو دلی کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں۔ تو انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا: **اِس جَانَارِ قَنْدَحَارِ کَبَاسْتِ** یعنی یہاں قندھار کا انار کمال ہے۔

جو میں یہاں قیام کروں۔ وہ قندھاری انار کے ذائقے سے واقف تھا۔ اس لیے وہ وہاں ٹھہر کر اس
ذائقے سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہے۔

منافقین کا حال جیسی ہو گا۔ چونکہ انہوں نے زبان سے ایمان کا ذائقہ چکھا تھا۔ اس
لیے آخرت میں انہیں محرومی کا سخت احساس ہو گا۔ اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دکھ درد
درد میں اضافہ ہو گا، اسی لیے اس کو عذاب الیم کہا گیا ہے۔

الْعَمَّ

درس ہفتم

البقرہ - ۲

آیت ۱۳ تا ۱۶

وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْا اَلَّذِيْنَ كَمَا اٰمَنَ
 السُّفَهَاٰءُ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاٰءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ وَإِذْ
 اَقْبَلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اَمَّا نَا وَ اِذَا خَلَوْنَا بِشَيْطٰنِهِمْ فَنَقُولُوْا
 اِنَّا مَعَكُمْ رَاۤءِ غَنٍّ مِّنْهُنْزُوْنَ ۝۱۴ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
 وَيَمُدُّهُمْ فِى طُغْيٰنٍ يَّعْمَهُوْنَ ۝۱۵ اُوْلٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
 اسْتَرَوْا الضَّلٰلَۃَ بِاَمْدٰى فَمَا رِيْحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا
 كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶

ترجمہ :- اور جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ اس طرح جس طرح دوسرے
 لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں، جس طرح یہ قوت لوگ
 ایمان لائے ہیں۔ سنو! بیشک یہی لوگ یہ قوت ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں ۝۱۳
 اور جب یہ مٹتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان
 لائے ہیں، اور جب یہ تنہا ہوتے ہیں۔ اپنے شیطانوں (سرداروں) کے پاس تو کہتے
 ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ بیشک ہم تو ہنسی کرتے ہیں ۝۱۴ اللہ ان کے ساتھ
 ہنسی کرتا ہے۔ اور مسرت دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں وہ سرگردان ہو رہے ہیں ۝۱۵
 یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خدیجہ گمراہی کو ہدایت کے بدلے پس نہیں فائدہ دیا
 ان کو ان کی تجارت نے۔ اور انہیں تھے یہ لوگ ہدایت پانے والے ۝۱۶

ہدایت کے اعتبار سے قیہ اگر وہ منافقین کا ہے۔ کل بھی ان کا ذکر ہوا تھا۔ اور آج کی آیت
 میں بھی منافقین کا ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی خرابیوں کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا
 ہے۔ پہلی آیات میں آیا تھا کہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے
 ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کی نفی فرمادی ہے۔ کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ

گذشتہ سے پورستہ

اور ایمانداروں دونوں سے دغا بازی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو دعو کا نہیں دے سکتے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بھی ان کے دعو کے سے بچائے گا۔ کیونکہ ان کا دعو کا ان کی اپنی ہی جانوں پر ہے اور یہ ان باتوں کو سوچتے تک نہیں۔ ان کے دلوں میں شک و تردید اور نفاق کی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے۔ اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ کیونکہ یہ جھوٹ بولتے تھے ظاہر اسلام کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر تھا۔ ان کی ایک اور بیماری فساد فی الارض تھی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو۔ تو اکرٹ جاتے اور کہتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہمیں کوئی فساد ہی کیسے کہہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی لوگ فساد میں مگر یہ سمجھتے نہیں۔

حقیقی ایمان

اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور غرابی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اُسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے یہ قائلو! تو جواب میں کہتے ہیں أَتُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ کیا ہم بھی اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں فرمایا أَلَا أَنْفُسُهُمْ السُّفَهَاءُ من لو! بیوقوف خود ہی ہیں وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ مگر یہ جانتے نہیں۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ منافقین تو بڑے ایمان کا انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بظاہر تو وہ ایمان لا چکے تھے۔ تو پھر وہ یوں کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم بیوقوفوں کی طرح کیسے ایمان لائیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ایسی بات بڑے مسلمانوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے خاص معتمد آدمیوں کے دربر کرتے تھے جنہیں اپنا راز داں سمجھتے تھے کہ وہ ایسی بات کا بُرائی نہیں منائیں گے۔

اس مقام پر ایک اور بحث قابل غور ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعوے تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ۔ جیسے دوسرے مسلمان ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ فلاح کا دار و مدار اُسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ۔ شہوات نفسانیہ ریاکاری، طلبِ جاد و غیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں کسی بطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار بہ گز مفسد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دال کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان کو قبول

کرو۔ دوسرے مقام پر آئے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا ۝ اے ایمان والو! ایمان لاؤ
یعنی محض زبانی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

اسی لیے منافقین سے کہا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لاؤ۔ وہ دوسرے لوگ کون
ہیں؟ بلاشبہ وہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاص کے ساتھ
ایمان لائے۔ ابن عساکرؒ جو بہت بڑے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن
عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اس طرح ایمان لاؤ کہ
لَعَنَ الْيَهُودُ الْبُكْرَةَ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ ۝ یعنی جس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ،
حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ایمان لائے ہیں، اس طریقے پر تم بھی ایمان لاؤ۔ ان کا ایمان خلوص اور
حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے معیار پر پورے اردو محض زبانی دعوے سے بات نہیں بنے گی تم تو
جھوٹے ہو وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝ یہ لوگ قطعاً مومن نہیں ہیں۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَبِأَنِّ آمَنُوا
بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوا ۝ اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ایمان لے
آئیں۔ تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے۔ یہاں سے معیار حق ہونے والی بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔
کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ معیارِ حق ہیں۔ یہ اصحاب کبار اگرچہ
نبی کی طرح محسوس تو نہیں ہیں مگر امت کے لیے نمونہ ہیں۔ وہ اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی
وجہ سے ان غریبوں سے محفوظ تھے۔ جو ایمان کے باوجود انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جن
کی وجہ سے آدمی ناکام ہو جاتا ہے معیارِ حق اسی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں
فرمایا ہے لَسْتُ كُنتُمْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُودُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝
شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں تاکہ جو جاوید لوگوں کو بتانے والے
مرد معلم اور اللہ کا رسول تمہیں بتانے والا ہے :

۱۔ تفسیر درمنثور ص ۳۱ بحوالہ ابن عساکر و تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱ ص ۱۰۱
۲۔ قرآن مجید مترجم شاہ عبدالقادر ص ۲۶ مطبوعہ مکتبہ کبیری

گویا اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو فونے کی مجاہدت تیار کر کے اُن سے خدمت اسلام کا کام لیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ بھی فرمایا اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ خدا کی زمین پر تم اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی جس کی اچھائی کی گواہی تم دو گے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوگا اور جس کی تم بُرائی کی گواہی دو گے وہ اللہ کے ہاں بھی بُرا ہوگا۔ اُسے صحابہ اتم اللہ کے گواہ ہو اور خصوصاً اے خلفائے راشدین! تم اللہ کے گواہ ہو۔ آپ نے جملہ تین دفعہ فرمایا۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے متعلق فرمایا اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبُهُ يَعْنِي اللّٰهُ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق رکھ دیا ہے۔ یعنی وہ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے قلب پر اللہ تعالیٰ نے حق رکھ دیا ہے، کیا وہ معیار حق نہ ہوگا؟

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح حضرت البرجہؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان حقیقی ایمان ہے جو غلو سے بھرپور ہے۔ ایسا ہی ایمان انسان کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

النَّاسُ يَعْنِي النَّاسَ اُنْسُ كَمَا مَنَعْتَهُ لِيْلَ النَّاسِ هِيَ الْفَتْةُ اور مانوس ہونے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں اُسے مَا سَمِعْتَ الْاِنْكَانُ الْاِنْكَانُ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اُٹا ہوتا ہے مَا الْقَلْبُ رَا اَنَّهُ يَنْقَلِبُ ایک تریہ اپنی وضع کے اعتبار سے اُٹا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا پینڈا اوپر اور سر نیچے ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ دل میں ہٹیاں آتی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے خبر دلیا وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ يُخَوِّلُ بَيْنَ الْمَعْدِ وَقَلْبِهِ اللّٰهُ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ اس لیے محتاط رہنا چاہیے۔ ڈر اسی غلطی پر خدا تعالیٰ دل بدل سکتا ہے۔ اسی لیے دعائیں بھی ایسی کہتے يٰ مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ اے دلوں کو پھٹنے والے اللہ کریم! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔ بہ حال انسان

انسان اور
اس کا دل

کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر انس کا مادہ و دیت کیا گیا ہے۔

حقیقی انسان
کون ہیں؟

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی یہاں پر ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر منافقوں کو کہا جا رہا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسلانے کے وہی لوگ مستحق ہیں جو حقیقی ایمان سے معمور ہیں۔ یہی لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں، اور انہی کی وجہ سے دنیا کا نظہ درست رہتا ہے۔ جو لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُولَٰئِكَ كَالْاَنْفٰكِهِمْ بَدَلُ هُمْ اَصْلُهُ یہ تو جانوروں کی مانند ہیں یا ان سے بھی بدتر۔ یہ انسان کسلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور جھٹی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ لہذا حقیقی انسان وہ ہیں جو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔

بیوقوف کون ہیں؟

پہلے گزر چکا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اسلحہ ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں حالانکہ حقیقت میں منافق ہی بیوقوف ہیں۔ مگر انہیں علم نہیں۔ یہ لوگ ایمانداروں کو اس لیے بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا کے نفع سوئے کو چھوڑ کر آخرت کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کی ٹمک و دد میں لگے رہتے ہیں۔ مگر وہ بیوقوف یہ بات نہیں سمجھتے کہ عقل مند ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نقصان سے بچ جائے اور فائدہ حاصل کرے ایماندار دنیا کے اس عارضی فائدے کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کے ابدی فائدے کو حاصل کرتے ہیں۔ لہذا عجمی معنوں میں عقل مند سی میں اور منافق بیوقوف ہیں۔ جو آخرت کو چھوڑ کر عینی حقیقی اور ابدی فائدہ کو بھائی دنیا کا عارضی اور فانی فائدہ تلاش کرتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بیوقوف جانتے ہیں۔ اور اس طرح اس فریب سے دنیا کا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفٰهَۃُ حقیقت میں یہی بیوقوف ہیں وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر حقیقت حال کو نہیں جانتے۔

منافقوں کی
دو جہی پالیسی

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

جب یہ ایمانداروں سے ملے ہیں تو شام کرتے ہیں قَالُوا آمَنَّا بِكَ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں تاکہ دشمنان میں اپنی پارٹی کے آدمی سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے وَلَاذْخُلُوا إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ جب یہ شیطانوں کے پاس جاتے ہیں۔ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ثُمَّ اخْلُصْ لَهُمْ هَٰؤُلَاءِ تو ہم تمہارے لئے ہیں۔ تو یا جو ان کی حمایت کا دعویٰ کر کے نہیں بے وقوف بنا ہے ہیں۔ یہاں پر شیاطین سے مراد منافقوں کے بڑے بڑے سردار اور سرغنہ ہیں جو نفاق کے پروگرام کے بانی تھے۔

بعض بول اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغی نقطہ نظر سے ان لوگوں کو بے وقوف یا شیطان کا لقب دینا کسی قدر زیادتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ القاب اس وقت دیے گئے ہیں۔ جب تبلیغ کے تمام تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی کرتوتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تبلیغ کے ابتدائی دور میں اس قسم کے القاب دینا درست نہیں مگر اتمام محبت کے بعد ایسا کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ منافقین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمسخر اڑا ہے میں تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللَّهُ يُسْتَهْزِئُ بِهِمُ اللَّهُ تَعَالَىٰ ان کے ساتھ ہنسی کرتا ہے وَيُمِذُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ اور مہلت دیتا ہے، ان کی سرکشی میں کھینچ دیتا ہے وہ اندھے اور سرگردان ہو رہے ہیں۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی کرنا، اس کا تمسخر اڑانا تو فعل عبث اور ناجائز ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام عیوب کے برابر ہے۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ استہزاء نہیں بلکہ مشاکلت ہے۔ یعنی جو سلوک منافقین نے مسلمانوں کے ساتھ کیا، ویسا ہی سلوک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا۔ اس قسم کی مثالیں درجہ معامات پر بھی ملتی ہیں مثلاً حَبْزٌ وَاسِيَّةٌ سَيِّئَةٌ برائی کی جزا برائی ہے ملا کر جزا تو عدل کا نام ہے۔ اور عدل برائی نہیں ہوتی۔ تو یہاں پر بھی مراد یہی ہے کہ جیسا سوال ہے اس کا ہم شکل جواب ہے۔ یہی بات ہے وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا میں

استہزاء من اللہ
کا معنوم

بھی بنی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی لطافت، بدعت اور فصاحت ہے۔ اور اے مشاکلت کتے ہیں
 اس طرز بھار کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے استنزار کا نقصان نبی کی طرف لوٹتا
 ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے تمسخر کا ضربہ خود نبی کی طرف جاتا ہے۔ وہ نہ کہہ کر
 ضربہ پہنچائیں گے۔ نبی علیہ السلام اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ
 مؤمنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا، تاکہ وہ ان سے ضرر نہ پہنچیں۔ **لَا یُکْثِرُ**
بِهِمْ کا یہی مطلب ہے۔ استنزار، بجانب اللہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
 منافقین کے ساتھ دیا ہی معاملہ کرتا ہے۔ بیٹھا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے چونکہ
 منافقین محض زبانی دعوے کی بنا پر جماعت المسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مغلوط حاصل کرتے ہیں
 اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ **اَتَعْبُدُونِ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا** وہ نمازیں پڑھیں، عہدہ دیں، جہاد
 میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی عمل فیسوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں
 لہذا ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ بھی گویا ان کے
 ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن منافقین
 دروغ کے گڑھے میں پہنچ جائیں گے۔ تو جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ گویا انہیں جنت میں جانے
 کی اجازت مل گئی ہے۔ جنتی ان منافقوں کی طرف دیکھیں گے، تو وہ محسوس کریں گے کہ واقعی ہمیں
 جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ وہ دروازہ جنت کے دروازے پر پہنچیں گے
 مگر اتنے میں دروازہ بند ہو جائے گا۔ اور منافق نامہ دروازہ جائیں گے۔ **اللَّهُ یُکْثِرُ**
 کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ یہ لوگ اس دنیا میں اس قسم کی چالاکی کر رہے ہیں، تو کل قیامت
 کے دن ان کے ساتھ بھی تمسخر ہوگا۔

گائے کا واقعہ اس سورہ میں آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارا آدمی
 قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہیں چلتا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ گائے ذبح کریں، تو اس

موقع پر ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا آپ ہم سے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تم سے ٹھٹھا کر کے جاجروں میں شمار ہو جاؤں۔ خدا کے بندو! میں تو اللہ کا حکم تم کو سنا رہا ہوں کہ گائے ذبح کرو۔ اس کے گوشت کا ٹکڑا مرے پر مارو۔ تو قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ میں تم سے ٹھٹھا نہیں کر رہا ہوں۔

الغرض! فرمایا، اللہ تعالیٰ اُن کی سرکشی میں ان کو مہلت دیتا ہے۔ اور وہ اندھے ہوئے ہیں یہاں پر یَقْمَهُوْنَ سے مراد دل کا اندھا بننا ہے۔ جیسا کہ سورۃ حج میں ہے کہ دیکھو ظاہری آنکھیں اکثر اندھی نہیں ہوتیں تَقْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ وہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ جو سینوں میں موجود ہیں۔ زور و سمج بات کو دیکھتے ہیں نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ آگے اُن کی مثالیں بھی آ رہی ہیں۔

فَرِیَ اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ اَشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی مِیْسِیْ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں۔ ظاہر میں انہوں نے زبان سے یہی کہا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بدعتیگی اور گمراہی کو اختیار کیا فَعَصٰی بَحْتٌ رَّجَبًا رَّهْمٌ پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا وَهَآ کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ اور نہیں تھے وہ ہدایت یافتہ۔

ہدایت کے
بدلے گمراہی

یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے۔ کہ یہ تمہاری پونجی ہے۔ اس کے ساتھ اعمال خیرہ و۔ اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی عرف کی مانند ہے۔ اوپر سے بھادوں کی پیش پڑ۔ ہی ہے۔ اور یہ عرف چلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے چھلنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لو گے۔ تو یہ عمر

کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے بدلے کفر، شرک، بدعتیہ کی، معاصی اور لہو و لعب خرید، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خلتے میں مبتلا ہو جاؤ گے، اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بدلے زہرِ مہل خریدے۔ اگر تریاق حاصل کر لیا تو ہر قسم کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اشوائستہ اس نے زہر کو پسند کیا۔ تو تباہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ اور یہ لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ ابدی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بعض خرابیاں بیان فرمائی ہیں۔ اگلی آیات میں مثال کے ذریعے ان کی مزید خرابیاں اور ان کا انجام بیان فرمایا۔

الْمَ
دس ہشتم

البقرة ۲
(آیت ۱۸۱)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا
يُبْصِرُونَ ۝ صُمُّ أَبْكُمْ عُمًى فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝

ترجمہ: ان منافقوں کی مثال اُس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی۔ جب
آگ نے اس کے — آس پاس کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی
زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے ۝ وہ ہرے،
گونگے اور اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے ۝

بدبختی اور شقاوت کے لحاظ سے در سر اگر وہ منافقین کا ہے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال
بیان فرمایا ہے۔ کہ ان کا کام جھوٹ بونا، فریب دینا، زمین میں فساد کرنا ہے وہ ایمانداروں کو
بیوقوف کتے تھے۔ اور اپنے آپ کو اصلاح کرنے والے سمجھتے تھے۔ جب انہیں حقیقی مومنوں
کی طرح ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو کہتے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح کیوں ایمان لائیں۔
مسلمانوں کی جماعت کے دبدبہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے۔ تاکہ ان کی جان و مال محفوظ رہے۔ اور
ان کے حقوق کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر جب اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو کہتے کہ ہم تمہارے
ساتھ ہیں۔ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں حقیقت میں ہم ان کے ساتھ نہیں
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک نشانی یہ بھی بتائی۔ کہ انہوں نے ہدایت کے بارے میں
گمراہی کو خریدا۔ اور اس تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ بلکہ ایسے لوگ ابدی نقصان میں
بتلا رہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں جن سے منافقوں کے حالات
پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ کسی مسئلہ میں مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاملہ واضح اور قریب الغم
ہو جائے۔ جو چیز غامض اور تاریک ہو اسے واضح کر دیا جائے۔ ایسی مثالیں تمام آسمانی کتب میں بیان

کتب آسمانی
اور مثلاً

کی گئی ہیں۔ تواتر، زبور اور انجیل میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفہ اور دیگر قلم آسمانی صحیفوں میں مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ خود قرآن پاک میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ جن سے بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا اپنا بیان ہے وَ تِلْكَ اِذْ مَثَّلْنَا لِنُصْرِيْهِمْ اِلِلًا مِّنْ اِلٰهِيْنَ ۚ وَ مَا يَعْظُمُهَا اِلَّا الْعَالَمُوْنَ ۚ یعنی ہماری ان مثالوں سے اہل علم ہی سمجھ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مقصد کو پالیتے ہیں۔

شیخ ابو جراح ابن العربی مابکی نے تفسیر احکام القرآن مکمل کی ہے۔ آپ کی تفسیر میں تین چار کتابیں ہیں۔ حدیث کی شروح، فتویٰ، نحو اور دوسرے علوم و فنون میں بھی بے شمار کتابیں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ صرف سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار مثالیں بیان کی ہیں۔ گو قرآن کریم دیگر آسمانی کتب اور قلم حکماء کے کلام میں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت لقمانؑ ان کی طرف منسوب کتب، نیز ہر زبان کے فصیح و بلیغ لوگوں کے کلام میں مثالیں پائی جاتی ہیں۔

تفسیر
احکام القرآن

احکام القرآن کے نام سے بہت سے مفسرین نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں قرآن پاک کی صرف انہیں آیات کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔ جن میں حلال و حرام کے احکام بیان ہوئے ان میں سے ایک کتاب ابو جراح جصاص رازیؒ کی احکام القرآن ہے۔ دوسرے مفسر ابو جراح ابن العربی اندلسیؒ ہیں۔ آپ کی احکام القرآن مابکی مسک کے مطابق ہے۔ اسی طرح کشف و تصوف کے بہت بڑے اہم شیخ ابن عربیؒ کی تفسیر احکام القرآن ہے۔ اس میں زیادہ تر تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ایک چھوٹی سی تفسیر لکھی ہے جس کا نام اکلیل فی استنباط التنزیل ہے۔ اس میں قرآن کریم کی اُن آیات کی مختصر تفسیر ہے۔ جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ آپ نوریؒ اور دسویں صدی کے حافظ الحدیث ہوئے ہیں۔ مگر بھی کوئی زیادہ نہیں پائی۔ اٹھ سال کی عمر میں فائز پائی مگر پانچ سو برس کے مصنف میں آپ کے بعد کوئی حافظ الحدیث نہیں ہوا۔ حافظ الحدیث وہ بلند پایہ ہوتی ہے۔ جسے ایک لاکھ حدیث جمع سند زبانی یاد ہو۔

آپ کے بعد بڑے بڑے محدثین ہوئے ہیں۔ مگر حافظ الحدیث کوئی نہیں ہوا۔ البتہ

آپ سے پہلے ہزاروں کی تعداد میں حافظ الحدیث نہ تھے۔ جن میں بخاری شریف کے شارح ابن حجر شافعی اور علامہ مینی ترمذی وغیرہ ہیں۔ اسی طرح صحیح ستہ کے تمام مؤلفین حافظ حدیث تھے۔ انکو کم از کم ایک لاکھ حدیث مع سند اور رجال کے زبانی ادا تھی۔

مشائک حکمت

الغرض مثال بیان کرنیکی حاجت یہ ہوتی ہے کہ کسی باریک چیز کو انسانوں کے ذہن کے قریب تر کر دیا جائے۔ اور عقلی چیز کو محسوس بنا دیا جائے۔ مثال کے ذریعے کہیں کسی چہرے نغمات دلانا مقصود ہوتا ہے، تو کہیں کسی چیز کو ثابت کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہودیوں کی برائی اور قباحت اس طرح بیان فرمائی ہے مَثَلُ الَّذِينَ حَمَلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۚ هَٰمِينَ تَوْرَةً
نے توراة کو بگاڑ دیا۔ انہوں نے اُسے اس طرح نہ اٹھایا جس طرح اٹھانے کا حق تھا۔ تو ان کی مثال گمھے کی سی ہے، جس پر کتابوں کا دفتر لا دیا گیا ہو۔ جو ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ گدھے کو علم ہی نہیں کہ اس کی پشت پر کتابوں کا بوجھ ہے یا سکرٹیوں کا ٹکٹا۔ تو ایسی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بیان فرمائی۔ کہ توراة کے حاملین ہونے کے باوجود اس سے مستفید نہیں ہو سکے۔

منافعین کی
مشال

منافقین کی دو مثالوں میں پہلی مثال آج کے درس میں بیان ہوئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ مثال اُن منافقوں کے بارے میں ہے جن کے دل میں کفر پختہ ہو چکا ہے۔ اور دوسری مثال جو آگے آرہی ہے، اُن منافقوں کے متعلق ہے جو ابھی متردد ہیں اور شک میں مبتلا ہیں۔
الغرض! اس پہلی مثال کے مصداق پختہ کفر والے منافقین ہیں۔ جن کے ہدایت پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اور جن کے متعلق پہلی آیات میں گزر چکا ہے کہ انہوں نے اپنی کوتاہ نظران اور غلط فہمی کی بنا پر ہدایت کے بارے میں گمراہی کو خرید لیا۔

فرمایا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ اِنْ مَنَافِقُوں كِى مَثَالِ اِسْرِ
شخص كِى طَرَحِ هَے۔ جس نے جَبَلِ كِى سِخْتِ اِذِ صِرَے كِى حَالَتِ مِىں اَكَّ جَلَانِى۔ اَكَّ اُس سے دُشْمَنِ
اور حَرْمِى مَاحِلِ كَر لے۔ يہ دونوں چيزِىں ضَرُورِ يَاتِ زَندَگِى مِىں سے ہيں جن كے بغير گزارا نِہيں ۔

چنانچہ ان منافقوں نے بھی اپنی فطری استعداد کے مطابق اپنے اندر ایمان کی شمع روشن کی۔ اور پیغمبر علیہ السلام کی صحبت اختیار کی ان لوگوں نے اہل ایمان کی رفاقت بھی حاصل کی۔ اور زبان سے اقرار کیا: اَمَّنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ جیسے تو یہ تھا۔ کہ ایمان کی اس روشنی سے اُن پر تمام حقائق روشن ہو جاتے۔ مگر انہوں نے تو صحیح معنوں میں ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ محض وقتی مفاد حاصل کرنے کی خاطر ایمان کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر وہ دل سے نورِ ایمان کی آگ کو روشن کرتے۔ تو ان میں الطاعتِ الہی کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اور ان کے دل میں ذکرِ الہی کا شوق پیدا ہوتا۔ اُن کے دل بھی توحیدِ خالص سے منور ہو جاتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو وقتی طور پر ایمان کا اعلان کر کے اپنے مال و جان کی حفاظت چاہتے تھے۔ کیونکہ اسلام کا قانون یہ ہے: مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَدْ عَصَمَ مَالَهُ وَنَفْسَهُ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار کر لیا اس کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو گئی۔ اسی سے یہ منافقین اپنی فطری صلاحیت کو برتنے کا واسطہ بنائے۔ ان کا یہ ایمان لانا گویا جھگل کے اندھیرے میں آگ جلانے کے مترادف تھا۔

فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَبَّ اُسْ آگ نے آگ جلانے والے شخص کے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ اُسے محسوس ہو گیا کہ وہ پشیمانی کا پتہ چل گیا۔ تو پھر کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس آگ کو بجھا دیا۔ یہاں پر اَطْفَأَهَا اللّٰهُ محذوف ہے۔ اس طرح کہ موت طاری ہو گئی۔ جب وہ آگ بجھ گئی جس کی روشنی میں یہ لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کر رہے تھے۔ تو پھر ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ اللّٰهُ تعالیٰ ان کی روشنی کو لے گیا۔ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ اور انہیں بے پناہ اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ پھر اُن کی حالت یہ ہو گئی کہ لَا يُبْصِرُونَ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ روشنی تو عارضی تھی جب وہ منقطع ہو گئی۔ تو وہ اپنی اختیار کردہ بازیوں کے اٹھانے اندھیروں میں گم ہو گئے۔

اس مقام پر جن اندھیوں کا ذکر ہے۔ اور جن میں منافقین سرگردان ہیں اُن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور وہ ساری کی ساری منافقین کی جماعت پر صادق آتی ہیں۔

اندھیروں کی
مختلف قسمیں

سب سے پہلا اندھیرا کفر کا ہے۔ یہ لوگ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر کا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے: **اللَّهُ قَوْلُ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ** یعنی اللہ تعالیٰ ایمانداروں کا دل اور کار ساز ہے وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے جس کی وجہ سے دل میں روشنی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ روشنی آگے چل کر حقیقی روشنی میں تبدیل ہو جائے گی۔

فرمایا دوسرا اندھیرا جو منافقین میں پایا جاتا ہے۔ وہ مکر و فریب کا اندھیرا ہے۔ **يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا** یہ وہی دھوکے اور فریب کا اندھیرا ہے۔ جو وہ اہل ایمان کے ساتھ راہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح تیسرا اندھیرا درد و غم کوئی اقرار کا ہے۔ جیسا فرمایا **يَسْأَلُكَ ابْنُكَ بِوَدِّهِ** کہتے ہیں ہم مومن ہیں۔ حالانکہ یہ صریح مجھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں۔ ان کے دل میں کفر چاہتا ہے۔ لہذا یہ ایمان کے دعوے میں مجھوٹے ہیں۔

منافقین کا چوتھا اندھیرا طعن و تشنیع کا اندھیرا ہے۔ یہ لوگ اہل ایمان کو احمق اور بیوقوف کہتے تھے۔ حالانکہ ایمان والے آخرت کے طلبگار ہیں۔ انہوں نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو اختیار کیا ہے مگر منافق ان کو بیوقوفی کا طعن دیتے ہیں۔ یہ ان کا چوتھا اندھیرا ہے۔

جہالت دو قسم کی ہے۔ جہل بسیط اور جہل مرکب۔ کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہو یہ جہل بسیط ہے۔ جب بھی ایسا شخص متعلقہ چیز سے واقفیت حاصل کرے گا۔ وہ اس جہل سے نکل جائے گا۔ دوسری قسم کا جہل جہل مرکب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلط بات کو صحیح سمجھنے لگے۔ بڑے عقیدے کو اچھا خیال کرے۔ یہ بہت خطرناک جہت ہے کیونکہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ایسا شخص نہ غلط کو غلط سمجھے گا اور نہ وہ اس جہالت سے نکلے گا۔

منافقین کا پانچواں اندھیرا جہل مرکب کا ہے۔ وہ اپنے دھوکے اور فریب کو بڑا اچھا سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ پانچویں قسم کے اس اندھیرے میں مبتلا ہیں۔ پچھرا اندھیرا معاصی اور شہوات کا اندھیرا ہے۔ اطاعت و روشنی ہے اور معاصی اندھیرا ہے جن خواہشات کی تکمیل میں یہ لوگ سرگردان ہیں۔ وہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ ساتواں اندھیرا قبر کا اندھیرا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰی اَهْلِهَا یہ قبریں اپنے مکینوں کے لیے اندھیروں سے بھری پڑی ہیں۔ ہاں جو شخص اپنے دل میں نور ایمان رکھتا ہوگا۔ اس کو وہاں بھی روشنی میسر ہوگی۔ جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی اس کی قبر میں روشنی ہوگی۔ ایمان والوں کے دل سے روشنی کی لٹ نکلے گی، نیز ان کے اعمال صالحہ کی روشنی انہیں حاصل ہوگی۔

بخاری شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلظُّلُمُ ظُلُمَاتٌ يُّوَفُّوْنَ الْقِيَمَةَ اس دنیا میں کسی پر کیا ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہ قبر میں جا کر پتہ چلے گا۔ کہ ظلم کا اندھیرا کس قدر شدید ہے۔ پل صراط سے گزرتے وقت حشر کے میدان میں اندھیر دوزخ کی گہرائیوں میں اندھیروں کا احساس ہوگا۔ الغرض! یہ تمام اندھیرے ہیں جو منافقین پر وارد ہوں گے۔ اور یہ لوگ غضب الہی کا شکار ہوں گے۔

ان لوگوں کی بد نصیبی کی حالت یہ ہے کہ صُلَمَ یہ برے ہیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اس قدر خراب کر لیا ہے۔ کہ صحیح بات کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ اس بد بختی کی بنا بر بُلُكُم یعنی گونگے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی سچی بات نہیں نکلتی۔ دھوکے فریب اور جھوٹ کے سوا ان کی زبان پر کچھ نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ یہ لوگ حُسن و قبح میں، اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ عُصَمٰی یعنی اندھے بھی ہیں۔ ان کی قلبی آنکھیں تو موجود ہیں۔ مگر ان کے دل اندھے ہیں۔ جو حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے۔ ایمان و شرک، سنت اور بدعت ان کے نزدیک برابر ہیں۔ ان کے نزدیک ان میں کوئی امتیاز نہیں۔ فرمایا یہ لوگ کفر و شرک اور معاصی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں۔ فَهُمْ لَا يَرِجِعُونَ کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس ہٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلے منافقوں کا یہ حال بیان فرمایا۔

لَا يَرْجِعُونَ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مر گیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ
 واپس آکر کوئی نئی کمانی کر لے گا۔ انسان جو اعمال دنیوی زندگی میں کھا گیا۔ ان میں تغیر تبدیل نہیں ہو سکے
 گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں مسموم بھی کر دی جاتی ہیں مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیسے گئے اعمال میں
 کوئی رد و بدل نہیں ہو سکے گا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَبْعًا فِي
عُقُوبَتِهِ ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے اور پھر مرنے کے بعد وَنُخْرِجُ
لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا قیامت کے دن ہم نکال کر سامنے کر دیں گے۔ کہ یہ تیرا اعمال
 نامہ ہے۔ لو خود پڑھ لو۔ لطف یہ ہے کہ پڑھنے کی صلاحیت بھی اُس وقت دیا ہو جائے گی
 اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لَوْ خَرَدُ لَوِ الْغُرُضُ فَهَمْ لَا يَرْجِعُونَ کا مطلب یہی ہے کہ یہ
 پلٹ کر نہ ہدایت کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی دنیا کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی کمانی
 کر سکیں گے۔ یہ اُن منافقوں کا حال ہے جن کے دل کنفہ میں راسخ ہو چکے ہیں۔

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْافِيئُهُ إِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥١﴾

۲
ع

ترجمہ: یا ان کی مثال آسمان کی طرف سے اترنے والی اس بارش کی ہے جس میں آرجیاں گرجن اور بجلی کی چمک ہے۔ یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ بادل کی کڑک سے موت کے ڈر سے۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۵۰﴾ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اپک لے۔ جب وہ ان کے لیے روشنی کٹے ہے۔ تو اس میں چلتے ہیں۔ اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۵۱﴾

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی برائی میں دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال گذشتہ درس میں گزرتی ہے کہ منافقوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے جنگل میں آگ جلائی ہو۔ اور جب اُس نے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو لے گیا۔ اور آگ کو بجھا دیا۔ منافقین کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں پس وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

گذشتہ پورے

یہ پہلی قسم کے وہ منافق ہیں جو اپنے نفاق میں کھنڈے ہیں اور جبل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ وہ غلط بات کو صحیح سمجھ رہے ہیں۔ ایسے لوگ محض جال بازی اور فریب کاری کی بنا پر کلمہ اسلام پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ

اور قیامت پر ایمان لے آئے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر ایمان کا شائبہ تک نہیں۔

منافقوں کی
دوسری مثال

دوسری مثال اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کی بیان کی ہے، جن کا کفر اسخ نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ متردد ہیں۔ ان کا رجحان کبھی اسلام کی طرف ہوتا ہے۔ اور کبھی باطل عقیدے کی طرف تو ایسے لوگوں کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے ساتھ دی ہے۔ جس طرح بارش کے نتیجے میں بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح ظہورِ اسلام کے ساتھ منافقین کے لیے بھی کئی ایک چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ ترسیاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اور ان متردد قسم کے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی طرف سے بالکل ایسی نہیں ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی وقت ان کے ذہن میں صحیح چیز آجائے۔ اور یہ نفاق سے باز آجائیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اعتقادِ منافق کفر ہی کی ایک قبیل سے ہے۔ بلکہ کفار میں سے بھی بدترین قسم کا کافر ہے۔

اعتقادی اور
عملی منافق

منافق کی ایک اور قسم عملی منافق ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں۔ کہ دل میں نورِ ایمان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، پیغمبرِ علیہ السلام کی رسالت اور قیامت پر ایمان ہے۔ مگر ظہورِ باطن میں مطابقت نہیں پائی جاتی حضور علیہ السلام نے عملی منافق کی بہت سی نشانیاں بتائی ہیں مثلاً اِذَا اَوْقَمْنَ حَانَ جِبِ اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ جب کسی سے جھگڑا کرتا ہے۔ تو گالی گھوج پر اُتر آتا ہے۔ اور اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ جب وعدہ کرتا ہے۔ تو خلاف درزی کرتا ہے ایسا شخص اعتقادی نہیں بلکہ عملی منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض نماز، روزہ وغیرہ کو فرض سمجھتے ہوئے انہیں بجا نہیں لاتا۔ ایسے عملی منافقوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلْقُلُوبُ اَرْبَعَةٌ یعنی دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے متعلق فرمایا قَلْبٌ اَجْرَدٌ ایسا دل جو صاف و شفاف ہو۔ فرمایا اس کی مثال روشن چراغ جیسی ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہ ہو۔

دل کی
چار قسمیں

دوسرا دل اعلیٰ ہے۔ جو خلاف میں بند کر دیا گیا ہو اور پھر اوپر سے دھاگے کے ساتھ
باندھ دیا گیا ہو۔ فرمایا تیسری قسم کا دل معکوس ہے یعنی اوندھا ہے۔ اس کا سر نیچے اور پیٹ اوپر
ہے۔ اور چوتھی قسم کا دل مصغی ہے۔ یعنی دو پہلو والا دل۔

پہلی قسم کے دل کے متعلق فرمایا کہ صاف و شفاف دل مومن کا دل ہے۔ جس میں فحشاں
بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں کوئی خرابی یا کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ خلاف میں بند دل کے
متعلق فرمایا۔ یہ کافر کا دل ہے امام شاد ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی
پرندے کو ایسے بجرے میں بند کر دیا گیا ہو جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ ایسا دل کافر، مشرک یا دہریے
کا ہوتا ہے۔ جس میں سے باہر دیکھنے کے لیے سونے کے برابر بھی سوراخ نہ ہو کہ وہ اپنے خول سے
باہر حق کی بات کو دیکھ سکے۔ فرمایا اوندھا دل منافق کا دل ہے۔ جس نے ایمان کو پہچان تو لیا ہے
مگر قبول نہیں کیا۔ محض اپنے بچاؤ کی خاطر کوئی فریب کاری کی ہے۔ مگر ہے پکا منافق۔ دو پہلو دار
دل، تو وہ ایسا ہے جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی۔ یہ عملی منافق ہے۔ جسے کسی حد تک یقین
بھی ہوتا ہے۔ اور کبھی متردد بھی ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا ایمان کی مثال گمشدہ البقلۃ یعدھا نمکاً و
الطیب اُس پوڑے کی ہے جسے پاکیزہ پانی سیراب کرتا ہو۔ پوڑے کا بیج اچھا ہو، اُس کی
آبیاری بھی صاف پانی سے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کی نشوونما بھی اچھی ہوگی۔ نیز فرمایا کہ منافق کی
مثال انسانی جسم میں پیدا ہونے والے پھوڑے کی ہے۔ ایک طرف سے پیپ آتی ہے۔
تو دوسری طرف سے خون کا دورہ ہوتا ہے۔ گویا پھوڑے کی غذا خون اور پیپ ہوتی ہے۔ ان
میں سے جس چیز کا غلبہ ہوگا، تو مریض ہلاک ہو جائے گا۔ اور اگر خون غالب آگیا۔ تو صحت یابی
ہو جائے گی۔ منافق میں دونوں قسم کے مائے پائے جاتے ہیں۔

دل کے حالات بہت مختلف ہوتے۔ یہ کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ
بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قلب پر چھ قسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں۔

یعنی حیات اور موت۔ صحت اور بیماری، بیداری اور غیہ، فرماتے ہیں کہ قلب کی حیات ہدایت کی مرہون منت ہے۔ اگر ہدایت نصیب ہوگئی ہے تو سمجھ لیں کہ دل زندہ ہے۔ اور قلب کی موت گمراہی سے واقع ہوتی ہے۔ فرمایا مَوْتُهُ الْخَلَلَةُ دِل کی موت کا سبب گمراہی ہے۔ کسی قسم کی گمراہی دل میں پیدا ہو جائے۔ سمجھ لیں کہ دل مردہ ہو گیا، اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔

قلب کی صحت طہارت اور صفائی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور طہارت کا حصول ایمان اور توحید کی بدولت ہے۔ کہ ایمان کے بغیر طہارت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف قلب میں بیماری، کہ مدت گزرتے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے: **لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۸﴾ إِلَّا مَنَ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ** اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے قیامت کے تذکرہ میں فرمایا: اُس دن نہ مال کسی کام آئے گا۔ اور نہ اولاد مفید ہوگی، ہاں! جو قلب سلیم لے کر پہنچ گیا، اُس کو فائدہ ہوگا۔ اور قلب سلیم وہی ہے جس میں طہارت، پاکیزگی اور نور ایمان ہوگا۔

فرمایا دل کی بیداری ذکر الہی میں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اس کا دل بیدار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُهُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْحَيَّاتِ** اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہے تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر غفلت کی غینہ طاری ہے قرآن میں جگہ جگہ آپ پڑھتے ہیں کہ اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو **وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ** اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

فرمایا منافق کی مثال ایسی ہے **أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ** جیسے آسمان سے بارش آتی ہے۔ صیب کا معنی زور سے برسنے والی بارش ہے اور عربی زبان میں سماء آسمان کو بھی کہتے ہیں، فضاء کو بھی اور یہ لفظ بادل پر بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے چھت

بارش کی مثال

کو بھی سارے کہتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر سارے مراد بادل ہیں۔ کیونکہ بارش بادلوں میں سے برستی ہے ہو سکتی ہے اس کا تعلق آسمان سے بھی ہو۔ جس کو عام انسان اور سائنس دان نہیں سمجھ سکتے تاہم بظاہر بارش کا تعلق بادلوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے یہاں پر آسمان کا لفظ فرمایا۔

فرمایا فِیْہِ ظُلُمَاتٌ اَسْمٰی اذھیرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بارش کے دوران بادل چھا ہوتے ہیں اور سورج غائب ہوتا ہے، اور کسی قدر اذھیرا ہوتا ہے۔ اور اگر ایسے وقت ہو تو تاریکی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ سارے تک نظر نہیں آتے۔ جب قرآن پاک نازل ہوا۔ تو اس وقت ہر طرف کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اذھیروں کے علاوہ فرمایا وَ دَعَا اِسْمٰی گرج بھی ہوئی ہے۔ فرشتے بادلوں کو ہلک کر لاتے ہیں۔ تو ان کے ماننے گرج پیدا ہوتی ہے۔ اُسے رعد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے معنی میں کفر و شرک پر وعید کو بھی رعد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرمایا وَ بَرَقَ بَارِشٌ میں اکثر اوقات بجلی بھی چمکتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ بادل آپس میں دگڑ کھلتے ہیں۔ تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس کا حسی یہ بھی ہے کہ قرآن پاک میں بڑے واضح دلائل موجود ہیں جن سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دلائل بمنزلہ برق کے ہیں۔

منافقین کی
بے بسی

فرمایا مَنْ اِنْفَقُوْا کِمٰلَتِیْہِہٖ کہ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعُہُمْ فِیْ اٰذَانِہُمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ اِنْہٰی انگیں کر دک کے خوف سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ جب بارش کے دوران بجلی چمکتی ہے۔ اور بادلوں میں گرج پیدا ہوتی ہے۔ تو دہشت کے مائے کانوں میں انگیں ٹھونس لیتے ہیں۔ حَذَرَ الْمَوْتِ کہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں۔ موت کے ڈر سے کانوں میں انگیں ڈال لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ موت سے بھاگ نہیں سکتے۔ کیونکہ وَاللّٰہُ جَمِیْطٌ بِالْکٰفِرِیْنَ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہر طرف سے گھیرنے والا ہے۔ وہ پکڑنا چاہے گا تو فوراً گرفت کر لے گا۔ منافقین کا خوف و ڈر انہیں اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔

فریاد یگاہ الذوق یخطف ابصارہم قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراضگی کی وجہ سے ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ اور وہ اندھے ہو کر رہ جائیں۔ کَلَمًا اَصْنَاءَ لَهُمْ مَشْوَافِیہ جب بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَیْہُمْ قَلَمُوْا اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اہم جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کفر و شرک کا ذکر فرمایا ہے اور یہ اندھیروں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں، بصارت، قلب اور حواس عطا کئے۔ یہ سب اس کے انعام ہیں۔ اور ہدایت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ منافقین کس خیال میں پھرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں چھین نہیں سکتا بلکہ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللّٰہُ لَذَہَبَ بِسَمِیعِہُمْ وَاَبْصَارِہُمْ اَکَر اللّٰہُ تَعَالٰی چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت ہی زائل کر دے۔ یہ لوگ باطنی طور پر تو اندھے ہی ہیں۔ اللہ چاہے تو ظاہری طور پر بھی ان کی مبنائی ضائع ہو جائے اور قوت شنوائی سلب ہو جائے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت قبول کریں اپنے لیے کمال حاصل کریں تاکہ آئندہ زندگی میں ان کے کام آسکے۔ مگر یہ ان ذرائع کو غلط طوع پر استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے صحیح طور پر استفادہ نہیں ہو رہا ہے۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

الْعَمَّ

درس دہم ذ

البقرة ۲

(آیت ۲۱ تا ۲۲)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
 قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ
 فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ
 بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا
 وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور
 ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں، تاکہ تم بھی عباد (۲۱) وہی رب جس نے تمہارے
 لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ اور آسمان کی طرف سے پانی اتار ہے۔
 پھر اس پانی کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے روزی نکال ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ
 کے لیے شریک، اور تم جانتے ہو۔ (۲۲)

دوسرے رکوع کے اختتام تک اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ بقرہ
 کی ابتدائی چار آیتوں میں ایمان والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اگلی
 دو آیتوں میں ظاہر اور باطن انکار کرنے والے کفار کا حال اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ اس کے
 بعد تیسرے آیت میں منافقین کا حال تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان کی چال بازی۔ دھوکا بازی
 فریب کاری، ریشہ دوانی، ظہر و باطن میں تغاوت، فساد فی الارض اور غلط عقیدے کا رد ہے۔
 پھر اس کی وضاحت دو مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایک آگ کی مثال اور دوسری پانی کی۔
 منافقین کا انجام بھی بیان ہوا ہے اور قبیح بھی کی گئی ہے۔

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے۔ حضرت
 عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی يَا أَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب ہے

وہاں دوئے سخن اہل مکہ کی طرف ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں اکثر و بیشتر وہی لوگ کفر میں مبتلا تھے۔ اور جہاں پر **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ ان سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ کہ انہوں نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا۔ اور اسلام کی مرکزیت کے لیے ہمارے قربانیاں دیں۔ تو یہاں پر **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** کے مخاطب دنیا کی تمام اقوام اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ جو لوگ اس وقت موجود تھے، ان سے براہ راست خطاب ہے۔ اور جو بعد میں آئے والے میں انہیں اہل ایمان کے واسطے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے **لَا تُذَكِّرْهُمْ بِهِ وَمَنْ أَبْغَضَ** تاکہ میں اس قرآن پاک کے ذریعے تمہیں بھی تمہارے خطرناک انجام سے آگاہ کر دوں۔ اور جن لوگوں تک کہ قرآن پہنچے گا انہیں بھی متنبہ کر دوں، گریباں سب کو ان کے بُرے انجام سے ڈرا رہا ہوں۔

اس رکوع میں قرآن کریم کے چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں، لہذا اس کے بغیر جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ قرآن پاک کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مد کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ تیسرا مضمون خود قرآن کریم اس کی حقانیت اور اس کا وحی الہی ہونا ہے۔ جسے قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس کا واحد ذریعہ وحی الہی ہے۔ کیونکہ یہاں پر انسانی عقل و شعور کام نہیں کر سکے۔ انسان ہمیشہ علم کی روشنی میں رہتی کرتا ہے اور ذرائع علم میں سب سے اہم، قطعی اور آخری ذریعہ وحی الہی ہے۔

اس رکوع میں چوتھے اہم مضمون معاد کا ذکر ہے۔ قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اچھے اور برے نتیجے کا دار و مدار روز قیامت پر ہے۔ اس روز تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوں گی۔ نیکی اور بدی میں امتیاز ہوگا۔ اور انسان اس کے نتیجے میں ذمہ داری سے دوچار ہوگا۔ لہذا یہ اہم مضمون بھی بیاں ہوا ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی نوح انسان کو توحید پر کاربند ہونے کا حکم دیا ہے۔
 چنانچہ ارشاد ہوتا ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ۔ اے انسانو! اپنے رب

چار اہم
منعائیں

توضیح

کی عبادت کرو۔ توحید فی العبادت وَتَحْدُثُ اپنے رب کو وحدہ لا شریک مانو۔ اور اس کی عبادت کرو۔ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے توحید جیسی سب سے اہم انسانی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عبادت کا مضموم یہ کہ تَعْبُدُ میں ذکر کر دیا گیا تھا۔ کہ عبادت حقیقت میں اپنے ظاہر میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف کرنا ہے۔ اور اس خاص عقیدے اور تصور کے ساتھ کرنا ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام اسباب پر اسی مالک الملک کا تسلط ہے۔ ہر قسم کا نفع و نقصان اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ علیم کل۔ قادر مطلق اور مختار مطلق ہے۔ اس ہستی کا تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی عاجزی کے اظہار کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی ادائیگی بدن۔ زبان۔ دل۔ مال اور افعال سے ہوتی ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ عبادت صرف خدا تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کر کے اس ہستی کی پہچان کرائی گئی ہے جس کی عبادت مطلوب ہے۔ فرمایا اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ یعنی اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور رب خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہی انسان کو پالنے والا ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کے تمام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ انسانی وجود سے باہر جتنی بھی نعمتیں ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خَلْق بیان کی گئی ہے۔ اَلَّذِي خَلَقَكُمْ اِنَاسًا کو سب سے پہلے اور سب سے بڑی نعمت جو میرا کرتی ہے، وہ اس کا وجود ہے۔ اسی لیے فرمایا اُس ذات کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔ خالق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ گویا تمہارا خالق بھی وہی ہے۔ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور تم سے پہلے قوموں کا خالق بھی وہی ہے۔

اہم غزالی نے حدیث پاک کے حوالے سے لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر معرفت الہی

کرنا استعداد سے باہر ہے۔ کیونکہ لَا فِكْرَةَ فِي التَّوْحِيدِ رَبِّ کی ذات میں فکر نہیں ہو سکتی۔
 کہ یہاں تک عقل و شعور کی رسائی نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی پیدا کردہ اشار
 میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کی صفات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ تو اس کی ذات کی
 معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر
 کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی صفت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی رحمت
 اور اس کی ربوبیت سب کچھ سمجھ میں آئے گا۔ اور اس طرح خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل
 ہو جائے گی۔

حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا، تم ایک ایسی قوم
 کے پاس جاؤ، جو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا
 شہادۃً اَنَّ لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ وَ اَنِّ رَسُوْلُ اللهِ یعنی سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ
 وحدہ لا شریک ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بڑے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا
 فَاِذَا هُمْ عَرَفُوْا ذٰلِكَ جب وہ اس کو پہچان لیں تو پھر انہیں نماز، روزہ اور دیگر احکام کا
 حکم دینا۔ گویا سب سے پہلے معرفت الہی اس کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اور باقی باتیں بعد
 میں بتائی۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا ہے: "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ"۔
 انہوں نے تو خدا کے مرتبے کو بھی نہیں پہچانا ہے۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے اگرچہ یہ لوگ
 اہل کتاب اور صاحب علم ہیں۔ بڑے بڑے فلاسفہ ہیں، مگر رب کی صفت کو نہیں پہچان سکے۔
 اگر اُس کی صفت کو پہچان لیتے تو پھر شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ کہتے۔
 مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کا خطاب نہ دیتے اور حضرت مریم علیہا السلام کو مادر خدا نہ کہتے۔ غرضیکہ
 بندے اور خدا کو ایک نہ کر دیتے۔ انہیں تو پہچان ہی نہیں ہو سکی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں
 پہچان کرائی ہے کہ جب اللہ کی صفت کو پہچان لو گے تو اس کی عبادت ہوگی۔ اور اگر اس کی معرفت

ہی حاصل نہیں ہوئی۔ کہ وہ کن صفات کا مالک ہے۔ تو عبادت کس کی کر دے۔

فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ سے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو عبادت الہی
الَّذِي خَلَقَكُمْ وہ رب جس نے تم کو وجود کی نعمت بخش۔ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اور جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم بچ جاؤ۔ لَعَلَّ ترس جی کے لیے ہوتا ہے
اور ترس جی کا معنی ہے امید۔ لیکن اہم مبادلہ الین سیٹھی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں لَعَلَّ کا
لفظ تحقیق کے لیے آتا ہے۔ تاکہ تم بڑے انجام اور کفر شرک سے بچ جاؤ۔ تَتَّقُونَ سلجی معنی بن
جاؤ۔ اس رب کی پہچان کرنے کے بعد اس کی عبادت کرو۔ خَلَقَكُمْ میں صفت ایجاد کا
تذکرہ ہے۔ کہ اُس نے انسان کو عدم اورستی سے پیدا کیا ہے۔ جس کے متعلق فرمایا لَمْ يَكُنْ
شَيْئًا مَّا ذُكِّرْ کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اُسے عدم سے وجود میں لایا۔ لہذا اپنے رب
کی عبادت کرو۔ جس نے وجود جیسی نعمت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت سے متعلق احادیث میں بہت سے احکام موجود
ہیں۔ ترمذی شریف اور منہ احمد میں یہ روایت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر وحی
ازل فرمائی کہ لوگوں کو ان باتوں کی تبلیغ کرو۔ سب سے پہلی بات یہ کہو کہ اَنْ تَعْبُدُوهُ وَلَا تَشْرِكُوْهُ
بد شینا اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ
اس کی مثال ایسی ہے كَمَثَلِ رَجُلٍ اشْتَرَى عَبْدًا کہ کوئی شخص غلام خریدے۔ وہ یہ
یا سونا چاندی غلام خریدنے پر خرچ کرے۔ پھر اس غلام کو کام پر لگا دے۔ اور غلام مزدوری کر کے
جو معاوضہ حاصل کرے وہ اپنے مالک کی بجائے کسی دوسرے شخص کو دے۔ فرمایا اِنَّكُمْ
يَرْضٰوْنَ اَنْ يَّشْكُوْنَ عَبْدًا کذہٹ اس قسم کے غلام سے کون راضی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا
مالک وہ ہے۔ اُس کی خوراک یا لباس اور رہائش کا بندہ دست وہ کرتا ہے۔ مگر غلام دن بھر کی کمائی
مالک کی بجائے دوسروں کو دے آتا ہے۔ فرمایا مشرک کا حال بھی یہی ہے کہ تمام نعمتیں اور ان کے
اسباب اللہ تعالیٰ نے میا کیے ہیں مگر وہ تعظیم وغیرہ کی کرتا ہے۔ یہ مشرک اس ملک حرام غلام

کی طرح ہے۔ جو اپنی کمانی دوسروں کے گھر میں ڈال آتا ہے۔

الغرض فرمایا رب تعالیٰ کی پہچان نشانیوں سے ہوتی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک ربوبیت اور دوسری خالقیت اگر انسان غور و فکر کر کے ان صفات کو پہچان لیں گے۔ کہ یہ صفات خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ تو پھر وہ عبادت بھی اُسی ہی کی کریں گے۔

ہارون الرشید نے ام المومنین صاحبہ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے وجود پر کوئی دلیل بتلائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ انسان کی مختلف بولیاں، مختلف آوازیں، مختلف لہجے اور مختلف لہجے خود خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ دنیا میں چار ہزار مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں کیا یہ وجود الہی پر کچھ کم دلیل ہے۔

وجود الہی پر دلائل

اہل سنت کے چار اماموں میں سے ام المومنین اور ام مکتبہ بڑے ام ہیں۔ ام شامیہ اور ام احمد ان کے شاگرد ہیں۔ یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ پھر ان بڑے امہوں میں سے ام المومنینہ ام اعظم ہیں۔ ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقریباً آٹھ صحابہ کرام کی زیارت کی ہے۔ یہ سعادت کسی دوسرے ام کو حاصل نہیں۔ آپ صحابہ کرام کے زمانے سے قریب تر ہیں۔ آپ کی ولادت عشرہ میں ہوئی جب کہ صحابہ کرام عشرہ تک دنیا میں موجود تھے۔ انیس ام اعظم کا واقعہ ہے کہ دہریوں اور زندقوں کی ایک جماعت آپ کے مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان کا دعوئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود یا ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات کا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ جب انہوں نے ام صاحبہ سے گفتگو کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا اِنِّی مُعَفِّکُمْ فِیْ اَحْبَرِیْں اِیکَیْ مَعَالِمِیْں غور و فکر کر رہا ہوں۔ اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی خود بخود دریا میں چل رہی ہے۔ اس کو چلانے والا کوئی ملاح اس میں نہیں ہے۔ مگر یہ پانی کی موجوں کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اور واپس آرہی ہے۔ وہ کہنے لگے۔ یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے۔ بھلا

کون متعلقہ کہہ سکتا ہے۔ کہ کشتی بغیر کسی چلانے والے کے خود بخود چل رہی ہے۔ یہ سُن کر اہم صاحب فرمانے لگے۔ وَجَّحْتُ لَكُمْ تَمَّ پَر افسوس ہے۔ کہ جب ایک معمولی کشتی چلانے والے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ تو تمام کائنات، عالمِ مَعْلٰی اور عالمِ مَعْلُومی اور جو کچھ ان کے اندر ہے۔ کیا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ کوئی اس کا محرک ان نہیں ہے۔ اس حاضر جوابی سے تمام دہریے تائب ہو گئے اور اہم صاحب کے ہاتھ پر ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔

کسی نے اہم شافعی سے عرض کیا کہ حسرت! وجود الہی پر کوئی دلیل لائیں۔ الخالق کی بات کہ سامنے قوت کا درخت تھا۔ اہم صاحب فرمانے لگے۔ یہ قوت کا درخت خدا تعالیٰ کے وجود پر دلیل ہے۔ دیکھو اس درخت کے پتوں کا ذائقہ، مزہ اور بو یکساں ہے۔ مگر ریشم کا کپڑا اس پتے کو کھا کر ریشم نکالتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرتی ہے۔ بکری کھائے تو مینگیاں نکالتی ہے۔ اور ہرن کھائے تو کستوری پیدا ہوتی ہے۔ بتاؤ یہ خدا تعالیٰ کا کام نہیں تو اس کا کس کام ہے۔ پار مختلف چیزیں ایک ہی پتہ کھاتی ہیں اور ان سے مختلف چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرتِ تامہ کا شاہکار ہے۔ کہ چاروں چیزیں کو الگ الگ پیدا کرتا ہے۔

ام احمد سے بھی کسی نے یہی سوال کیا۔ فرمانے لگے۔ کہ انڈیا قلعہ کی مانند ہے۔ اوپر سے سفید اور چکن اور اندر سے سونے کی طرح زرد ہے۔ یہ اچانک پھٹتا ہے۔ تو اس سے ہر معرعہ جیوان نکلتا ہے۔ یہ خوبصورت جانور کون نکالتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کے سوا اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان ہی مسموعات پر غور کرنے سے اس کی قدرت، حکمت، خالقیت اور ربوبیت کے رموز مجھ میں آتے ہیں۔ لہذا اگر خدا تعالیٰ کی صفت سمجھ میں آگئی۔ تو پھر عبادت بھی ٹھکانے لگے گی۔

فرمایا الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اَرْضًا وَرِثًا وہ خدا تعالیٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا۔ زمین کی ساخت اس طرح کی ہے کہ نہ دلدل کی طرح نرم اور نہ

بہتر کی طرح سخت۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا معتدل بنایا ہے کہ انسان اپنی تمام ضروریات
 اسی سے پوری کرتا ہے۔ اسی پر چلتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ مکان بناتے
 ہیں، غرض زمین کو کمال درجے کا فرش بنایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ
بِنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَنَخْرُجُ بِهِ مِنْ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ
فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی، جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور ان
لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ تاکہ تم بھی جاد ﴿۲۱﴾ وہی رب جس نے تمہارے
لیے زمین کو فرش اور آسمان کو محبت بنایا ہے اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا ہے۔
پھر اس پانی کے ذریعے پھل سے تمہارے لیے روزی نکال ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ
ہمت نہ علی کے لیے شرک اور تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ۖ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَرَبَّكُمُ الَّذِي
حَضَرْتُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبَّاسٍ اس کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں: اُعْبُدُوا رَبَّكُمُ رَحَدُ
اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو، نہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس
کی تفسیر دو طریقے پر ہے۔ وَحَدُ وَاللَّهِ میں توحید کا لفظ پہلے بیان کیا۔ کیونکہ توحید عبادت کے
لیے شرط ہے۔ اگر توحید ہوگی۔ تو عبادت بھی کارآمد ہوگی۔ ورنہ کوئی فائدہ نہیں جس طرح نماز کے
لیے طہارت شرط ہے۔ یعنی طہارت کے بغیر نماز ادا نہیں ہوگی۔ اسی طرح توحید کے بغیر عبادت
نہیں ہوگی۔ تفسیر کے دوسرے طریقے میں وَحَدُ وَاللَّهِ کا معنی یہ کیا ہے۔ کہ عبادت صرف
ایک خدا کے لیے کرو۔ یہ توحید فی العبادۃ ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کے لیے عبادت
برگز جائز نہیں۔ بلکہ ایسا کفر، کفر، شرک اور حرام ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے قوی دلائل موجود ہیں۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ جو مصلح اور قادر ہے۔ اس کی صفات کا ذکر ہے۔ کہ اس کے مشابہ کوئی چیز نہیں۔ نہ اس کوئی نہ یعنی مقابل یا شریک ہے اور نہ اس کی کوئی مثل ہے۔ وہ ایسی اعلیٰ ذات ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔

دلائل توحید کے متعلق فرمایا کہ آسمان کی بلندی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بغیر ستون کے قائم کیا ہے۔ اس بات کا اشارہ سورۃ رعد میں کیا گیا ہے: بِغَيْرِ عَمَدٍ شَرْهُنَّ۔ اے تم بغیر ستونوں کے دیکھ رہے ہو۔ دنیا میں کوئی چھت بغیر ستون کے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس نے آسمان جیسی عظیم الشان چھت کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جب سے اے قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آیا۔ جب تک چاہے آسمان کو اسی حالت میں قائم رکھے گا۔ اور جب چاہے گا۔ اُسے توڑ پھوڑ دے گا۔ اور یہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان کیا وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَفْفًا مَّحْفُوظَةً وَفَعْلًا عَنْ أَيْتِهَافًا مُّصَوَّنًا۔ دیکھو! ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔ مگر لوگ ہماری ان نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

دلائل توحید کے سلسلے میں زمین کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اے کیسا ثبات بخشا ہے۔ اہم البوکر جصاص فرماتے ہیں: کہ زمین کے اوپر بھی ہوا ہے اور نیچے بھی ہوا ہے۔ اور اے فضا میں بغیر کسی سائے کے قائم کر رکھا ہے۔ جاسوسیہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے۔ لفظ خلق کی تشریح کل (گنہگار دیں میں) بیان کر دی گئی۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی وہ ذات جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا أَسْ رِبْ كِ عِبَادَتِ كِرِ الْذِ كِ جَعَدَ لَكُمْ اَنْزُرْ مِنْ فِرَاشًا جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ فرش۔ بستر۔ درمی چٹائی وغیرہ کہتے ہیں جس پر انسان آرام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش کے ساتھ اسی طرح تعبیر کیا ہے۔

جیسا پاڑوں کے متعلق فرمایا "وَالْجِبَالُ أَوْتَادُ" یعنی پہاڑوں کو کیل بنایا اور سورج کے متعلق آتا ہے: "وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا" سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ بنایا۔

اہم ابو جبر جصاصؒ فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں فرش پر نہیں سوؤں گا۔ اور وہ زمین پر سو جائے۔ تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بھی فرش سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صرف عام میں فرش، پار پائی، درمی، قالین یا چٹائی کو کہتے ہیں۔ زمین کو نہیں کہتے۔ اس لیے قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھوں گا۔ یا نہیں پڑھوں گا اور وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھے۔ تو بھی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ سورج کو بھی اللہ تعالیٰ نے چراغ کہا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ عزت عام میں چراغ کا لفظ دیے یا لائین پڑھنا جاتا ہے سوچا پڑھنا نہیں بولا جاتا۔ لہذا سورج کی روشنی میں اس کے لیے پڑھنا مباح ہو گا۔

ابو الحسین قدوریؒ فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر وہ پھلی کھائے۔ تو اس کی قسم قائم ہے گی۔ حالانکہ پھلی بھی گوشت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود اسے "لَحْمًا صَرِيحًا" یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ عزت عام میں گوشت کا اطلاق گائے بھینس یا بھیڑ بکری وغیرہ کے گوشت پر ہوتا ہے۔ پھلی پر نہیں ہوتا۔

قرآن پاک کی اولین دعوت اللہ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ کی عبادت ہے۔ اس مسئلہ میں تمام آسمانی کتب متفق ہیں کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کی جائے۔ قرآن پاک جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی عبادت سے منع بھی کرتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو۔ تو عبادت کو ربوبیت پر مرتب فرمایا۔ گو ربوبیت عبادت کی علت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے کرو کہ وہ رب ہے۔ اگلی آیت میں ربوبیت کی تشریح بیان کر دی گئی ہے کہ اُس نے تم پر ایسے ایسے انعام کئے ہیں لہذا اس کی عبادت ضروری ہے۔ ربوبیت

کے سلسلہ میں سب سے پہلے صفت خلق کا ذکر ہے۔ اور پھر ظاہری، باطنی، علمی، اور عملی ہر قسم کے انعام کا بیان ہے۔ اس ضمن میں قرآن پاک بھی ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اس کے چار عمدہ مضامین یعنی توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت اور معاد کا ذکر ہو چکا ہے۔

عبادت کے اولین مرتبہ
ذات باری تعالیٰ ہے

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو۔ جس نے تمہیں پیدا کیا۔ جب انسان اپنے باپے میں خود کرتے گا تو اُسے معلوم ہو گا کہ پہلے وہ موجود نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا۔ نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے آباء اجداد کو بھی پیدا فرمایا "وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ" تم سے پہلے تمام لوگوں کا خالق ہے اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ خالق وہ ہے باقی سب مخلوق ہیں۔ عاجز اور محتاج ہیں۔ انسان اس قدر بے بس ہے کہ اُس کے جسم کی کھال کا کوئی حصہ اتر جائے تو ساری مخلوق مل کر بھی اُسے وہ کھال مہیا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں نہ جنات کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ فرشتے۔ نہ نیک انسان کسی کام آ سکتے ہیں۔ اور نہ بد انسان یا کسی دوسری مخلوق میں کوئی بھی عبادت کا ستم نہیں۔ گویا کسی چیز میں ایسی صلاحیت موجود نہیں جسکی بنا پر اس کی عبادت کی جائے۔ لہذا عبادت صرف اسی ذات اقدس کی ہو سکتی ہے۔ جو واجب الوجود ہے۔ یعنی جس کا وجود خود بخود ہے جو خالق۔ رب، عظیم کل، قادر مطلق، مختار کل اور نفع و نقصان کا مالک ہے۔ جو ازلی وابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ موجود ہے گا۔ باقی ہر چیز حادث اور فانی ہے۔ "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" ہر چیز بافعل ہلاک ہے۔ یاقنا ہو جانے کی۔ دوام اور بقا صرف اس ذات اقدس کے لیے ہے۔ جو محسن اور منعم ہے۔ جو جمیع و بسیر ہے لہذا عبادت بھی اسی کی ہو سکتی ہے۔ فرمایا عبادت کرنے کا فائدہ یہ ہو گا "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" تاکہ تم خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ تقویٰ بچاؤ کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی عبادت کرتے رہو گے تو بچ جاؤ گے ورنہ اس کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ عبادت الہی کو لازم پکڑ دے گا کہ دنیا میں بُرائی سے بچ جاؤ گے۔ اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہو گے۔

زمین کے فوائد

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَهِيَ قَادِرٌ مَطْلُوعٌ اور مہربان خدا تعالیٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش کے طور پر بنایا۔ ایسا فرش جو نہ بچتر کی طرح سخت ہے اور نہ پانی کی طرح بالکل نرم یہ ہوا کی طرح لطیف بھی نہیں بلکہ بالطبع اس کو خشک بنایا۔ تاکہ یہ

دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر مفید مرکب بن سکے۔ اور لوگوں کے کاروبار ٹھیک طور پر چل سکیں۔
 اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں ودیعت کی ہیں۔ کرۂ ارض کے مختلف
 حصوں کی زمین مختلف ہے۔ یہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے۔ وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مَّجْعُورَاتٌ زمین
 کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔ رنگت کے اعتبار سے کوئی حصہ سفید ہے۔ اور کوئی حصہ سیاہ ہے۔
وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيْضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُا کہیں سرخ گھاٹیاں
 ہیں اور کہیں سیاہ پتھر ہیں۔ وضع قطع میں واضح اختلافات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں روئیہ گی کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا
 ہے وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدَاجِ ”قسم ہے زمین کی جو پھٹ کر پودے اور نباتات کو باہر
 نکالتی ہے پانی کو اپنے اندر جذب کر کے محفوظ رکھتی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی
 اتارتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر فَسَلَّكَهُ مَنَازِلَ بِرِّيحٍ پھر اس کو زمین میں
 نالیوں اور چشموں کی شکل میں چلاتا ہے۔ ضرورت کے وقت چشمے یا نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔
 یا کنویں کھود کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان، جانور اور کھیتیاں یکساں طور پر مستفید ہوتے
 ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین میں کرم و سخاوت کا وہ مادہ رکھا ہے۔ کہ اس میں ایک دانہ پھینکو
 یہ سٹودانے لوٹائے گی۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

زمین میں انسان ہر روز موت و حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا وَأَيُّدُ
لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيِّتَةُ أَحْيِيْنَهَا دیکھتے نہیں کہ زمین بالکل مردہ یعنی خشک
 ہوتی ہے۔ پھر اس کو ہم زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ لوگ ہر موسم میں کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ
 کی قدرت اور قیامت کا نقشہ انسان کی نگاہ میں رہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین
 میں مختلف قسم کے جانور پھیلادئے وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ جنہیں انسان شمار
 تک نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف طبقات میں مختلف قسم کے پتھر رکھ
 دیے جن میں بڑے بڑے قیمتی اور معمولی سے معمولی ہر قسم کے پتھر انسانی ضروریات کے لیے موجود ہیں۔
 زمین کی افادیت کے متعلق مزید فرمایا خَلَقَ لَكُمْ مِّنْهَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
 اے انسانو! تمہارے ہی فائدے کے لیے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔ ذرا غور کرو۔ پتھروں

اَتَيْنَا تَجْعَلُونَ اِلٰى يَدٍ وَ هَذٰى يَوْمَ لَدٰى حٰبِ نَدِيْدٌ
تم نبی تیم کو میرا شریک بناتے ہو، حالانکہ نبی تیم تو کسی شریف آدمی کے شریک نہیں بن سکتے
وہ تو کہنے آدمی ہیں۔

ایک مذہب ہے اور ایک کشمیر ہے، شبیر یا مشابہ اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو کیفیت میں
برابر ہو جیسے گرمی، سردی، بھتی، نرمی وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز طول، عرض اور عمق میں برابر ہو۔
اُسے مشکل کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے شریک مت مٹھاؤ، کیونکہ خدا تعالیٰ
کے سوا واجب الوجود کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی عظیم کل اور قادر مطلق نہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں
جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ مگر تم جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا نہ ٹھہراتے ہو۔
آج دنیا میں خدا تعالیٰ کے مقابل اور شریک ٹھہرانے والے بیشمار مجوسی موجود ہیں۔ شیخی
مذہب والے دو خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا اور دوسرا برائی کا۔ ایک کا نام یزدان، کھاسبے۔ اور
دوسرے کا نام اہرمین۔ ان کے نزدیک ایک شر کا خدا ہے۔ اور دوسرا خیر کا۔ نور کا خدا ہے
اور ظلمات کا اور ہے۔ حالانکہ سورۃ النعام میں پڑھیں گے: حَبَّكَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرُ
یعنی ظلمت اور نور اُسی وعدہ لا شریک لہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں
اور یہ وہی ذات ہے جس نے خود تمہیں بھی پیدا کیا ہے۔

بعض لوگ ستاروں میں مستقل تاثیر کے قائل ہیں۔ ایسے لوگ نیک بختی اور بد بختی اور ترقی و
تنزل کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ صابی فرقہ کے لوگ ہیں۔ جو ستاروں کو اللہ تعالیٰ
کا نہ ٹھہراتے ہیں۔

بعض لوگ اصحاب قسور سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ اور اس طریقے سے خدا کا مذہب
ٹھہراتے ہیں۔ بعض لوگ پیروں کو ہر حالت میں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ
خدا چاہے راضی ہو یا ناراض پیر ہر حالت میں سفارش کریں گے۔ آج کل پیر پرست لوگوں کا یہی عقیدہ
ہے۔ کہ پیر کا دامن پکڑ لیا ہے۔ بس پار ہو جائیں گے۔ کسی نیکی بھی کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اس
قسم کی سفارش کو قرآن پاک نے جبری سفارش سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وَلَا يَسْتَعِزُّونَ
اِلَّا لِعَيْنِ الرَّحْمٰنِ اللّٰهِ تَعَالٰی کے ہاں کوئی جبری سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی اجازت اُسے

ہوگی جس سے خدا تعالیٰ راضی ہوگا۔ اور جس کا عقیدہ خدا تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ چونکہ کفر و شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود عبادہ ہیں۔ لہذا کسی مشرک کی سفارش ممکن نہیں ہے۔ یہ نہ بھڑانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

شرک فی اثبت بعض لوگ مشیت میں شرک کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ایک شخص نے کہا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتُ تَرَأٰی نے فرمایا اَجَعَلْتُ نِيَّ لِلّٰهِ نِيْدًا کیا تم نے مجھے خدا کے ساتھ شریک مقرر کیا ہے۔ قُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ کہو جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَمَا تَشَاءُوْنَ اِنْ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ تم اس وقت تک نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ البتہ بعض روایات میں یوں آتا ہے کہ کہو مَا شَاءَ اللّٰهُ جو اللہ چاہے۔ اس کے بعد جو تمہارا ارادہ ہے اس کے مطابق عمل کرو، شرک سے بچ جاؤ گے۔

شرک فی العادۃ شاہ اسماعیل شیعہ اور دوسرے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ شرک عبادت میں بھی ہوتا ہے۔ اور عادت میں بھی ہوتا ہے۔ شرک فی العادۃ کی مثال زنا رکھنا کا دھاگا ہے۔ جو ہندو یا مجوسی اپنے جسم کے ساتھ باندھتے ہیں۔ عیسائی صلیب باندھتے ہیں۔ یہ بھی شرک فی العادۃ ہے۔ حضور علیہ السلام نے صلیب کو کفر کی نشانی بتایا ہے۔ اسی لیے فرمایا اِطْرَحْ عَنْكَ هَذَا الْوُثْنُ اے اتار دو، یہ بُت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کی شکلی اس لیے ہوگی کہ یہ کفر کی نشانی ہے۔ اور وہ بھی نبی کے نام پر۔ اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ کہ عیسائیوں نے اسے بھری کی طرح حلال قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ کسی نبی کی شریعت میں حلال نہیں مقرر۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر آئے ہیں۔ سب کی شریعتوں میں خنزیر حرام ہی رہا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۱، در منثور ص ۳۵، ۲۔ تقویۃ الایمان ص ۹۱۰، ۳۔ ترمذی ص ۱۸۴

۴۔ بخاری ص ۱۱۱، ۵۔ حجتہ اللہ البابہ ص ۱۸۴

بعض لوگ بچے کے سر پر چوٹی رکھ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوٹی فلاں بزرگ یا فلاں خواجہ کی رکھی ہے۔ اگر یہ چوٹی نہ رکھتے تو کچھ مر جاتا۔ یہ صریح اور جلی شرک ہے۔ بعض لوگ جو سیوں کے نوروز یا عیائیوں کے بڑے دن کی تعظیم بجا کر شرک کرتے ہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جو تختہ میں پھول، بار، ڈالی یا کوئی اور بدیہ پیش کر لیا اور تعظیم کر لیا تو شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض مشائخ نے کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے۔

کچھ لوگوں کے اندر ہذبنانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے نذر و نیاز دیتے ہیں۔ ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ قبروں اور زیارتوں پر کس کس طرح اور کس کس نام کے غرس منعقد ہو رہے ہیں۔ یہ سب بدعت اور بعض شکلوں میں شرک ہے۔ بعض لوگ غیر اللہ کی قسم اٹھا کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور کچھ غیر اللہ کے نام پر بچے کا نام رکھ کر شرک کرتے ہیں۔ جیسے عبد المصطفیٰ، حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ عبد اللہ یا عبد الرحمن وغیرہ نام رکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے۔

بعض لوگ استعانت طلب کرنے میں شرک کرتے ہیں یعنی غائبانہ طور پر مافوق الاسباب قبروں والے بندگوں اور اولیاء سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے۔ ”وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ“ خدا تعالیٰ کی ذات ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اُس سے مدد طلب کر دو۔ تم غائبوں کے آگے ہاتھ بھیلنا ہے ہو۔ جن کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کو تو یہ بھی علم نہیں کہ تم کس تکلیف میں مبتلا ہو۔ چہ جائیکہ ان کے آگے دست سوال دراز کر دو۔

بعض لوگ جانور ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ مُحَمَّدٍ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ فَلَانٍ یعنی فلاں بزرگ یا فلاں پیر کے نام پر۔ ایسی صورت میں جانور سرے سے مُردار ہو گیا۔ فقہائے کرام نے اسے بسم اللہ میں شرک قرار دیا ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو شگون لے کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں حضور علیہ السلام

لے فرمایا اَلْعَبْرَةُ بِشْرُكَ شَاوَن لِّمَا شَرَكَ کِی بات ہے۔ بعض لوگ غیب کی خبریں معلوم کرنے کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کابن، سناسی، نجومی، دست شناس یا جادو کے پاس جا کر پوچھتے ہیں۔ اور ایمان کو ضائع کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اپنی جیب سے پیسے دیکھ کر شرک خریدنے کے مترادف ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈے کی شکل میں شرک کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈے کرنے والے اکثر غلط کار لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے کلام یا حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پڑھ کر دم کرے یا کچھ کرے، تو جائز ہے۔ وگرنہ یہ ٹونے ٹونکے جن کے ساتھ طرح طرح کی شرائط وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ سب شرکیہ یا بدعت اور معصیت کی باتیں ہیں۔

بعض لوگ غیر اللہ کو غائبانہ طور پر پکار کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے یا شیخ عبد القادر جیلانی شکیٹا اللہ یہ مذاکا شرک ہے۔ اور پھر ان سے حاجتیں بھی طلب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید تقویٰ الایمان میں لکھتے ہیں کہ دیکھو! ایسے لوگ کتنی غلط بات کرتے ہیں کہ بندے کو اصل ٹھہرا دیا۔ اور خدا تعالیٰ کو واسطہ بنا دیا۔ اگر اس کا الٹ کر دیتا تو درست تھا۔ یعنی یا اللہ شکیٹا للشیخ عبد القادر جیلانی۔ اے مولا کریم اب شیخ عبد القادر جیلانی کے واسطے اور ان کے طفیل سے میرا یہ کام کرے۔ مگر اس شخص نے شیخ عبد القادر جیلانی کو منستی بنا کر اللہ تعالیٰ کو واسطہ کے طور پر پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ توہین کا بھی مرتکب ہوا۔ غیر سے امداد طلب کر کے کفر میں مبتلا ہوا۔

شرک جلی کے بعد شرک خفی کا ذکر بھی ہو جائے۔ شرک خفی ریا

شرک خفی

میں پایا جاتا ہے۔ یا بعض دوسری اعتقادی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کا شرک خفیف ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنے کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے لام ابن کثیرؒ اور امام رزنیؒ نے اس کی مثال دی ہے کہ بعض وَاللّٰہِ وَحَیَاتِکَ اللّٰہِ کی قسم اور تیری زندگی کی قسم یا میری زندگی کی قسم یا بعض لوگ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اگر رات کو یہ گناہ ہوتا تو ہم لٹ جاتے۔ یہ بطعن

مکان میں موجود تھی جس کی وجہ ہم چڑی سے بچ گئے۔ یہ شرک خفی کی مثالیں ہیں۔ عام محاورے میں یوں بھی کہا جاتا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب یا حکیم صاحب کی مہربانی سے مریض نچ گیا۔ ورنہ مر گیا تھا۔ یہ پہرے دار یا چہرہ اسی نہ ہوتا۔ تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس لیے شرک خفی کی فہرست میں آتی ہیں کہ ان چیزوں کو مؤثر سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں اثر ڈالنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اطاعت غیر اللہ

جس طرح غیر اللہ کی عبادت مطلقاً کفر اور شرک ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی بلا استقلال طاعت بھی شرک ہے۔ اطاعت غیر کا مطلب یہ ہے کہ نبی یا کسی بزرگ کی اطاعت کرتے ہیں مگر اس کو جتنی نہیں سمجھتا بلکہ سب کچھ اُسی کو سمجھ رہا ہے۔ یعنی وہ جو بھی حکم کرے گا، اُس کی بلا چون و چرا اطاعت کی جائے گی۔ اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُؤَسَاءَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ اسی کو کہا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو رب بنایا تھا۔ یہ شرک ہے۔ البتہ نبی کی مطلق اطاعت فرض ہے کیونکہ نبی کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور اس کی خوشنودی معلوم نہیں کر سکتا۔ مگر نبی کا حکم مستقل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہم نے دنیا میں انبیاء (علیہم السلام) کو اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کی اطاعت کی جائے۔ نبی کی اطاعت فرض ہے بحیثیت رسالت کے۔ اور علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ نبی کے لفظ میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی جانب سے کوئی حکم نہیں دیتا۔ بلکہ اِنْ اَتَيْعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ میں تو اُسی حکم کی تعمیل کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ یعنی منجانب اللہ ہوتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ علمائے کرام، مجتہدین، شیخ طریقت، بادشاہ وقت، امراء، حکام اور والدین کی اطاعت بھی کی جاتی ہے۔ نیز غلام اپنے آقا کی اطاعت بھی کرتا ہے۔ تو یہ سب اطاعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ معقید ہیں۔ کہ اُس کے حکم کے خلاف کوئی بات نہ ہو، شیخ، پیر، حاکم، استاد اور والدین کی اطاعت، غلام کی اطاعت وغیرہ اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا طَاعَةَ لِمَا خُلِقَ فِيْ

مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خَالِق کی معصیت کرتے ہوئے، اس کی نافرمانی کرتے ہوئے۔ مخلوق کی اطاعت
 روا نہیں ہے۔ ایسا کرنا شرک کے مترادف ہے۔ ان کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ بلکہ نبی کی
 اطاعت مطلق ہے۔ کیونکہ نبی اپنی جانب سے حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ بجانب اللہ ہوتا ہے۔ باقی
 لوگ چونکہ اپنی طرف سے حکم دیتے ہیں، اسی لیے ان کے حکم کو جانچنا ہو گا۔ صحیح حکم کی اطاعت
 ہوگی۔ اور خلاف شرع غلط بات کو ٹھکرا دیا جائے گا۔

اسی لیے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُونَ اللہ تعالیٰ کے
 لیے بے نہ ٹھہراؤ۔ اور تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ کوئی نافع اور ضد
 نہیں۔ کوئی خالق اور قادم مطلق نہیں۔ جب یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ تو پھر اس کی عبادت
 اور اس کی صفات میں غیروں کو کیوں شریک مانتے ہو مسئلہ توحید قرآن پاک کا بنیادی مسئلہ ہے۔
 اللہ تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں یہ مسئلہ سمجھا دیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین ہوں گے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ
مِّن مِّثْلِهِ ۚ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّن دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ۚ (۲۲) فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ
(۲۳) وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ
جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ
ثَمَرَةٍ زُرِقَا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ
مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا
خَالِدُونَ (۲۵)

ترجمہ :- اور اگر تم اس چیز سے شک میں ہو جس کو ہم نے نازل کیا ہے اپنے بندے
(یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر پس لاؤ تم ایک سورہ اس کے مانند اور بلاؤ اپنے
مددگاروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم سچے ہو (۲۲) پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر
سکو گے پس پچو اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کفر کرنے والوں
کے لیے تیار کی گئی ہے (۲۳) اور آپ خود بخبری سنا دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے
اور جنوں نے اچھے عمل کیے کہ بیشک ان کے لیے باغات ہیں جن کے سامنے
نہریں بہتی ہیں جب بھی وہ ان بہتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے
تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے روزی دی گئی اور وہ اس
میں دیے جائیں گے ایک درخت کے مشابہ پھل اور ان کے لیے ان بہتوں
میں پاکیزہ عیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۲۵)

سورہ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا جواب

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ . پیرانسلوں کے تین گروہ بیان فرمائے۔ پہلا مومنین . متقین کا گروہ۔ اور اس کے اوصاف بیان فرمائے۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید اس کے دین اور قیامت کے منکر ہیں اس کے بعد تیسرے آیات میں منافقین کا حال ذکر کیا۔ جو سب سے زیادہ خطرناک گروہ ہے ان کی علامات کارنامے اور ان کی ذہنیت کا بیان ہوا۔ اس کے بعد مشاؤون کے ذریعے ہر دو قسم کے منافقوں کی نشاندہی کی۔ جو کفر میں پچے ہو چکے ہیں یا پھر ابھی متردد ہیں۔ اور پھر ان کے بڑے انجام کا بھی ذکر فرمایا۔

سورۃ بقرہ دو سو چھیالیس آیات کی سب سے لمبی سورۃ ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے مکی زندگی میں جس قدر سورتیں نازل ہوئیں اور ان میں مبتنی تعلیم دی گئی۔ سب کا خلاصہ اس سورۃ میں آگیا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام اس میں آگئے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نظام کو مکمل طور پر اس میں بیان فرمادیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی بنیادی تعلیم جس پر تمام کتب آسمانی متفق ہیں اس کا حکم دیا کہ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ یعنی عبادت خالقنا اللہ تعالیٰ ہی کی کرنا۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اس کے بعد معرفت الہی پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت بھی کسی کی کارآمد نہیں۔ مشرکین اور یہود و نصاریٰ اگرچہ خدا تعالیٰ کو مانتے تھے۔ مگر صحیح پہچانتے نہیں تھے۔ اسی لیے وہ ناکام ہوئے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی ذات سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ انسانی عقل و فکر سے بلند ہے، وہ ان تک کسی کی رسائی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو عالم جبروت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا پہچانا بھی بڑا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کی پہچان اس کی مخلوق اور اس کی مصنوعات میں غور کرنے سے ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی پہچان لیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا ذکر کیا ”رَبِّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ تمہارا رب وہ ہے۔ جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ قابہ مطلق ہے اور نہ عظیم کل ہے۔ عبادت کے لائق وہی ذات ہے۔ جو ان صفات کی مالک ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ربوبیت اور خالقیت کو بیان کیا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین کو تمہارے لیے بچھونا اور فرش بنا دیا۔ اور آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا۔ آسمان سے پانی اتار کر پھلوں کے

ذریعے تمہاری روزی کا سامان مہیا کر دیا۔ لہذا عبادت صرف اسی کی کر دو۔ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ
اَنْدَادًا کسی چیز میں بھی خدا کا شریک نہ بناؤ۔ تم جانتے ہو کہ خدا کے سوا دوسرا کوئی کچھ بھی نہیں
کر سکتا۔ سائے محتج اور اس کی عاجز مخلوق ہیں، خواہ وہ انسان ہوں۔ جن ہوں یا فرشتے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ان آیات میں چار عمدہ مضامین کا ذکر کیا۔
یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کے بعد رسالت ہے۔ کہ نبی پر ایمان لائے بغیر
اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے اوامر اور نواہی کا علم نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے یونانی حکماء محض
اس لیے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے نبیوں کی اتباع کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ وہ تو کہتے تھے کہ
یہ تو جاہل لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ ہم تو بڑے عقلمند ہیں۔ تیسرا مضمون خود قرآن پاک کی
صدقت ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور چوتھا مضمون قیامت
پر ایمان ہے۔ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا قیامت پر منحصر ہے۔ لہذا اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے

ان حالات میں قرآن پاک اور پیغمبر علیہ السلام کا اکٹھا تذکرہ فرمایا ہے وَإِنْ كُنْتُمْ
فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں شک ہے۔ جو ہم
نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔
گویا اس کلام الہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے نبی کی نبوت کی تصدیق مطلوب ہے۔ نبی دعویٰ کرتا
ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں۔ تو اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ کا ہونا ضروری ہے۔
احادیث میں حضور علیہ السلام کے تین ہزار سے زیادہ معجزات کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن پاک حضور
علیہ السلام کا خصوصی معجزہ ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی خصوصی معجزہ عطا
فرمایا ہے۔ پھر جس کی قسمت میں عطا وہ ایمان لے آیا۔ فرمایا میرا خصوصی معجزہ وحی الہی ہے۔ جس
کے ذریعے قرآن پاک جیسا بے مثال معجزہ عطا ہوا۔ اسی لیے آپ نے ارشاد فرمایا اَرْجُوا اَنْ اَكُوْنَ
اَكْثَرُهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ
پیروکار میرے ہوں گے۔ کیونکہ میرا خصوصی معجزہ پائیدار اور دائمی ہے باقی پیغمبروں کے معجزات عارضی تھے

قرآن پاک
خاص معجزہ ہے

جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مگر میرا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا لامنی کا معجزہ حضرت صلح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ عارضی معجزات تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو گئے مگر حضور علیہ السلام کا معجزہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

عبد با عزت
لفظ ہے

اس آیت میں حضور علیہ السلام کے لیے عبد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو کہ بڑا با عزت لفظ ہے نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا کسی پیغمبر کی عبدیت کا اظہار اس کی بہت بڑی صفت ہے کیونکہ کامل درجے کی عبدیت انبیاء کرام علیہم السلام میں ہوتی ہے۔ اور پھر تمام نبیوں میں حضور علیہ السلام اکمل ترین بندے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہے۔ قرآن پاک میں جہاں بھی عبد کا لفظ آیا وہاں پر خاص انعام کا ذکر ہے۔ جیسے سُبْحَنَ الَّذِيْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ دوسری جگہ فرمایا "نَزَلَ الْفُرْقَانُ عَلٰی عَبْدِهٖ" ایک اور جگہ ارشاد ہے "فَاَوْسَحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْسَحٰی" الغرض یہ عبد کا لفظ نہایت اعلیٰ مقام کا حامل ہے نماز میں جب تک کوئی اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ نہ کہے۔ اس کی نماز کامل ہی نہیں ہوتی۔ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ نہ تو خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ نہ اوتار ہیں اور نہ خدا نے ان میں حلول کیا ہے۔ نہ ان میں الٰہیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اس کے عبد یعنی بندے ہیں۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بعض لوگ جہالت کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر یا انسان نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہونا فخر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِلٰی خَالِقِ کِبْرًا مِّنْ طٰیْنٍ" میں تو مٹی سے انسان جیسی برگزیدہ سبکی کو پیدا کرنے والا ہوں۔ بشر ہونا کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر عبدیت تو بہت اعلیٰ صفت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر تو عبدیت والی بات ہی نہیں پائی جاتی۔ ہماری عبدیت کی حالت ضراب ہے۔ ہم گندے انسان ہیں۔ جو گناہوں سے آلودہ ہیں۔ جنہیں عبدیت کا مقام حاصل ہے وہ تو پاکیزہ نفوس ہیں جو ہر وقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔

قرآن پاک
بطور چیلنج

خود قرآن پاک اس بات کا گواہ ہے کہ مشرکین اُسے خدا تعالیٰ کا کلام ماننے کے لیے

تیار نہ تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کے رد کے طور پر قرآن پاک میں تین قسم کی آیات نازل فرمائیں۔ اولاً سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن پاک کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ انسان کے بس کی بات ہے۔ بلکہ لَہِیْنِ اجْتَمَعَتْ اِلَٰہُ وَاِلٰہُ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُہُمْ لِبَعْضٍ ظَہِیْرًا یعنی تمام انسان اور تمام جن مل کر بھی اس قرآن پاک کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ گویا یہ ساری مخلوق عاجز ہے۔ اس بات سے کہ قرآن پاک جیسا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام پاک کے منجانبہ ہونے میں کسی قسم کا شک ہے یعنی یہ کہ یہ انسانی کلام ہے تو فَاْتُوْا بِمِثْلِ سُوْرَةِ مِّثْلِہٖ تو اس جیسی دس سوڑیں ہی بنا کر لے آؤ خواہ چھوٹی چھوٹی ہی ہوں۔ پتا چل جائے گا کہ واقعی یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ کوئی انسان بھی ایسی چیز پیش کر سکتا ہے۔ مگر کوئی بھی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ اب تیسرے نمبر پر آیت پاک میں آخری چیلنج دیا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم کو اس کلام پاک میں شک ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِہٖ سِوَا سِوَا جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ چاہے وہ تین آیات کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابو بکر جصاص چوتھی صدی بھری میں ہوئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے اس چیلنج کو صدیاں گزر جانے کے باوجود کسی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ اور اگر میلہ کذاب جیسے کسی شخص نے حماقت کی تو اسے مزہ کی کھانی پڑی۔ اس کے ہم عصر کافروں نے اس کے مزہ پر ہتھوک دیا تھا۔ کہ تم پر لعنت ہو۔ کیا تمہارا وضع کردہ کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو یا نوا لے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ قرآن پاک کا یہ اعجاز چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ اور آج تک کوئی ایک سورۃ بھی بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

عام مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ چیلنج قرآن پاک کی نصاحت و بلاغت کے لحاظ

سے ہے۔ اہم البرجہ خاص بھی انہیں مفسرین میں شامل ہیں۔ جو فرماتے ہیں کہ قرآن پاک ایسا فصیح و بلیغ کلام ہے کہ اس جیسی فصاحت و بلاغت آج تک کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کر سکا۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ چیلنج فصاحت و بلاغت تک ہی محدود ہے۔ تو پھر یہ خطہ عرب تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ چیلنج صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لیے ہے۔ اگر اس چیلنج کو بین الاقوامی چیلنج تسلیم کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ فصاحت و بلاغت کے علاوہ نہ کوئی دوسرا کلام اس جیسا ہے نہ اس میں دیے ہوئے نظم جیسا کوئی نظام دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس جیسا کوئی دوسرا دستور پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماحول جیسی اجتماعیت کوئی دوسرا قانون پیش نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ سابقہ کتب آسمانی اور صحیفے بھی ایسا اجتماعی نظم نہیں دے سکتے۔ جیسا قرآن پاک نے عطا کیا۔ اسی لیے فرمایا کوئی ایک سورۃ لا کر دکھاؤ۔ جو قرآن جیسی جامعیت پیدا کر سکے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ صرف سولہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور آپ کچھ مدت چھوڑ کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت سندھیؒ کے دوست تھے اور آپ کے ساتھ ہی اسلام لائے۔ رشتے کے لحاظ سے حضرت مولانا سندھیؒ حضرت مولانا لاہوریؒ کے خسر تھے۔ تو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ دنیا بھر کی اقوام اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ جو پروگرام اور نظام عدل اسلام اور قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ انہیں حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلام جیسا اہل مضبوط اور غیر تغیر پذیر قانون کہیں سے نہیں مل سکا۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی چھٹی سی سورۃ ”وَالْعَصْرِ“ اتنی جامع سورۃ ہے کہ ساری کائنات کی ہدایت کے لیے ہی کافی ہے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان اس

پر غور و فکر کر کے اس سے راہنمائی طلب کریں۔

الغرض! فرمایا اگر ہمارے نازل کردہ کلام میں تمہیں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ صرف یہی نہیں بلکہ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ اور اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنے گواہ بھی بلاؤ۔ یعنی خود بھی آجاؤ اور اپنے دیگر مددگار اور حمایتی بھی بلاؤ۔ مگر تم اس کلام جیسی ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکو گے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ یہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ یہ تمہاری مادری زبان ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسی تمہارے ماحول سے عربی زبان سیکھی ہے۔ آپ مکے میں رہے ہیں۔ یاد یا رہی بخیریں۔ یہ اسی علاقے کی زبان ہے اگر حضور علیہ السلام خود کلام بنا سکتے ہیں۔ تو پھر تم بھی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں عربی زبان اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اس انتہا پر پہنچنے کے بعد تنزل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مگر کسی شاعر نے قرآن پاک کی مثل لانے کی جرأت نہیں کی۔ جو بھی قرآن پاک کی کوئی آیت سنتا تھا۔ دم بخود رہ جاتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے بھائی حضرت امیرؓ کہتے تھے کہ میں شاعروں کا کلام بھی جانتا ہوں اور ساعروں کا بھی۔ اور کاہنوں کا بھی۔ میں نے کلام الہی کا ان سب کلاموں کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن پاک کا مقابل نہیں۔ خدا کا کلام تمام کلاموں سے منفرد اور ممتاز ہے۔

منکرین قرآن
کی سزا

قرآن پاک نے چیلنج پیش کرنے کے بعد پھر خود ہی اس کا جواب دیا فَإِنْ لَّمْ يَفْعَلُوا وَلَكِنْ تَفْعَلُوا پس اگر تم نہ کر سکو اور تمہرے گزند نہیں کر سکو گے۔ گویا پیشگوئی بھی کر دی کہ تم اس کلام کی مثل ہرگز پیش نہیں کر سکو گے۔ تو پھر خبردار فرمایا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُكِدَّتْ بِهَا النَّاسُ وَفُتُوهُهَا النَّاسُ وَالْجِبَارَةُ جس کا ایندھن ان اور پتھر ہیں۔ گویا دوزخ کی آگ میں اس کلام کے کندہین خود کفارہ جلیں گے۔ اور پتھر جلانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئلے سے جلانی گئی آگ سخت ہوتی ہے۔ اسی طرح پتھر سے جلنے والی آگ شدید تر

ہوگی۔ یا پھر سے مراد وہ پھر کے بُت ہیں۔ جن کی پوجا کی جاتی تھی۔ وہ بھی دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے۔ فرمایا یہ ایسی آگ ہے اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کفار لوگ اسی آگ کا ایندھن بنیں گے۔

ایمانداروں کے
لیے بشارت

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے ترمیم و ترغیب کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کفار کا انجام کا انجام بیان کرنے کے بعد ایمانداروں کے لیے بشارت سنائی زَكُتِ السَّيِّدِينَ اَمْسُوا وَاَعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنادیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کی رسالت پر ایمان لائے۔ کلام الہی کو سچا کلام تسلیم کیا۔ قیامت کو برحق جانا اور پھر اس کے ساتھ شائستہ کام بھی انجام دیے۔ یعنی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جیسے فرائض پورے کئے۔ صدقہ و خیرات کیا۔ حلال و حرام میں امتیاز روا رکھا۔ کہ اِنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ عَجْرِيٍّ مِنْ تَحْتِهَا اَلْاَنْهَارُ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے باغات تیار کر رکھے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

پھلوں میں
مشابہت

فَرَا كَلَّمَا رَزَقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رَزَقُوا بِهَا وَجِبَ وَهَ انْ بَشْتُوں مِی پھلوں سے روزی دیے جائیں گے قَالُوا هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ تو کہیں گے یہ تو وہی ہے۔ جو ہمیں اس سے پہلے دی گئی وَاَتَوْا بِهَا مُتَشَابِهًا اور وہ اس میں دیے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل۔ مقصد یہ کہ ایک دفعہ جنتیوں کو پھل پیش کیے جانے کے بعد جب دوسری دفعہ ان سے ملے جلتے پھل دیے جائیں گے، تو جنتی لوگ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں جو ہمیں اس سے پہلے دیے گئے تھے۔ مگر جب وہ انہیں کھائیں گے۔ تو ان کا ذائقہ پہلے پھلوں سے بالکل مختلف ہو گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے۔ کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہوں گے اور جنتی انہیں دیکھ کر دنیا کے پھلوں پر قیاس کریں گے مگر ان دونوں قسم کے پھلوں میں ذائقے کے اعتبار سے بڑا تفاوت ہو گا۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ پھلوں میں مشابہت کی ایک اور توجیہ یہ ہے۔ کہ فطرت سلیمہ رکھنے والے اس دنیا میں جب یہی اور اطاعت کے کام کرتے تھے

تو انیس لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جب بہشت میں انیس محسوس دیے جائیں گے تو وہ لوگ کہیں گے کہ ان میں وہی لذت پائی جاتی ہے۔ جو دنیا میں نیکی کرتے وقت حاصل ہوتی تھی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جنت کی زمین خالی ہے سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَوْلَا إِلاَّ اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہنا اس خالی زمین میں درخت لگانے کے مترادف ہے۔ جب کوئی مومن دل کی گہرائیوں سے الْحَمْدُ لِلَّهِ کہتا ہے۔ تو جنت میں اس کے لیے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ جب اس درخت کا پھل انیس میسر ہوگا۔ تو وہ کہیں گے کہ اس کا ذائقہ تو بالکل وہی ہے جیسا ذائقہ ہمیں دنیا میں نیکی کی توفیق پر حاصل ہوتا تھا۔ اسی نیکی کے صلے میں آج ہمیں جنت میں یہ نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں آرام و راحت کا جو بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ سب جنت میں حاصل ہوگا۔ خواہ وہ لباس کی صورت میں ہو خوراک کی صورت میں ہو یا اعلیٰ مقام کی صورت میں۔ ہر چیز وہاں حاصل ہوگی اور اسی کپھلوں کی مشابہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پاکیزہ بیویاں

جنتیوں کے ایک اور انعام کے متعلق فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان مادی نعمتوں کے علاوہ دوسرے مقام پر روحانی نعمتوں کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا مَا شِئْتُمْ اَنْفُسُكُمْ اس میں تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کے لیے تمہارا جی چاہے گا۔ جنت کی نعمتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ نہ ختم ہونے والی ہوں گی۔ دنیا میں کسی چیز کے میسر آجانے کے بعد بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ یہ کسی وقت ختم بھی سکتی ہے۔ یا ختم ہو سکتی ہے۔ مگر جنت کی نعمتیں دائمی ہوں گی۔ ان کے لیے زوال کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا اسی لیے فرمایا کہ جنتی لوگ کسی محدود عرصے کے لیے جنت کی نعمتوں سے مستغنیہ نہیں ہوں گے۔ بَلْكَ دَهُنٌ فِيهَا خَالِدُونَ اور وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے۔ اور ان کے انعامات میں اضافہ ہی ہوتا ہے گا۔

ان آیات میں قرآن پاک پر ایمان لانے والوں کا انجام بھی بیان فرما دیا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے حشر سے بھی اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْقِيَ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا
الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ
بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ
(۲۶) الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ
مُمُ الْخَاسِرُونَ (۲۷)

ترجمہ: • بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرما، اس بات سے کہ بیان کرے مثال ٹھہر
کی یا اس سے بڑی۔ بہر حال جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان
کے رب کی طرف سے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پس وہ کہتے ہیں۔ کیا ارادہ
کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ اللہ تعالیٰ تمہارے کہ ہے اس کے سبب سے
بہتوں کو اللہ بدایت دیتا ہے اس کے سبب سے بہتوں کو۔ اور نہیں تمہارے کرتا
اس کے سبب سے مگر فاسقوں کو (۲۶) وہ جو توڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
کے عہد کو اس کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو
اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ
نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۲۷)

گذشتہ سے پیوستہ پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت، صداقت اور اس کے منزل
من اللہ ہونے اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا تھا۔ اس سے پہلے توحید اور رد شرک
کے متعلق بیان تھا۔ لوگوں کے اس خیال کی تردید تھی کہ یہ قرآن خدا تعالیٰ کا کلام نہیں۔
بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا اپنا وضع کردہ ہے۔ اور پھر اس ضمن قرآن پاک کے چیلنج کا ذکر تھا۔ کہ اگر

تمیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔ تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لاؤ۔ اس کے ساتھ پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ قیامت تک تم اس قرآن کی مثل نہیں لاسکو گے لہذا یاد رکھو کہ جب ایسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ تو پھر اس کلام سے انکار کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم ایسی دوزخ میں ڈالے جاؤ گے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایمان والوں کو بذاتِ نعمتی کہ آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ اور ان کا انجام نہایت اچھا ہو گا۔

حقیر چیزوں
کی مثالیں

کفار قرآن پاک کے متعلق یہ اعتراض پیش کرتے تھے کہ اس میں بعض چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے شایان شان نہیں۔ کہیں مکھی کا ذکر ہے۔ اور کیسے مکھی کا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اس کا کلام بھی بہت اعلیٰ باتوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایک عام محاورہ ہے کَلَامُ الْمُلُوكِ مُنْكَرٌ الْكَلِمَ یعنی بادشاہوں کا کلام کلام ملام کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ اس میں مکھی۔ پھر جیسی اور حقیر چیزوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔

اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٰ اَنْ يَّعْزِزَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضُهُ فَمَا فَوْقَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان اور عظمت کے یہ ہرگز منافی نہیں کہ وہ پھر یا اس سے کسی بڑی چیز کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں انسانوں کے سمجھانے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ یہ تو بعض لوگوں کی عقل یا انکے عرف کی کمزوری کی دلیل ہے کہ وہ بعض حقیر چیزوں کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر حکمت کے اصول کے تحت ایسی چیزوں کے بیان کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی کسی سے خوفزدہ ہو کر یا کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی چیز کا بیان روکا جاسکتا ہے۔ حقیر چیزوں میں بڑے مفید پہلو بھی ہوتے ہیں قرآن پاک میں مکھیوں اور مکھی کا ذکر ہے۔ اور ان کی مثال سے بڑی مفید باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ لہذا ایسی مثالوں کے ترک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

اس قسم کی مثالیں اکثر حکما کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ خود عرب کہتے ہیں مَا الْبَقُوْ وَ شَحْمَةُ یعنی کیا پھر اور کیا اس کی چربی۔ اسی طرح مَا الْجُرْدُ اَوْ طَعْمُهُ یعنی کیا

ہم ہی اور کیا اس کا گوشت وغیرہ حضور علیہ السلام نے بھی تغیر حقیقت کے لیے مثال بیان فرمائی ہے۔
مسند احمد، ابن ماجہ اور ترمذی شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَزُنُّ عِنْدَ اللَّهِ
جَنَاحَ بُعُوضَةٍ مَا سَتَى كَافِرٌ مِّنْهَا قَطْرَةٌ أَبَدًا یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی
قدر و قیمت ایک مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک ٹھونٹ پانی بھی عطا نہ فرماتے۔
کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ یہ مچھر کی مثال آپ نے اس لیے بیان فرمائی کہ ساری دنیا کی قیمت
اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی نہیں جتنی مچھر کے ایک پر کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو کفار اس دنیا
میں آرام و عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کچھ نہیں۔ آخرت میں جہان
کا حساب کتاب پیش ہو گا۔ تو سخت سزا میں مبتلا ہوں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اُمّ سلیمؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت
کیا اور تمہیکے طور پر عرض کیا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَكْتُمُ حَيْثُ مِنَ الْحَقِّ يَعْنِي اللّٰهَ تَعَالٰی تو حق بات سے
نہیں شرماتے۔ میں آپ سے مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ کیا عورت کو بدخوابی ہو جائے تو اس پر
غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا نَعَمْ يَا اُمّ سُلَيْمٍ چہرہ اذّاك انت
المكآء ہاں جب مادہ خارج ہو جائے تو اس پر غسل آتا ہے۔ جس طرح مرد کو احتلام ہوتا ہے
اسی طرح عورت کو بھی بدخوابی ہوتی ہے۔ الغرض اس حدیث میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
حق بات کو ظاہر کرنے سے نہیں شرماتا۔

حیا کی مختلف قسمیں

حیا انسان کی اُس انحراری اور شکنجی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی شخص قبیح امور سے
باز آجاتا ہے۔ حیا انسانوں سے بھی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی
شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے۔ تو وہ چھپ کر کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے انسانوں سے حیا آتی ہے کہ اگر
وہ دیکھ لیں گے تو کیا ہو گا۔ خدا تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا۔ مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ اُس کی نظر سے
کوئی فعل پوشیدہ نہیں ہے۔ تو پھر ذرہ بھر بھی خوف خدا رکھنے والا شخص فعل قبیح کے ارتکاب کے
وقت اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا۔ اگرچہ کوئی دوسرا انسان اس کو نہ دیکھ رہا ہو۔

حیا کی ایک قسم حیا عبودیت ہے۔ ایک عابد و زاہد اپنی تمام قوی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر حسبہ انعامات کئے ہیں۔ اگر وہ ساری عمر بھی عبادت میں لگا دے یعنی پیدائش کے وقت ہی اللہ تعالیٰ اس کو فہم عطا کرے اہل کعبہ سے میں گرجے اور ساری عمر اسی ایک سجدہ میں گزار دے۔ اور وہیں اس کی موت آجائے۔ تو وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کرے گا کہ مولا کریم! میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حیا عبودیت اسی چیز کا نام ہے۔

حیا خود اپنے نفس سے بھی ہوتی ہے۔ جب اُسے کوئی شخص میٹھنے والا نہ ہو۔ تو بعض اوقات انسان خود اپنے جی میں شرم محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ میں کیڑا رہا ہوں اور کسے دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ نفس کی حیا ہے۔

حیا کی ایک قسم حیا کرم ہے۔ خود حضور بنی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے۔ کہ آپ نے بعض صحابہ کو کھانے پر بلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ لوگ وہیں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذرتی مگر آپ نے حیا کرم کی وجہ سے انہیں زبان مبارک سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ یہ لوگ بھی چلے جائیں۔ مگر وہ بیٹھے بے لود باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لے آئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ کہ سب بنی علیہ السلام کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے جاتے ہو۔ تو وہاں بیٹھ کر بات چیت میں وقت نہ گزارو۔ اللہ تعالیٰ کا نبی تو حیا کرم کی وجہ سے تمہیں نہیں کہتا۔ مگر تم خود ہی احساس کرو۔ اور کھانا کھا کر واپس چلے جایا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

ہدایت و گمراہی

فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس قسم کی مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ تو مومن اور کافر پر ان کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ایماندار لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ان کا بیان کرنا حکمت کے منافی نہیں۔ لہٰذا وہ اس سے بڑا نہیں مناتے وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا جن لوگوں نے کفر کیا فَيَقُولُونَ پس وہ کہتے ہیں مَا ذَا كَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ وہ لوگ طعن کرتے ہیں۔

اور بطور استہزاء اور تحقیر کے کہتے ہیں کہ ایسی معمولی چیزوں کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مہل ہوا۔ اگر مثال ہی بیان کرنا سہی تو کسی اعلیٰ چیز کی بیان کی ہوتی۔ مکھی اور مچھر کی مثال کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مثال کو معمولی چیز نہ سمجھو۔ کیونکہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض لوگوں کے ذہن میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ جلالہ نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتیں بلکہ وَيُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا ہے۔ جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، وہ حقیقت کو پہانتے ہیں۔ لہذا ہدایت دیتے ہو جاتے ہیں۔ فرمایا أَهُمَّ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ یعنی گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو فاسق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔ کوئی ایمانداروں منصف مزاج اور حق کا طالب گمراہ نہیں ہوتا۔

فاسق کا معنی

فاسق کا معنی خروج یا باہر نکلنا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں فَسَقَ الرَّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا عَلٰی اپنے پھلکے سے باہر آگیا یا کہتے ہیں فَسَقَتِ النَّوَّاةُ مِنَ الشَّمْرِ ٹھٹھلی کھجور سے باہر نکل گئی۔ اسی اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے۔ شریعت کے عرف میں فاسق دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے پہلے معنی میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کے دل میں ایمان موجود ہے۔ مگر وہ اطاعت کی بجائے صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسا شخص ممکن ہے۔ اور اس کے متعلق امید ہے۔ کہ اُسے آخرت میں شفاعت نصیب ہو جائے گی۔ اور وہ نجات پا جائے گا۔ کیونکہ بہر حال وہ مسلمان ہے۔ مگر نافرمان ہے وہ نماز کو فرض سمجھتا ہے مگر پڑھتا نہیں۔ زکوٰۃ کو فرض جان کر ادا نہیں کرتا۔ گویا نیکی کو صحیح سمجھتے ہوئے اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ شریعت کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے۔ دوسری قسم کا فاسق وہ ہے۔ جو کفر میں مد سے بڑھ جائے۔ سرکش ہو جائے۔ جیسا کہ اعتقادی منافقوں یا سخت کافروں کے متعلق فرمایا أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ان یہودیوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ جو بڑے سرکش، ضدی

اور نافرمان ہیں اور کفر میں بڑے پکے ہیں۔ فاسق کے یہ دونوں معنی قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں۔
 اس مقام پر بطور تشریح یوں کہہ سکتے ہیں کہ فاسق وہ ہیں جو قرآن پاک کی بیان کردہ
 مثالوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ جو شخص قرآن کے پروگرام کی خلاف ورزی کرتا ہے
 وہ فاسق ہے۔ قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے کہ: **الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ
 الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳﴾ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا
 أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾**
 نیز قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي** کا پروگرام تو یہ ہے
 مگر جو شخص اس کے خلاف کرے گا۔ وہ فاسقوں کی فہرست میں رکھا جائے گا۔

یہودی منافقین
 کی عمدگی

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تشریح کرتے ہوئے ان کی تین بڑی خصلتوں کا ذکر کیا
 ہے پہلی بات یہ ہے کہ **الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ**
 فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کو پختہ کرنے کے بعد۔ اگر وہ اشخاص منافق
 ہیں تو وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ: **أَمْسًا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ** ہم اللہ تعالیٰ اور
 آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ عہد کو پورا نہیں کرتے۔ عمل طور پر ان کا ایمان نہ اللہ تعالیٰ کی
 ذات پر ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔ اور اگر فاسقوں سے مراد یہود ہیں۔ تو ان سے تو پہلی کتابوں
 میں عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان لائیں گے۔ اور خاص طور پر نبی آخر الزماں
 پر ایمان لائیں گے۔ اس کا ساتھ دیں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔ نیز یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے
 ان پر جو ہدایت نازل فرمائی ہے۔ اُسے چھپائیں گے نہیں۔ بلکہ ظاہر کریں گے۔ مگر ان لوگوں نے
 اس عہد کو توڑ دیا۔ گویا فاسقوں کی پہلی خصلت یہ بیان فرمائی کہ وہ عہد کرنے کے بعد اُسکو توڑتے ہیں
 عمدگی لوگوں کا دوسرا گروہ معاند کافر ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا: **سَوَاءٌ
 عَلَيْهِمْ أُنْذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ** انہوں نے
 اللہ تعالیٰ کے اُس عہد کو توڑا جو نازل میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پرچھا تھا: **أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ**
 کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا: **بَلَىٰ** اے مولا کریم! کیوں نہیں
 بیشک تو ہمارا رب ہے۔ اس عہد کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے۔

کتا میں نازل کیں۔ مگر انہوں نے اس بختہ عہد کو توڑ دیا۔ لہذا یہ بھی عہد شکنوں کی صف میں شامل ہوئے
ایک عام مومن جب لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کہتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ
کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عہد کرتا ہے۔ ان کے احکام کو تسلیم کرنے اور
البدو کا رہنے کا عہد کرتا ہے۔ مگر جب وہ اُس کے خلاف چلتا ہے۔ مگر با عہد شکنی کرتا ہے۔ ایسا
شخص بھی فاسق یا منافق کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ عہد کی خلاف ورزی کرنا منافق کی واضح نشانی ہے۔

قطع رحمی

فاسقوں کی دوسری خصلت یہ بیان فرمائی وَ يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ
جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اُسے قطع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرابتوں
کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ اس کے برخلاف قطع رحمی کے مرتکب ہوتے ہیں جیسے
کافروں کے متعلق فرمایا کہ وہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ اور کسی مومن کے

بارہ میں نہ تو عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں اور نہ قرابت داری کو خاطر میں لاتے ہیں۔ بلکہ انہیں
ہر طرح سے ایذا پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ قطع رحمی بہت بڑا جرم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ
کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ میں بھی اُس کو
جوڑوں گا۔ اور جو قطع کرتا ہے۔ میں بھی اس کو کاٹ دوں گا۔

صلہ رحمی

اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ رحم یعنی قرابت داری کو اپنے نام رحم سے
نکالا ہے۔ اور رحم کا معنی بے حد مہربان ہے۔ لہذا ہر انسان کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت
مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ فرمایا وَ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ
یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور قرابتوں کا خیال رکھو۔ صلہ رحمی بہت بڑا عمل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
کو بہت پسند ہے۔ اس میں انسان کے تمام حقوق آجاتے ہیں۔ جن کی ادائیگی کا اللہ تعالیٰ نے
حکم دیا ہے۔ فرمایا آتِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ ہر حقدار کا حق ادا کر دو۔ یہی صلہ رحمی ہے۔

فدا فی الارض

منافقین کی تیسری خصلت یہ بیان فرمائی وَ يَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَ هُمْ مِنْ
فنا د پھیلاتے ہیں۔ فساد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور کافر لوگوں کو ایمان سے

متغیر بندے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اسی لیے تو وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں۔ کیونکہ اس میں مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ پراپیگنڈا ہے جس کی بدولت وہ لوگوں کو ایمان سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ کفر، شرک اور شریعہ کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے۔ کفر، شرک اور معاصی کی وجہ سے ایسی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں، شرک، بدعت، مانع گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں۔ قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے۔ اور فساد فی الارض ہے۔ تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جمعی کی بجائے اُس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اللہ وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ الغرض عمدہ شکنی، قطع رحمی، اور فساد فی الارض یہ تین بڑی خصلتیں ہیں جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

فاسقوں کی علامات بیان کرنے کے بعد فرمایا **أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ** فاسقین کی پہلی دنیا میں بھی ناکام ہیں۔ ناکام دنیا مرد ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خصلتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی ناکام ہیں۔ کیونکہ فساد فی الارض کی بدولت دنیا میں امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے ناکامی کا مزہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا **خَسِرَالْ دُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ** دنیا اور آخرت ہر دو جگہ کی ناکامی ہے۔ اور یہی بہت بڑی ناکامی ہے۔ ابتدائے سورۃ میں متقین کے متعلق فرمایا تھا **أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** یعنی یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی کامیاب ہیں۔ اس مقام پر فاسقین کے متعلق فرمایا **أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ** یہی لوگ ناکام ہیں۔

الْعَمَّ

درس چہارم ۱۴

البقرة ۲

(آیت ۲۸ تا ۲۹)

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ
 يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾
 هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَكَانَ الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ
 اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ
 بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

ترجمہ : کس طرح تم کفر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، حالانکہ تم بے جان
 پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے۔ پھر وہ تم کو دوبارہ
 زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹے جاؤ گے ﴿۲۸﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے
 جس نے پیدا کیا ہے۔ تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب۔ پھر وہ متوجہ ہوا آسمان
 کی طرف۔ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

اس سے پہلی آیات میں ان لوگوں کا رد فرمایا۔ جو قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا
 انکار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کلام میں کچھ مکمل جیسی حقیر چیزوں کا بیان ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ
 کی ذات اعلیٰ وارفع ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ یا اس سے
 بھی کم تر چیز کی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ کیونکہ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں
 ہوتی۔ بعض اوقات ادنیٰ چیزوں میں بھی اہم باتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی کسی چیز کے بیان سے
 اجتناب کرنا خلاف حکمت ہوتا ہے۔ معترضین کا اس قسم کا اعتراض ان کی نا سمجھی کی دلیل
 ہے۔ البتہ ایمان والے خوب سمجھتے ہیں۔ کہ قرآن پاک ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔
 نا سمجھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ
 نے فرمایا ایسی ہی مثال کے ذریعے وہ بتوں کو ہدایت سے نواز رہا ہے۔ اور بتوں کو گمراہ کر دیتا ہے
 مگر گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو مافرن ہوتے ہیں۔

گمراہی پر

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تین خصلتیں بیان فرمائیں۔ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑتے ہیں۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یہ لوگ انہیں توڑتے ہیں۔ لہذا یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ فرمایا یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ گویا قرآن کریم کا انکار، معاد کا انکار، راستہ کا انکار یا خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اور اس کی صفات کا انکار سب کا مالِ داغ و بھماکہ ہی ہے۔ ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کے
ساتھ کفر

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی بعض نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو مخاطب فرماتے ہیں۔ کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ یہ انعام پانے کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیسے انکار کرتے ہو۔ تمہارا انکار محض جہالت، ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہے ورنہ اس کے حق میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: وَمَنْ يَتَذَعُّ مَعَ اللّٰهِ الْهٰذَا اخْرُجْ لَابْرَهَانَ لَدَيْهِ فَاِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ يَعْنِيْ جَوْشَخُشِ اللّٰهِ تَعَالٰی کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے۔ یعنی شرک کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسا کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہذا اس کا حساب تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی بات بیاں پر بیان کی گئی ہے کہ تمہارے پاس کفر کرنے کی کون سی دلیل ہے کیفَ تَكْفُرُونَ تمہارے لیے کفر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں نہ صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کا بیان ہے۔ بلکہ اس میں ایمان لانے کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کیوں نہیں لاتے اس کے کلام کا کیسے انکار کرتے ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کو کیوں نہیں مانتے۔ اور معاد پر تمہارا ایمان کیوں نہیں ہے۔ گویا کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن کا کفار انکار کرتے تھے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ کا تعلق گزشتہ آیت یٰٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ کے ساتھ ہے

وہاں پر بھی بعض انعامات کا ذکر فرمایا۔ کہ اے لوگو! اُس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارے لیے زمین و آسمان کو پیدا کیا، پھر آسمان سے بھی پانی نازل کر کے زمین کو سیراب کیا اور تمہارے لیے پھل پیدا کیے۔ اس مقام پر موت و حیات اور زمین سے پیدا ہونے والی نعمتوں کا ذکر کر کے ایک دوسرے انداز سے بیان ہو رہا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو۔

برخلاف اس کے جو اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کو مانتا ہے۔ اور اُسی کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے سامنے معرفت الہی کی لاکھوں کروڑوں عقلی اور عقلی دلیلیں موجود ہیں۔ اُس کے اُس پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت انسان کے ذمے فرض ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَ اللّٰهُ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا** یعنی اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اُسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو نہ کریں۔

اہم البرصیفہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص سپاڑ کی چوٹی پر زنگ بسر کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے عقل و شعور جیسے اعلیٰ حواس سے نوازا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ کفر کرتا ہے۔ تو پکڑا جائے گا۔ اُسے معافی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ مشاہد قدرت کو دیکھنے کے باوجود اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا تو اس کی نصیبی ہے۔ گویا عقلی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کو پہچاننا واجب ہے۔ ایک شخص عملاً نماز نہیں پڑھتا یا روزہ نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان ہے۔ تو اُس کی بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر کفر کرنے کی صورت میں وہ قابلِ گرفت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمہیں عقل دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ تمہارے ارد گرد نشانیاں پھیلادیں۔ اس کے باوجود تم نے ایمان کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ لہٰذا تمہارا معاملہ ناقابلِ معافی ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ تم ان تمام دلائل کے باوجود **كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ** تم اللہ تعالیٰ

موت و حیات
الہی میں ہے

کے کفر کرتے ہو۔ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا عَالًا نَحْمُكُمْ بے جان تھے۔ فَاحْيَاكُمْ ہا پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ مطلب یہ کہ تم اپنے باپوں کی پشتوں میں بالکل بے جان چیز تھے۔ پھر اس نے تمہیں ماؤں کے رحموں میں قطرۂ آب یا لطف کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی بخشی اور تمہیں وجود جیسی نعمت عطا کی۔ گویا تمہیں نیستی سے ہستی میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آیا آئے گا۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا۔ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا۔ دیکھو یہ سب تصرف خدا تعالیٰ کا ہے۔ جو یہ کہتا ہے، موت بھی وہی طاری کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی مستصرف نہیں۔ نہ کوئی کچھ دے سکتا ہے۔ نہ کوئی چھین سکتا ہے۔ اسی بات کو سورۃ واقعہ میں اس طرح بیان فرمایا کہ دیکھو تم کیسے بے بس ہو۔ جب ہمارے کارندے آتے ہیں۔ تو کون ہے جو انہیں روک سکے بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے طاقتور عاجز آجاتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ تمام چیزوں کا تصرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مستصرف فی الامور وہی ہے۔ اور ایک ایماندار کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جاندار بنایا۔ وہی موت طاری کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔

فرمایا موت و حیات کی اس کشمکش کے بعد انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ وہ انسانی اعمال کا محاسبہ بھی کریگا ثُمَّ إِلَيْهِ تَرْجَعُونَ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو وجود کی نعمت دی۔ تمہاری پرورش کی اور تمہاری ضروریات و آسائش کے تمام سامان مہیا کیے۔ تمہارے جسم میں ہدایت کی مشیر کی نصب کی۔ علم حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہرہ باطنہ سے نوازا۔ قوت متینہ عطا کی۔ غور و فکر کے ذرائع بخشے۔ قوت حافظہ دی۔ جوڑ توڑ کرنے کی طاقت بخشی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی مہربانی یہ فرمائی کہ راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ انہیں بشیر اور منذر بنایا اور دوسری جگہ فرمایا وَ أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ ان کے ساتھ کتابیں نازل فرمائیں۔ وحی نازل کی شریعت دے کر بھیجا لیقوم الناس بالقسط تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ یہ شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔ اور کفر سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ سب سے

بڑے ظالم تو کافر ہیں۔ یہ تمام ہدایت سے کر محبت پوری کر دی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ انہیں کوئی سمجھانے والا نہیں آیا: لَيْسَ أَنْ يَكُونَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

میت دفن کرنے کے آداب

مشکوٰۃ میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے: لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقْتَرِبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ یعنی جو چیز جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے بچانے والی ہے وہ سب میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ اب تمہارے پاس انکار کی کیا دلیل ہے۔ موت و حیات اور تصرفات کے بنیادی عقائد بیان ہو گئے ہیں جن کی قرآن پاک میں تعلیم دی گئی ہے

فرمایا میت کو دفن کرتے وقت یوں کہو بِسْمِ اللّٰهِ وَحَلٰی مِلْكَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اور اسی طرح قبر پر مٹی ڈالتے وقت یہ آیت پڑھنی چاہیے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُفِئُكُمْ وَفِيْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی مگر لوگ اس کی بجائے زور زور سے کلمہ شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ کلمہ طیبہ بے شک افضل الذکر ہے۔ مگر اس مقام پر وہی کچھ کہنا چاہیے جسکی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اسی میں اس کو لوٹائیں گے۔ اور پھر اسی میں سے دوبارہ زندہ کر گئے ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔

تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں

انسان کی موت و حیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجماعی خاکہ پیش کیا ہوا اَلَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ غذا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو، آلات، نیک بختی اور کماں حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں۔ بعض چیزیں براہ راست انسانی مفاد میں ہیں۔ اور بعض بالواسطہ۔ حتیٰ کہ موزی جانور بھی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہر بھی تریاق کا کام دیتا ہے۔ کسی موسم میں انسان کھجوروں سے

۱۔ مشکوٰۃ ص ۵۲ بحوالہ شرح السنۃ والبیہقی فی شعب الایمان۔ ۲۔ ترمذی ص ۱۸ ابن ماجہ ص ۱۸

۳۔ متذکرہ ص ۱۸۔ ۴۔ متذکرہ ص ۱۹۔ ۵۔ احسن حصین ص ۲۹۲

تنگ آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں، انہیں مکھیاں ہی چاٹ جاتی ہیں یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں۔ کہ غلاظت کے خاتمے کا سبب بنتی ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی تخلیق والی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا۔ اور جمعہ کے روز نماز عصر کے بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب چیزیں پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ نوح انسانی کی مصلحت فرشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انسان کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے فرشتوں کو پیدا کیا۔ ان میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام اور ملائکہ اعلیٰ کے دوسرے فرشتے ہیں۔ ان میں مقرب فرشتے بھی ہیں ان میں ملائکہ سافل کے فرشتے اور فضائی اور ہوائی فرشتے بھی ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی مصلحت کے لیے ہیں۔ تاکہ انسان درجہ کمال تک پہنچ سکے۔

موت انسان
عبرت ہے

اللہ تعالیٰ نے موت کو پیدا کیا اور یہ ایک بڑی خطرناک چیز ہے۔ مگر اس میں بھی انسان کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔ یہ بھی فائدے سے خالی نہیں شیخ سعدیؒ نے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی ہے۔
_____ بادشاہ نر وزیر
خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بادشاہ کہنے لگا۔ کاش کہ اگر میں موت نہ لوے، چہ خوش بودے،
یعنی اگر یہ موت نہ ہوتی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری بادشاہت ہمیشہ قائم رہتی۔ نہ موت وارد ہوتی اور
نہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا۔ وزیر بڑا دانا آدمی تھا، کہنے لگا، اگر موت نہ لوے اس سلطنت تیرا کسے
یعنی اگر موت نہ ہوتی، تو یہ سلطنت تم تک کیسے پہنچتی۔ یہ موت ہی ہے جس کے ذریعے یہ بادشاہت
تم تک پہنچی ہے۔ ورنہ یہ تمہارے آباؤ اجداد تک ہی محدود رہتی۔ آگے نہ چلتی۔ مختصر یہ کہ موت
جیسی چیز بھی انسان کے لیے مفید ہے۔ کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر فقہائے کرام اور محدثین ایک اور مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اشیاء میں اصل
چیز اباحت ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا یعنی زمین کی تمام چیزیں تمہارے

لیے پیدا کیں۔ اصلاً تمام چیزیں مباح یعنی جائز ہیں۔ البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی۔ باقی سب جائز سمجھی جائے گی۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں۔ مگر جہاں حکم آگیا کہ خنزیر حرام ہے۔ مرد حرام ہے۔ یا فلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔ باقی سب جائز ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے کہ انہیں انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ضرر کوئی روحانی یا جسمانی قباحیت ہوگی۔ جس کی وجہ سے اُسے ناجائز قرار دیا گیا ہے وہ سب چیزیں مباح ہیں۔

یہاں پر ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اباحت کے اس اصول کو من وعن تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز ہر حالت میں مباح قرار پائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی ضابطہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر چیز کا ہر شخص مالک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قبضہ اور ملک کا قانون مقرر کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی حدود میں رہ کر کسی چیز کا قبضہ یا مالک ہو گا۔ کسی صاحبِ بیداد کی موت کے بعد ہر شخص اس کی جائیداد کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس جائیداد پر قبضہ کس کا ہے۔ وراثت کے طور پر اس کا کون حقدار ہے۔ عطیہ کے طور پر کسی کو ملی ہے یا نہیں۔ یا کسی اور قانون کے تحت اس کا کون حقدار ہے۔ یہ سب قانونِ شریعت میں موجود ہیں۔ اور انہیں کے مطابق حقوق کا تعین ہوگا۔ ہر شخص حقدار نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک عورت صرف ایک آدمی کے نکاح میں آ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ خاوند کی وفات یا طلاق کی صورت میں وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں جا سکتی ہے لہذا اباحت کے اس کلیے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

آسمانوں کی تخلیق

زمین کی تمام اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی چیزیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا فَاَنصَوٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ یعنی تہ در تہ سات آسمان پیدا فرمائے۔ اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے دبیز آسمان پیدا کئے ہیں۔ یونانی فطریات کے ماہرین آسمانوں کی تعداد دو بتاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ سات

آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل کر لیں تو فوج جاتے ہیں۔ کیونکہ عرش الہی ہے۔ اور کرسی الہی ہے۔ وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر ہیں اور ذاتِ خداوندی ان تمام چیزوں سے ورادوار ہے۔

خدا تعالیٰ کی تجلی عرش پر واقع ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ اُسے تجلی عظیم نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس تجلی سے اول سا عرش رنگین ہوتا ہے۔ پھر تمام کائنات رنگین ہوتی ہے اس کے نیچے تمام اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد وہ تجلی اس پلٹ جاتی ہے۔

فریاد: "ذُفِعَ بَعْضُ شَيْءٍ عَلَيَّ" یعنی وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اُس کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔ لہذا عبادت بھی اُسی کی کرنی چاہیے۔ جو عظیم کل اور قادر مطلق ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ جو قادر ہے۔ جو خالق اور رب ہے۔ اُس کے حور الہی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ فتنے کو جنت والا دہی ہے نہ محیط علم صرف خدا تعالیٰ کا ہے نہ جبرائیل علیہ السلام اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔ اس لیے معبود برحق بھی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر لوگوں نے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور نہ نقصان۔ نہ کوئی فریاد سن سکتا ہے۔ اور نہ کوئی جرمی بنا سکتا ہے۔ نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے۔ کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے۔ کیونکہ عظیم کل صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

عبادت الہی
روزمرہ ہے

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ" کے لیے کہ "وَهُوَ بَعْضُ شَيْءٍ عَلَيَّ" تک دو آیات کا تعلق "يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا" کے ساتھ ہے۔ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو۔ کہ یہ تمہارے لیے لازمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں وجود کی نعمت بخشی، زندگی دی، پھر موت کا طاری کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر اُس نے تمہیں زمین کی تمام نعمتیں مہیا کیں۔ دوسری جگہ فرمایا: کہ زمین کی تمام ہزیاں اور پھل پیدا کئے۔ اے

انسان متاء لکم و لا فکامکم یہ سب چیزیں تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ مویشی بھی تمہاری ہی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان پر سواری کرتے ہو۔ ان سے کھیتی باڑی میں مدد لیتے ہو۔ اور پھر ان کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ خَلَقَ الدُّنْيَا لَکُمْ وَخُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ اے انسان! یہ ساری دنیا ترے لیے پیدا کی ہے۔ اور تو آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اس کی معرفت حاصل کرو۔ اور اُسی کی عبادت کرو۔ وَمَخْلَقَتُ الْجَنَّةَ وَالْاِنْسَانَ لِنِعْمَتِ ذِی الْقُرْآنِ پاک شامد ہے کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق محض عبادت الہی کے لیے ہوئی۔

قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا۔ آسمان و خان (دھول) کی شکل میں تھا۔ پھر اس کو برابر کر دیا۔ زمین کا پھیلاؤ اس کے بعد ثل میں آیا۔ وَارْضَ بَعْدَ دَلَّتْ دَحْهًا زمین کا مادہ کثیف ہے۔ ام شاد دلی اللہ تعالیٰات الیہ میں فرماتے ہیں۔ کہ جس طرح زمین مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آسمان بھی کسی عناصر پر مشتمل ہے مگر آسمان کے عناصر زمین کی نسبت لطیف ہیں۔ اسی لیے وہاں شفافیت نظر آ رہی ہے۔ اور کوئی چیز جس قدر لطیف ہوگی، اسی قدر طاقتور ہوگی۔ دیکھئے روح لطیف چیز ہے۔ اس لیے اس میں قوت بھی زیادہ ہے۔ اور مقنی کوئی چیز کثیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے۔ الغرض فرمایا وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہر چیز کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیُفْسِدُ الْاَرْضَ مَآءً وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

توجہ دے اور اس وقت کو خیال میں لاؤ جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔ تحقیق میں زمین میں غیغہ بندنے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا کیا زمین میں ایسوں کو بندے گا جو اس میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے اور ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ تیری تعریف کے ساتھ اور تیری تزیینہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۝۳۰

اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے چار بنیادی مسائل یعنی توحید، رسالت ایمان بالقرآن اور معاد (قیامت) کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد قرآن و رسالت میں شک کرنے والے لوگوں کا رد فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن بے شمار انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا۔ جو اُس نے بنی ذریعہ انسان پر کئے۔ ان میں خصوصاً مادی انعامات کا بیان تھا۔ جس میں انسان کا اپنا وجود، زمین و آسمان کی تخلیق، زمین میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔ بالخصوص زمین سے نکلنے والے پانی کا ذکر تھا۔ جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں اسی سے نباتت پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی روزی کا ذریعہ ہے۔

مادی انعامات کے تذکرہ کے بعد اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُن روحانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم علیہ السلام کو عطا کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مسئلہ کو واضح کر دیا۔ مگر اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔

قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی کے بعد حشر و نشر کی منازل طے کر کے جنت میں پہنچیں گے۔ ان میں سے ہر شخص بادشاہ ہوگا۔ اس دنیا میں تو بادشاہی کروڑوں میں سے ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر جنت کے ہر باشندے کا اعزاز دنیا کے بادشاہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہر جنتی کو آرام و راحت کے لیے ایسے سامان میسر ہوں گے۔ جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں جنت میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہو جائے۔

تخلیق الہی سے
قبل کے ادوار

اس رکوع میں تخلیق آدم کا ذکر ہے، مگر پہلے کے ادوار کو ہم نہیں جانتے۔ کسی کو خواب میں بھی معلوم نہیں ہوا کہ آدم علیہ السلام سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "تفہیمات الہیہ" میں بیان کیا ہے۔ اور شاہ اسماعیل شہید

نے بھی اپنی کتاب "بعثات" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کسی حکیم انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف آدم علیہ السلام کے دور ہی کو ابتداء سے انتہا تک سمجھ لے۔ چہ جائیکہ کوئی شخص اس دور سے پہلے کے ادوار کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ حضرت مجتہد دلف ثانی، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے بعد امجد خود شاہ ولی اللہ اس امت کے آخری دور کے حکمہ میں سے ہیں۔ البتہ ان پہلے بڑے بڑے حکما گزرے ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفاسیر اور تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں امام ابن کثیر، بڑے پائے کے محدث، مفسر اور تاریخ دان ہوئے ہیں۔ آپ امام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ آپ کی تفسیر کی مشہور کتاب ابن کثیر ہے آپ نے بخاری شریف کی شرح اور اصول حدیث پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تاریخ کی کتب "البدایہ والنہایہ" نہایت مستند کتاب ہے۔ جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ابتداء سے لے کر اپنے دور تک تمام زمانوں کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب آپ نے روایت کے اعتبار سے ترتیب دی ہے۔ صحیح اور غلط روایت کی پڑتال کی ہے۔ اگرچہ ابن خلدون اور ابن جریر جیسے بڑے مؤرخوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اور ہزاروں تاریخ کی کتب موجود ہیں۔ مگر ان سب سے مستند ترین کتاب امام ابن کثیر کی ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے

اس زمین پر کسی دور گزر چکے تھے۔ مثلاً ایک قوم یا افراد کو جن کئے تھے، اس کے بعد جن کا دور گزرا۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل اس دنیا میں جنات کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے زمین میں فساد برپا کیے۔ جس طرح آج کل کی دنیا میں قتل و غارت گری ایک عام معمول ہے اس طرح اُس دور کے جنات میں بھی جنگ و جدل عام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کی سرکوبی کے لیے فرشتوں کو بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے جنات کو مار مار کر پیٹڑوں اور جزیروں میں بھگا دیا اور اس زمین کو صاف کیا۔ اس واقعہ کے دو ہزار سال بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

جنات کا ذکر تو قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ تاہم جن اور جن کے ادوار کا علم تاریخی روایات سے ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ حکماء نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اپنی کتابوں میں ان ادوار کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں کا مادہ تخلیق اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، فرشتوں، جنات اور شیاطین کو مختلف مادوں سے پیدا فرمایا۔ پھر ان مادوں کے عناصر بھی مختلف ہیں۔ فرشتے ایک خاص ذریعہ مادے سے پیدا کئے گئے ہیں۔ پھر ان فرشتوں کے مختلف درجات ہیں۔ امام شاہ دل اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ فرشتوں میں سب اعلیٰ درجہ ملا اعلیٰ کا ہے۔ یہ عالمیں عرش فرشتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر حَافِظِ حَوْلِ الْعَرْشِ والے فرشتے ہیں۔ یہ سب خلیفۃ القدس کے فرشتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے فرشتے پھر فضائی فرشتے، اس کے بعد ہوائی فرشتے اور ارضی فرشتے ہیں جو زمین پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ طائفہ کے فرشتے ہیں۔

حجۃ اللہ الباقی میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول درجے کے فرشتوں کا مادہ تخلیق اُس آگ کی مانند ہے جو دوران سفر طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئی۔ آپ اپنی زوجہ کے ہمراہ جا رہے تھے۔ بھیڑ بکریاں ساتھ تھیں۔ رات کا اندھیرا تھا۔ بیوی حاملہ تھی۔ اُن کو دردِ ذرہ شروع ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کو دُور سے آگ نظر آئی۔ آپ اُس طرف گئے۔ تو وہ آگ ایک درخت سے نکل رہی

مٹی۔ جو درخت کے پتوں کو جلانے کی بجائے انہیں سرسبز و شاداب کر رہی تھی۔ آگ جس قدر بھڑکتی تھی درخت کی شاخوں اور پتوں میں شادابی آتی تھی۔ یہ واقعہ کس قدر قرآن پاک میں موجود ہے۔ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آگ نہیں تھی بلکہ حجاب نوری یا ناری تھا۔ الغرض! فرشتوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے مادے سے کی۔ پھر اس میں مقدس رو میں ڈالیں۔ جس طرح انسانوں اور جنوں میں رو میں موجود ہیں۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی رو میں ہیں۔

جنات و شیاطین جنات کے مادہ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے: وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارٍ یعنی جنات کا مادہ تخلیق آگ اور ہوا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شیاطین کا مادہ تخلیق سنایت گند اور غلیظ ہوتا ہے۔ بالکل ضد اس کی مانند کہ جب وہ زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ تو اس سے بنجار اور بواٹھتی ہے۔ تو گویا جنات اور شیاطین کا مادہ آگ اور ہوا ہے۔ اس میں گیس برقی ہے۔ اور تپش کا مادہ بھی ہوتا ہے۔

انسان کا مادہ تخلیق انسان کا مادہ تخلیق خاک ہے۔ دنیا میں جتنے بھی خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ سب آدم کے وجود میں موجود ہیں۔ تخلیق انسانی کے متعلق قرآن پاک میں آیت ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ الْإِنْسَانِ كَالْعَصْرِ والی مٹی سے پیدا کیا۔ دو حکم مقامات پر تراب اور طین کا لفظ بھی آتا ہے۔ الغرض انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ اور یہ تخلیق باقی تخلیقات کی نسبت پیچیدہ ہے۔ اس میں تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس مقام پر تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا کہ تحقیق میں میں میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اُسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جائے۔ لہذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی سمجھا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا: يٰۤاٰدٰۤا۟ اٰنَا جَعَلْتُكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ یعنی اے داؤد! ہم نے آپ کو دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام
خلیفۃ اللہ ہیں

قرآن پاک میں خلیفہ دومعانی میں آتا ہے۔ پہلا معنی وہی ہے جو آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔ خَلَفَ يَخْلُفُ دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنْ خَلْفَتِهِ فِي الْأَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین یا خلیفہ بنایا۔ جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔

خلیفہ کا دوسرا معنی جو اس مقام پر واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا۔ انسان کے علاوہ باقی بے شمار مخلوقات بھی اس زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔ اور اس سے بھی مراد یہ ہے کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آدم علیہ السلام کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے۔ گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔ بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہو گا۔ اور انسان اس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا اور جس کو پورا فرمایا وہ یہی خلافت ہے: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيُخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

منہ خلافت
معنوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام، نظم خلافت ہے۔ دین میں ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اُسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ منتخب ہونا چاہیے۔ صرف ایک خارجی فرقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ حکومت اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے۔ یہ انارکسٹ لوگ ہیں۔ جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیرو کار خلیفہ یا حاکم دایم کو محسوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو

منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں۔ اور وہی اُسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو مخصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرامؓ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ خود حضور علیہ السلام کے دفن کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کا جہد اطہر بیت المقدس لے جایا جائے۔ کوئی مکہ معظمہ لے جانے کے حق میں تھا۔ تو اس کا فیصلہ بھی حضور علیہ السلام کے جلسہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا۔ انہوں نے کہا اے اللہ! اس معاملہ میں مجھ کو اذ کر۔ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ جس جگہ پر آپ کا وصال مبارک ہوا۔ اُسی جگہ پر آپ کو دفن کیا جائے گا۔ اس طرح یہ اہم معاملہ طے ہو گیا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم علیہ السلام نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں، خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی علیہ السلام نے اشارتاً یہ بات سمجھا دی **يَا أَيُّهَا النَّاسُ وَاللَّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ** یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابو بکرؓ کے سوا کوئی نہیں ہونا چاہیئے۔

انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا کہ عامۃ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب ہوا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ جو امت میں ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے اپنے آخری ایام میں حضرت عمرؓ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا۔ آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھ دینا۔ یہ گویا خلافت کا پروانہ تھا۔ حضرت عمرؓ

۱۔ شامل ترمذی ص ۶۰ ۲۔ شامل مع ترمذی ص ۶۰ ۳۔ مطبع نور محمد کراچی

۴۔ مسلم ص ۲۴۳ ۵۔ البدایہ والنہایہ ص ۱۸

امت میں بہترین آدمی تھے۔ ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شورعی قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔ یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان سے بڑے راضی تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔

خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص خود بخود غلبہ پا کر حکومت حاصل کرے۔ کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابل اطاعت ہے۔ ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔ تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اس کے احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔ اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی کہ خلافت کا حق بنی نوع انسان کو حاصل ہے۔ یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔
 الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا تو "قَالَ لَوْ أَتَجَعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاجَ"۔ یعنی فرشتوں نے کہا اے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے جو زمین میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ جواب کئی وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ اولیٰ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ بات انیس الہام کی جو جس کی بنا پر انسانوں نے یہ رائے دی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے جنات کے حالات پر قیاس کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ جنات نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ آدم کی اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فرشتوں نے خلیفہ کے لفظ سے یہ قیاس کیا کہ خلیفہ جب زمین پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ تو وہاں پر لازماً فتنہ و فساد اور خونریزی بھی ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یہ جواب دیا۔ تاہم زیادہ تر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ گمان جنات کے حالات کی بنا پر تھا۔

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا وَخَرَجُوا

نَسَبُ مُحَمَّدٍ مَوْلَانِیْمُ! اس فتنہ و فساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔ وَنُقَدِّسُ لَكَ اَدَّتِیْری پاكیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔

تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص والی چیزوں سے مبرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شریحوں سے پاک ہے۔

فرشتوں کا یہ جواب سُن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَالَ اِلٰی اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف و ولایت کیا ہے۔

الْعَمَّ

البقرة

درس شانزدہم ۱۶

آیت ۲۱ تا ۲۴

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَكِ فَقَالَ أَشِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۲۱﴾
 قَالُوا سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ
 الْحَكِيمُ ﴿۲۲﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ فَلَمَّا
 أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ
 غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ
 تَكْتُمُونَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ۱۶ اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھائیے۔ پھر پیش کیا ان کو فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ﴿۲۱﴾ انہوں نے کہا پاک ہے تیری ذات۔ نہیں ہے ہمارے پاس علم مگر وہ جو تو نے ہم کو سکھایا ہے۔ بیشک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ﴿۲۲﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! بتلاؤ اے ان کو ان چیزوں کے نام پس جب اُس نے ان کو ان چیزوں کے نام بتلا دیے تو فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو۔ اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جس کو تم چھپاتے ہو۔ ﴿۲۳﴾

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع ان کو وحدانیت اختیار کرنے اور اپنے خالق کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی پہچان کے سلسلے میں اُس کی صفات و کمالات کا ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو اُس نے نسل انسانی پر کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کیا "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَكِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے تذکرہ کیا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں

نے جواب میں کہا: اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا؟ کیا تو زمین میں ایسی ہستی کو بنائے گا جو فساد کریں گی اور خون بہائے گی۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ تیری حمد کے ساتھ۔ اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی بیشک میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔"

خلافت کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خلافت نیابت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کو بطور خلیفہ فرمایا ہے۔ تاکہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے فرائض انجام دے سکیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر شرعی قانون انسان کے ذریعے نافذ فرمایا ہے۔ اور انکو اپنی احکام یعنی وہ احکام جو انسانوں سے متعلق نہیں ہیں وہ قدرت کے مقرر کردہ دوسرے کارندے انجام دیتے ہیں۔

تخلیق آدم پر فرشتوں کا گمان کرنا کہ یہ زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اس کا بیان بھی ہو چکا۔ فرشتوں نے خیال کیا کہ خلیفہ کی ضرورت ہی ایسی جگہ پڑتی ہے۔ جہاں قتل و غارت اور خوریزی ہوگی۔ لہذا انہوں نے ایسا گمان کیا۔ یا پھر یہ وجہ تھی کہ انہوں نے انسانوں کو جنوں پر قیاس کیا۔ جو اس نسل سے پہلے اس زمین پر فتنہ و فساد برپا کر چکے تھے۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان سوال و جواب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کی حکمت کے اظہار کے لیے فرمایا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھائیے۔ ان ناموں سے کیا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کون سے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ تفسیر البیہود اور مذکور عربی زبان کی چار چار جلدوں کی مختصر تفسیریں ہیں۔ ان کے مؤلفین حنفی اہم تھے۔ وہ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ سے مراد تمام انواع و اجناس کے نام ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سکھائے۔ اس سے مراد ہر ہر فرد کا نام سکھانا نہیں۔ کیونکہ ہر ہر فرد اور جزو کا تعلق غیب سے ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ انواع و اجناس

آدم علیہ السلام کو
کئی چیزوں کے
نام سکھائے گئے

کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انسان ایک نوعی نام ہے۔ اس طرح اجناس میں سے جو ان ایک جنس ہے۔ اور پھر آگے اس کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً گھوڑے، بھینس، گائے، بھیڑ، بکریاں، کیڑے، مکوڑے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عَلَّمَ اَدْعَاہُ اَلْاَسْمَاءُ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے نام بتلا دیے۔ برخلاف اس کے شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ اسمائے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ ہیں نہ کہ بعض دوسری چیزوں کے نام بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اسماء سے مراد جزئیات ہیں۔ مگر تمام کی تمام اور ہر قسم کی جزئیات نہیں۔ بلکہ صرف وہ جزئیات مراد ہیں جن کی ضرورت تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ صرف انسانی ضروریات کی تمام چیزوں کے نام بتلا دیے۔ جو چیزیں انسانی ضرورت سے باہر ہیں۔ ان کے بتانے کا نہ کوئی فائدہ تھا۔ اور نہ ہی وہ بتائیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال سورۃ نمل میں آتی ہے کہ مَلِكًا سَاكُوًا وَ اُنْتِیْتُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۝ ہر چیز دی گئی تھی۔ تو یہاں پر ہر چیز سے مراد اس کی سلطنت کی ضروریات ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس زمانے میں ملک سب کے پاس فنیشنم طیارے اور راکٹ بھی موجود تھے۔ بلکہ ضرورت کی تمام اشیاء سے میسر تھیں۔ تو یہاں پر بھی اَلْاَسْمَاءُ مَلَكًا سے مراد انہی چیزوں کے نام ہیں جو انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔ اسی طرح سورۃ نمل میں شہد کی مکھیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ كُلِّي مِنْ كُلِّ الشَّجَرِ ۝ پھر تمام پھلوں سے کھاؤ اور شہد پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ایک پاکیزہ چیز رکھ دی ہے۔ اور اس کے پیٹ میں ایک لطیف قسم کا مادہ پیدا کر دیا ہے جس سے شہد بنتا ہے۔ تو یہاں پر تمام قسم کے پھل کھانے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا جہاں کا ہر اچھا بُرا کڑوا کھٹا پھل کھائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی ضرورت اور رسائی کے مطابق جتنے پھل میں مکھی اُن پر میٹھتی ہے۔ اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ شہد جیسی مفید چیز پیدا کرتا ہے۔ با دوام اور

افروٹ وغیرہ ایسے پھل ہیں۔ جن کے مغز تک رسائی ہی نہیں۔ تو ایسی چیزوں کے کھانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت اور شریعت میں یہ قانون رکھ دیا ہے۔ کہ وہ پاکیزہ چیزوں پر بیٹھتی ہے۔ گندی جگہ پر نہیں بیٹھتی ہے۔ مشاہدے سے معلوم ہوا ہے۔ کہ اگر شہد کی مکھی فلاطت والی جگہ پر بیٹھ جائے۔ اور اس کا پتہ چل جائے۔ تو مکھیوں کی ملکہ کے پاس شکایت پیش ہوتی ہے۔ اور ایسی مکھی کو سزائے موت تک مے دی جاتی ہے۔

پھلوں میں بھی بعض کڑوے پھل ہوتے ہیں۔ مگر مکھی وہاں سے مادہ حاصل کرنے کی پابند نہیں ہے۔ اسی طرح بعض پھول بھی بدبودار ہوتے ہیں۔ جو شہد کے لیے ناموافق ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہوتے وہ بھی پھول ہی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس قسم کے پھل یا پھول سے مکھی رس چوسے گی۔ شہد کا ذائقہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ مثلاً کجھور پر بیٹھے گی تو وہ ذائقہ حاصل کرے گی اور انگوڑی کی شاخ پر جائے گی۔ تو ایسی مثالیں حاصل کرے گی۔ مقصد یہ ہے کہ مکھی کے ہر پھل اور پھول چوسنے سے مراد صرف وہ پھل اور پھول ہیں۔ جو اس کی شہد کی ضرورت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا سِرًّا لِّهِمَا سِرًّا لِّلْآدَمِیَّةِ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ طُهْرًا لِّلْبَشَرِ نَجَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ

ایمان بیکر صاحبؒ اور بعض مدسکٹر مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ چیزوں کے نام سکھانا بائبل میں یحییٰ بن جبریل علیہ السلام کی طبیعت اور مزاج میں بطور صلاحیت ان چیزوں کے نام رکھ دیئے تھے۔ اور پھر جب فرشتوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو آدم علیہ السلام نے تمام نام بتلا دیئے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ چیزوں کے نام بطور تعلیم سکھائے گئے۔ جیسے کسی چیز کی وضاحت کی جاتی ہے۔ کہ یہ فلاں چیز ہے اس کی خاصیت یہ ہے۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ بِالصُّوَابِ۔

۲۰ تفسیر این کثیر ص ۴۷، تفسیر عمر نیری فارسی ص ۱۹، پرده م.

۴۵
۱۹۰

۳۰ تفسیر بیضدی ص ۴۶ تفسیر من المعانی ص ۲۲ ۳۱ تفسیر ان کثیر ص ۴۳ تفسیر کبیر ص ۱۶۹

آدم علیہ السلام کو تمام ضروری اشیاء کے نام کھلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آزمایا۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کر دیں ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں کو حکم دیا اِنْبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ مجھے ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اے فرشتو! تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ انہی مخلوق کے پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ تم میری تسبیح و تہلیل بیان کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور یہ مخلوق تو دنیا میں خویزی کرے گی۔ مگر تم نہیں جانتے کہ انسان کون سے کمالات کا حامل ہوگا۔ مجھ ان کے علم و فہم کا کمال سب سے اعلیٰ ہے۔ جو اے دیا گیا ہے۔ اور خلیفہ کے لیے ان چیزوں کی مابیت اور حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ جن پر اُس نے احکام کا نفاذ کرنا ہے۔ مثلاً اگر خلیفہ کو شراب کی خاصیت کا ہی علم نہ ہو کہ یہ کس طرح انسانی عقل کو مآوٹ کرتی ہے۔ اور یہ کن نقصانات کی وجہ سے ام الجائش کھلاتی ہے۔ تو خلیفہ شراب کے ریا کو سزا کیسے دے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری چیزوں کے نام ان کی حقیقت اور مابیت سے آدم علیہ السلام کو آگاہ کر دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ كُنْے لَگے اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے لَاۤ اَعْلَمُوْا لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ان چیزوں کے اسماء ان کی خاصیت اور مابیت کا علم نہیں ہے۔ ہم اس معاملہ میں عاجز ہیں۔ ہمارا علم تو اسی قدر ہے جس قدر تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتلادیا تھا کہ آدم میں ہمیت اور ملکیت دونوں خواص ہوں گے۔ مگر فرشتوں کی نگاہ صرف ہمیت تک ہی پہنچی۔ آدم کی ملکیت تک نہ گئی۔ چنانچہ اس کمال کو واضح کرنے کے لیے علمی صلاحیت پیش کی۔ تب فرشتوں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ کہ ہمارے پاس یہ کمال نہیں ہے۔

ہیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے عطا کیا۔ ہاں جس ہستی کے پاس علم و فہم کا یہ خزانہ ہو گا۔ خلافت کے لائق وہی ہوگی۔ اور وہی ہستی قانون خداوندی کو نافذ کر سکے گی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علم فرشتوں کو عطا ہی نہیں کیا تو ان کے امتحان کا کیا مطلب؟ اگر آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں کو بھی وہ علم سکھلایا جاتا تو وہ بھی جواب دے دیتے۔ اس کے جواب میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو آسمان کی تعلیم فرشتوں کی موجودگی میں ہی دی گئی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ لہذا انہوں نے ان کے نام ذہن میں محفوظ کر لیے۔ مگر فرشتوں کو چونکہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی لہذا انہوں نے یہ نام ذہن نشین رکھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی استاد پورنی کلاس کے سامنے پچھڑے سبق کی پوری پوری وضاحت کر دے۔ مگر بتا رہا ہے کہ امتحان کے وقت بعض طالب علم ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں۔ مگر بعض کو کچھ یاد نہیں ہوتا۔ حالانکہ استاد نے سب کو بیک وقت ایک ہی پچھر دیا تھا۔ یہی حال آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا ہوا۔ آدم علیہ السلام نے حسب حال ہونے کی بناء پر ان چیزوں کے نام یاد کر لیے اور بوقت امتحان بتا دیے۔ مگر فرشتے اس سبق کو ضبط نہ کر سکے لہذا انہوں نے امتحان کے وقت عاجزی کا اظہار کر دیا۔

الغرض! جب فرشتے اس امتحان میں ناکام ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ فرمائیے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتا دے۔ چنانچہ فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ جب آدم علیہ السلام نے ان کو ان چیزوں کے نام بتا دیے۔ کہ یہ بٹریا ہے۔ اس میں سالن پکایا جاتا ہے۔ یہ تو اسے اس پر دہلی پکائی جاتی ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس قدر امتحانی سوال کیے۔ آدم علیہ السلام نے فر فر جواب دے دیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ كَيْۤا مِیۡنَۤیۡنَۤیۡ نَیۡسَۤیۡنَۤیۡ نَیۡسَۤیۡنَۤیۡ کہ تم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ان کے غیب السموات والارض میں آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہوں۔

آدم علیہ السلام
کی کامیابی

یہاں آسمان و زمین کے غیوب کا تعلق مخلوق کے اعتبار سے ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی کوئی چیز غائب ہے۔ اس کے لیے تو کوئی چیز بھی پس پردہ نہیں۔ البتہ مخلوق کے لیے بعض چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور بعض پوشیدہ۔ دوسری جگہ ہے ”وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ“ تیرے رب کے تو ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس پر تو ہر چیز عیاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عالم الغیب والشہادۃ اس لیے بولا جاتا ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ جو مخلوق کے اعتبار سے پوشیدہ ہے یا ظاہر ہے۔ یہاں پر بھی اِنِّیْ عَلَّمَ غَيْبِ السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو جانتا ہوں، جو مخلوق یعنی انسان، جن اور فرشتوں کے اعتبار سے خواہ پوشیدہ ہیں یا ظاہر ہیں۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کی صلاحیت اور ان کے کمال کو بھی جانتا ہوں۔ اے فرشتو! تماری نظر تو آدم علیہ السلام کی ہیئت تک ہی پہنچی ہے اور اسی سے تم نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ یہ فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اور خونریزی کا مرتکب ہو گا۔ یا تم نے جات پر قیاس کر کے کہہ دیا ہے کہ آدم زمین میں لڑائی جھگڑے کا موجب بنے گا۔ تمہاری نظر اس کے کمال تک پہنچ جاتی تو یہ گمان نہ کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ اے مولا کریم! ہم تیری تسبیح و تہلیل بیان کرنے والے ہیں لہذا اگر زمین میں نیابت کی ضرورت ہے۔ تو ہم حاضر ہیں۔

اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہر اُس چیز کو جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو۔ اے فرشتو! شاید تمہارا خیال ہو کہ جو صلاحیت ہم میں دہائی جاتی ہے۔ وہ آدم میں نہ پائی جاتی ہو۔ مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے آدم میں وہ کمال رکھ دیا ہے۔ جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔ لہذا نیابت کا حقدار آدم علیہ السلام ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا ”وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ“ اے فرشتو! میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بزرگی اور فضیلت کو عملی طور پر فرشتوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا بیان ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ
اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝۲۴ وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ
اَسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ
شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الصّٰمِیْنَ
۝۲۵ فَازْلٰهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا
فِیْهِۦ ۝ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ
فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝۲۶

ترجمہ : اور اس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب کہا ہم نے فرشتوں سے
سجدہ کرو آدم کے لیے پس سجدہ کیا انہوں نے۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر
کیا اور وہ کفر کرنے والوں میں سے تھا ۝۲۴ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری
بیوی جنت میں رہو۔ اور تم دونوں اس میں سے وسعت اور کثافت کی سے کھاؤ۔
جہاں سے بھی چاہو۔ اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا پس ہو جاؤ گے
تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ۝۲۵ پس پھلایا اُن دونوں کو شیطن نے
اُس سے۔ پس اُن کو اُس نعمت سے نکالا جس کے اندر وہ تھے اور ہم نے کہا اتر
جاؤ بعض تمہارے بعض کے لیے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا

ہے۔ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانے کی بات ہے ۝۲۶

فرشتوں کی
سجدہ ریزی
حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت عطا کرنے پر فرشتوں کو آپ کی نفیست کا علم ہو
گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم فرمائی۔ تاکہ ان کی نیابت واضح ہو جائے۔
تو فرشتوں کو حکم ہوا۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ کہ آدم علیہ السلام کے
لیے سجدہ کرو۔ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ مگر ابلیس نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

مفسرین کرام نے اس مسئلہ میں بڑی بحث کی ہے کہ جو سجدہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے
آدم علیہ السلام کے لیے کرایا، وہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ انتہائی درجے کی عاجزی اور تواضع
کے ساتھ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا سجدہ کہلاتا ہے۔ اور اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً اگر پیشانی
معبود برحق کے حق کو ادا کرنے کے لیے جھکا کر ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کرنا ہر دور اور ہر
شریعت میں حرام باطل، کفر اور شرک رہا ہے۔ اور ایسے سجدہ کو سجدہ عبادت کہتے ہیں۔ البتہ
سجدہ تحیہ و تحکیم جو محض عزت و اعزاز کے لیے کیا جائے۔ یا جو سلام کے وقت کیا جائے۔ یا
سجدہ پہلی شریعتوں میں رواجاً۔ مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ سجدہ
کرنا بھی عرام قرار دیا گیا ہے۔ جو سجدہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام سے رد کر دیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا
یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جو ہر شریعت میں حرام رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی کے درمیان فرق صرف نیت سے ہی
ممکن ہے۔ اگر بوقت سجدہ نیت یہ ہے کہ یہ وہی سجدہ ہے جو حق تعالیٰ کے سامنے ہوا ہے
تو پھر ایسا سجدہ غیر اللہ کے سامنے کفر اور شرک ہوگا۔ اور اگر سجدہ محض تعظیم و تحکیم کے لیے ہے
تو یہ پہلی امتوں میں جائز تھا۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ یا فرشتوں
کا آدم علیہ السلام کو سجدہ۔ مگر ہماری شریعت میں ہر قسم کا سجدہ ناجائز ہے۔ خواہ وہ تعظیمی ہو یا عبادتی
ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی خیر کے سامنے سجدہ منع ہے۔ ترمذی شریعت کی روایت میں حضور
علیہ السلام کا فرمان ہے لَوْ كُنْتُ أَفْرَاحًا لَأَرْتِ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا
یعنی اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کے سامنے سجدہ کرے
کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کا بڑا حق رکھا ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتے ہیں لَا يَصْلَحُ
لِبَشَرٍ أَنْ يَسْجُدَ لِبَشَرٍ یعنی کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو
سجدہ کرے۔ ایک صحابی نے حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! ہم ہر

جا کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم آپ کے سامنے کیوں سجدہ نہ کریں۔ حضور علیہ السلام نے منع فرما دیا اور کہا کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ تو کیا تم میری قبر پر سجدہ کر دو گے۔ تو اس شخص نے کہا حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا جس طرح میری قبر پر سجدہ حرام ہے۔ اسی طرح میرے سامنے سجدہ گونا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیماً ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے قبر کو سجدہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس سجدے مراد وہی سجدہ ہے جو بندے اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔ تو تمام صحیحہ کرامؒ ائمہ دین، علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

فرشتوں کے سجدہ کی بعض توجہات

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو سجدہ بمنزلہ قبلہ کے تھا۔ یعنی حقیقت میں سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام محض حبست تھے۔ جن کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم آج بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اور اس سے مراد قبلہ کو سجدہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں نے بھی آدم علیہ السلام کی طرف منہ محض قبلہ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ سجدہ آدم علیہ السلام کو نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ لا اذم کال سبی ہے۔ یعنی حکم یہ تھا کہ حق تعالیٰ کو سجدہ کرو۔ آدم علیہ السلام کی وجہ اور سبب سے اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اس سجدہ میں دونوں ہاتھ

۱۔ بوداؤد ۲۹۱ ۲۔ بیان القرآن ۳۔ ابن کثیر ۴۔ منثور ۵۔

۶۔ تفسیر مظہری ۷۔ ابن کثیر ۸۔ معالم التنزیل ۹۔

پائی جاتی ہیں۔ یعنی سجدہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کے لیے تھا۔ اور تعظیم و تکریم آدم علیہ السلام کے لیے تھی۔
گویا یہ خلافت کا تعظیمی سجدہ تھا۔

سجدہ خلافت یا سجدہ تعظیمی میں سجود الیہ عینی یا مجازی ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نذوقی فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت میں سجود الیہ بالذات ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبید اللہ ندوی مفسر قرآن کی توجیہ یہ ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی اس زبردست تجلی کو سجدہ کیا تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ یہی توجیہ مولانا نذوقی نے خانہ کعبہ کے متعلق اس وقت کی تھی جب ایک ہندو دیانند سرسوتی نے اعتراض پیش کیا تھا۔ اس کا کنایہ تھا کہ اگر ہندو پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ تو مسلمان بھی پتھروں سے بنی ہوئی دیواروں والے مکان یعنی خانہ کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ پھر ہندو اور مسلمان میں فرق کیا ہوا؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نذوقی نے فرمایا تھا کہ مسلمان اس مکان کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اس تجلی الہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جو اس گھر پر پڑتی ہے۔ چونکہ یہ تجلی عظیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا مسلمان پتھر کی دیواروں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کو کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی وقت خدا نخواستہ بیت اللہ شریف کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں اور بظاہر دہاں کوئی چیز باقی نہ رہے تو بھی مسلمان اسی جہت میں سجدہ ریز ہوں گے۔ برخلاف اس کے ہندو اسی طرف سجدہ کریں گے۔ جس طرف ان کا بت رکھا ہوا ہوگا۔ لہذا معلوم ہوا کہ بت کے سامنے سجدہ کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تو فَسَجَدُوا سب نے سجدہ کیا اِلَّا ابلیسُ سوائے ابلیس کے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو دیا تھا۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ابلیس کے انکار کا کیا مطلب؟ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سجدے کا حکم نہ صرف ملائکہ کو تھا، بلکہ جنات کو بھی تھا۔ اور ابلیس جنات میں سے ہے۔ بلکہ ابوالجنات تھا۔ اور جب کسی بڑے کو کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ تو

ابلیس کا

اس کے ماتحت والے خود بخود اس حکم کے پابند ہو جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق آتا ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ۚ اذْ اَمَرْتُكَ ۚ جب میں نے تمہیں حکم دیا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے کا حکم ابلیس کو بھی ہوا تھا۔ اور نسلی طور پر یہ جنات میں سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں ۱۰ کَانَ مِنْ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهِ ۚ وہ جنوں میں سے تھا۔ پس اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا۔ مقصد یہ کہ سجدہ کا حکم فرشتوں اور جنات دونوں الزام کو نہ ہوا تھا۔ فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس اور اس کی قوم نے انکار کیا۔

حضرت یحییٰٰ مینیریؒ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اور بڑے پائے کے عالم اور بزرگ تھے انہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ابلیس نے سات لاکھ سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی۔ مگر ایک حکم کی سربانی پر مردود ہو گیا۔ اور اتنے لمبے عرصے کی عبادت برباد ہو گئی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ محدث ابن ابی الدنیل نے اپنی کتاب مکایہ الشیطان میں ایک روایت بیان کی ہے۔ مکایہ الشیطان کا مطلب ہے۔ شیطان کی مکاریاں تو وہ فرماتے ہیں کہ کسی موقع پر ابلیس کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہو گئی۔ ابلیس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پاس میری سفارش کریں۔ وہ میری توبہ قبول کر لے۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کا وعدہ کیا۔ اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ اُدھر سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوا کہ میں ابلیس کی توبہ اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہوں کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو یہ شرط پیش کی تو کہنے لگا کہ زندگی میں تو میں نے آدم کو سجدہ کیا اب اُس کی قبر کو سجدہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ابلیس اپنی بات پر پکا تھا۔ اس نے انکار کیا۔ اَبٰی وَاَسْتَکْبَرُوْا کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ نہ صرف انکار کیا بلکہ تکبر بھی کیا۔ اور تھا انکار کرنے والوں میں۔

میاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو کہ آجکل کے بعض

مرید پست پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مشرک کا فعل ہے۔ اگر نیت عبادت کی تھی۔ تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔ اور اگر عبادت کی نیت نہ تھی، محض تعظیم مقصود تھی۔ تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرک ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور جو ایسا کرتا ہے اس کو روکنا چاہیے۔

حسد ولین
نہا مہ

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ابن منذرؒ نے عبادۃ بن ابی امیہؓ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ اس کائنات میں سب سے پیداگناہ حسد تھا۔ جو ابلیس نے آدم علیہ السلام پر کیا۔ اور کہا "أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں۔ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کوٹی سے۔ لہذا میں اس سے افضل ہوں۔ میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔ یہی ابلیس کی بھول تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر نگاہ نہ ڈالی۔ لہذا مردود مٹھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ ابلیس نے حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام
اور حضرت حوا جنت میں

انکار ابلیس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ حضرت حواؓ کی تخلیق کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا آدم علیہ السلام کی دشت کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کی پسیوں سے اُن کا جوڑا پیدا فرمایا۔ اور آبِ حیات حوٹسے مانوس ہو گئے۔ اس لیے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ وَلَا مِّنْهَا رِجْدٌ حَيْثُ شِئْتُمَا اور تم اس میں سے کشدگی کے ساتھ کھاؤ۔ جہاں سے چاہو۔

اس جنت کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ جس جنت میں آدم علیہ السلام اور حضرت حواؓ کو بسنے کا حکم ہوا۔ ۶۰ عالم بالا میں جَنَّةُ الْعَاوِنِ ہے جس کا ذکر قرآن پاک کے دوسرے مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ نجم

میں موجود ہے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی جو کہ سدۃ المنتہی کے قریب ہے عِنْدَ هَاجَتِهِ
الْمَاوٰی یہ عالم بالا ہی کے متعلق ہے۔

شجر ممنوعہ

جنت میں سکونت اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حوا کو رحم بھی دیا۔
کہ جہاں سے جتنا جی چاہے کھاؤ مگر وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ اس درخت کے قریب
نہ جانا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِیْنَ تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ
گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی۔

یہ کون سا درخت تھا جس کی مقاربت سے منع فرمایا گیا۔ اس کے متعلق مفسرین کرام کے
کئی اقوال ہیں۔ بعض اسے کھجور کا درخت بتاتے ہیں بعض انجیر کا اور بعض انور کا۔ بائبل کی
روایت کے مطابق یہ نیچی اور بدی کی پہچان کا درخت تھا اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ
آدم علیہ السلام اور حوا کے ملاپ یعنی مباشرت کو درخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس لحاظ
سے پیدا ہونے والی اولاد کو پھیل کھا گیا ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ شجر ممنوعہ گندم کا درخت تھا۔ مگر یہاں یہ اعتراض وارد
ہوتا ہے کہ گندم کا درخت نہیں بلکہ چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس اعتراض کا جواب بھی
دیا ہے، فرماتے ہیں کہ شاعر لوگ لطیفے کی زبان میں کہتے ہیں۔

۔ بخور نان جوار می گر جوار اللہ می خواہی کہ گندم کو آدم را بیرون از جنتہ الماوانی
اگر اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے ہو۔ تو جوار کی روٹی کھاؤ۔ جو قد سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گندم گرم
ہوتی ہے۔ اگر اس کی روٹی کھاؤ گے تو اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا۔ مولانا رومی
بھی فرماتے ہیں ۔ این عشق نیست این فساد گندم است۔ یہ عشق نہیں ہے
بلکہ گندم کی گرمی کا اثر ہے۔ اور یہ اسی کا برپا کردہ فساد ہے۔ غرضیکہ گندم کے اس درخت
کو دنیا کے گندم کے درخت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

اب البرادود نے خود اپنا مشابہہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے مصر میں آنا بڑے سنگرہ دیکھا۔ جسے

دو بچے کر کے بڑی مشکل سے اونٹ پر لا دیا۔ اگر اس دنیا میں آنا بڑا سنگڑہ ہو سکتا ہے۔ تو جنت میں گندم کا درخت آنا بڑا کیوں نہیں ہو سکتا۔ امام ابو داؤد نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے دس ہاتھ لبا کھیرا دیکھا ہے۔ یہ ترکی قسم کا کھیرا جو موسم گرما میں ہوتا ہے۔ اور بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزل کے وقت انار کے دانے اتنے بڑے بڑے ہوں گے کہ ایک دانے کے نصف خول سے آنا بڑا خیمہ بن سیکے گا۔ جس کے نیچے دس بیس آدمی بٹھ سکیں۔ بہر حال یہ اعتراض معقول نہیں ہے۔ کہ گندم کا پودا ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ جنت میں گندم کا بہت بڑا درخت ہو۔ جس کے قریب جانے یا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔

شیطانی دوسرے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدم علیہ السلام اور حضرت عوا جنت میں بہنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ ابھی ان میں یہ سمیت کا مادہ نہیں ابھرا تھا۔ کہ شیطان نے آیت دوسرے ڈان شروع کیا۔ فَازْلِهْكَ الشَّيْطَانُ عَنْكَ ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ فَذَنُوسَ لَهُمَ الشَّيْطَانُ شیطان نے دونوں میں دوسرے ڈالا۔ کس چیز کے متعلق دوسرے ڈالا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ درخت کا پھل کھانے کے متعلق دوسرے ڈان۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ شیطان نے کہا کہ اس کو کھا لو گے تو ہمیشہ جہنم کے لیے یہاں رہ جاؤ گے۔ اور کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو گا۔

بعض کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دوسرے دل کے اندر ہی ڈالا جائے۔ کوئی فعل سرزد کرنے سے بھی دوسرے انداز ہی ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان ایک جنیہ کو پکڑ کر لایا۔ اور جنت کے دروازے پر اس سے مباشرت کی جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ تو ان کے دل میں بھی ویسا ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت حوا کے ساتھ مقاربت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت کا لباس اتر گیا۔ اور وہ دونوں برہنہ ہو گئے۔

شیطان کی دوسری اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دوسری اندازی نے فَاَخْرَجَهُمَا مَعَكَانًا فِيْهِ
 ان دونوں کو اس جگہ یعنی جنت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوا
 ہم نے کہا اتر جاؤ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا
 دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مَسْقَرٌ اور زمین میں تمہارے
 لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پر ہوگی۔ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِينٍ اور ایک مدت
 تک لَا مَدَدَ اَعْنَانَا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ
 کر کہیں فضاؤں یا مہندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پر ہی کرو گے۔
 آج کے دور میں جو پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہم زمین پر مستقل طور پر نہیں رہیں گے۔ بلکہ چاند،
 مریخ یا دوسری سیاروں میں چلے جائیں گے۔ تو یہ محض شیطانی پراپیگنڈا ہے۔ چاند ہماری زمین سے
 قریب ترین سیارہ ہے۔ اور اس کا فاصلہ اڑھائی لاکھ میل ہے۔ مریخ تو یہاں سے پچاس کروڑ
 میل دور ہے۔ اور دوسری سیارے اس سے بھی دور ہیں۔ فرض کر لیا کہ چاند پر رہائش کا بندوبست
 ہو جاتا ہے۔ وہاں ہوٹل قائم ہو جاتے ہیں۔ تو سائنس دانوں کا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ایک پونڈ
 غذا کو چاند پر پہنچانے کے لیے تیس ہزار پونڈ خرچ ہوں گے۔ وہاں پہنچنے کا خصوصی لباس چار لاکھ
 روپے میں تیار ہوگا۔ یہ لباس تو راستے میں ہی جل جائے گا۔

زمین ہی اصل
 ٹھکانا ہے

چاند پر تو ایسی لباس پہنا ہوگا، وہاں کی گرمی
 کی مقدار تقریباً چالیس ہزار سنی ڈگری ہے۔ جہاں پر پانی تو کھاتا نہ بھی پگھلنے لگتا ہے۔ پاند کے
 ایک طرف گرمی ہے۔ اور دوسری طرف اتنی سردی ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔
 لہذا ایسی جگہ پر رہنے کے لیے اتنا قیمتی لباس تیار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ خوراک اور لباس
 پر اتنی رقم کون خرچ کر کے رہائش پذیر ہوگا۔ اگر کوئی وہاں پہنچے گا بھی۔ تو اس کا قیام
 بالکل عارضی ہوگا۔ آخر کار اُسے زمین پر ہی آنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہارا اصل ٹھکانا زمین
 ہی ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيدُكُمْ
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخِرًا اے انسان! ہم نے تمہیں اسی
 زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں

گئے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر اتر جاؤ۔ ایک خاص
 مدت تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

فَلَقَىٰ آدَمَ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ۝ (۳۹) قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ
مِنْهُ مَذْي فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۝ (۴۰) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۴۱)

۴۱

ترجمہ :- پس آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا آدم کی طرف مہربانی کے ساتھ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا ہے۔ مہربان ہے۔ (۳۹) ہم نے کہا تم سب زمین پر اتر جاؤ۔ پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت کی پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ غم کھائیں گے (۴۰) اور جنہوں نے کفر کیا۔ اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ وہ دوزخ واس ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۴۱)

گہرے پوچھتے

جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا۔ جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ تو ان سے انعام و اکرام لے لئے گئے۔ اور انہیں حکم ہوا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور تمہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اب آدم علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوئی کہ انہیں زمین پر اترنے کا حکم مل گیا ہے۔ بعض دوسروں میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے اور آدم علیہ السلام کے سر سے قلع اتار لیا۔ اور ان کے جسم سے بہشت کا لباس بھی اتار لیا اور انہیں برہنہ کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے سترہ اٹھانے کے لیے جنت کے درخت کے پتے استعمال کیے۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے ستر کا کھنڈ خلافِ فطرت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام
کی قرب

اس کے بعد کیا ہوا۔ فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ پس آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے
چند کلمات سیکھے۔ تَلَقَىٰ کا معنی پانا یا سیکھنا ہے۔ ان کلمات کا اللہ تعالیٰ نے الہام کیا یا آدم علیہ السلام
کے دل میں ڈالا۔ ان کلمات کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف
میں آتا ہے: قَالَ رَبِّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا
لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ یعنی اے پروردگار! بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں بخش
نہیں کرے گا۔ اور ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔ اس کے
علاوہ حدیث میں ان دعائیہ کلمات کا ذکر ہے۔ جن کے ذریعے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی
نتیجہ یہ ہوا کہ فَتَابَ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ آدم علیہ السلام کی طرف مہربانی کے ساتھ
تَابَ کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا
مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا اپنی مہربانی کے ساتھ۔ اور جب اس لفظ کو بندے
کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بندے نے رجوع کیا اپنی عاجزی کے
اعتراف کے ساتھ اور بُرائی کے ترک کرنے کے ساتھ۔ گویا توبہ کی صفت کا تعلق خالق اور مخلوق
دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں تَوَلَّوْا إِلَى اللَّهِ تَوَلَّوْا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ
گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے معافی مانگو۔
إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ
نے اُن کی لغزش کو معاف کر دیا۔

اہم بیہقی نے اپنی مشہور کتاب شعب الایمان میں روایت بیان کی ہے۔ کہ اپنی لغزش
پر آدم علیہ السلام اس قدر رئے کہ لَوْ رَزَنَ دُمُوعُ اَدَمَ بِجَمِيعِ دُمُوعٍ وَلَكِنَّهُ لَرَجَحَ
دُمُوعُهُ عَلَى جَمِيعِ دُمُوعٍ وَلَكِنَّهُ یعنی آدم علیہ السلام نے جس قدر آنسو بہائے اگر ان کا
مقابلہ ان کی قیامت تک آنے والی ساری اولاد کے ساتھ کیا جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے
آنسو غالب آجائیں۔ اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت بھی مرفوعہ ہے۔

مَا حَمَلَكَ عَلَىٰ أَنْ أَكُلْتَ مِنَ الشَّجَرَةِ ۖ أَدَمُ ۖ ثُمَّ كَوَّاسُ دَرْخْتِ كَاچِلِ كھانے پر کس نے
 ارادہ کیا۔ الَّتِي نَهَيْتُكَ عَنْهَا ۖ جِس سے میں نے منع کیا۔ قَالَ يَا رَبِّ زَكَّيْنَتْهُ لِي حَتَّىٰ
 لَمْ أَلْقِ الشَّجَرَةَ ۖ اس کو میرے لیے حوائے مَرْنِ کیا۔ یعنی اس درخت کا پھل کھانے کے لیے حوائے
 مجھے ترغیب دینا تھا۔ تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جائیں گے۔ شیطان کا دوسرا تھا۔

حضور علیہ السلام کی
 حضرت آدم علیہ السلام
 پر فضیلت

خطیب بغدادی نے روایت بیان کی ہے۔ اور یہی سنی نے دلائل النبوة میں اس کو نقل کیا
 ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے آدم علیہ السلام پر دو باتوں میں
 برتری عطا فرمائی ہے۔ اول یہ کہ ہر آدمی کے ساتھ قرین اور شیطان مقرر ہے۔ جو اُسے ہر کام میں
 مکر میرا قرین اور شیطان کا شیطانی مُسَلِّمٌ وہ مطیع اور منقاد ہے۔ صحیح روایت میں آتا ہے
 فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ وہ مجھے بُرائی کا حکم نہیں دیتا بلکہ بھلائی کی دعوت ہی دیتا ہے۔
 چونکہ آدم علیہ السلام کے ساتھ ابلیس تھا۔ اُس نے دوسرا انداز ہی کی جس سے حضرت حوا بھی متاثر
 ہوئیں۔ اور انہوں نے آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی۔

فرمایا آدم علیہ السلام پر مجھے دوسری فضیلت یہ ہے کہ ان کی بیوی نے بُرائی کی طرف
 ترغیب دی۔ جب کہ میری ازواج دین کے معاملے میں میرے ساتھ تعاون کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ
 نے قرآن پاک میں ازواج مطہرات کی تعریف فرمائی ہے۔ ایک موقع پر اُن سے معمولی لغزش
 ہوئی تھی۔ جب انہوں نے زیادہ خرچہ کا مطالبہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی جس پر وہ
 اپنے مطالبہ سے دست بردار ہو گئیں۔ اور دنیا کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت
 کو اختیار کیا۔ گویا حضور علیہ السلام کی بیویاں آپ کے امور میں معاون تھیں۔ ویسے بھی آپ کا فرمان
 ملتا ہے کہ وہ انسان نیک بخت ہے۔ جس کی بیوی دین کے معاملہ میں اس کی معاون ہو۔

زمین پر رہنے
 کا حکم

صالح ستہ کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ لَوْ كُنَّا بَنُو آسُرٍ أَسْرَيْنَا
 اَلْغَرَبَ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ اللہ تعالیٰ کے نبی کے حکم میں خیانت نہ کرتے۔ یعنی نبی نے حکم دیا تھا۔ کہ مَن اور سولہ
 کھا رہے ہو۔ مگر اُسے ذخیرہ نہ کرنا۔ مگر انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی

منزایہ دی۔ کہ گوشت کھن سڑنا شروع ہو گیا۔ آج کل گرمی کے موسم میں تو ایک دو دن سے زیادہ گوشت نہیں رہ سکتا۔ بدبو آنے لگتی ہے جھنور جلیل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کی پاسداری کرتے۔ گوشت کو ذخیرہ نہ کرتے تو یہ بھی خراب نہ ہوتا۔ خواہ کتنی ہی سڑ سڑا رہتا۔

”دوسری بات آپ نے فرمائی کہ لَا تَحْوَاؤُا لَمْ تَخْنُ اُنْثٰی ذَرْجَهَا۔ یعنی اگر حوا اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت اپنے خاوند کے ساتھ خائن نہ ہوتی۔ حوا کی خیانت یہ تھی کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بہر حال جب آدم علیہ السلام نے چل کھایا۔ اور برہنہ ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ثُمَّ سَبَّ یٰمِیْنُ پُر اُتْرَجَاوْ۔ یہ حکم شیطان۔ آدم علیہ السلام اور حوا سب کے لیے تھے۔ تو یہ تو قبول ہو گئی۔ مگر زمین پر اُتر جانے کا حکم صادر ہو گیا۔

بائبل اور بعض تاریخی روایات میں مور اور سانپ کا ذکر بھی آتا ہے کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلانے میں معاون ہو گئے تھے۔ اور یہ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر یہ روایت درست نہیں میں سمجھتا ہوں کہ شیطان نے جنت کے باہر دوسرا انداز ہی کی تھی۔ اس نے دروازے سے باہر جہنم سے مباشرت کی تھی۔ جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی بات بھی سُن رہے تھے۔ اسی بات سے آپ کو دوسرا پیدام ہوا۔ اور آپ نے وہ کام کر لیا۔ جس سے منع کیا گیا تھا۔ لہذا آپ کو زمین پر اُترنے کا حکم ہو گیا۔

آدم علیہ السلام نے چل کھایا ہوا تھا۔ اُدھر زمین پر اتار دیا۔ آپ کو بول براز کی حاجت ہوئی۔ پیٹ میں درد پیدا ہوا۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اس سے پہلے یہ تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی پریشانی دیکھ کر جبرائیل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کو بتایا کہ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طریقے سے فراغت حاصل کریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو براز سے بدبو آنے لگی۔ آپ کو اور پریشانی ہوئی۔ رونے لگے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ

آدم علیہ السلام
اور جنت حوا
کی بات

سروان تک جاتے ہیں۔ اس واقعہ کو ابن ابی الدنیاء نے روایت کیا ہے۔ اور امام دارقطنی نے بھی کتاب الافراد میں حضرت عمرؓ سے بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس وقت بھیجا جب حضرت حوا کو حیض کی حاجت ہوئی جنت میں کو ہر طرح کی پاکیزگی حاصل تھی۔ زمین پر اگر یہ پریشانی لاحق ہو گئی۔ مائی حوا نے جبرائیل علیہ السلام کو آواز دی۔ کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے مجھے وقفہ وقفہ سے خون آرہا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔ اے حوا! یہ بات تم پر اور تمہاری بیٹا پر ہمیشہ کے لیے مسلط ہے گی۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایام حج میں حیض کی حالت لاحق ہو گئی۔ آپ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حیض آنے پر سخت افسردہ ہوئیں اور رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو آپ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہذا سنیٰ و کتبہ اللہ علی بنات آدم۔ یہ اسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں پر لازم کر دیا ہے۔

الغرض! جبرائیل علیہ السلام نے حوا کو یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیٹیوں پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ بنتے گا۔ اور تمہارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے عورت جسمانی طور پر صحت حاصل کرتی ہے۔ اور اگر نیک بخت ہے۔ تو باطنی طور پر بھی اس کو طہارت نصیب ہوگی۔

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے، تو بعض روایات کے مطابق قیس قسم کے پھلوں کے بیج ان کے ساتھ آئے۔ بعض دوسری روایات میں ہزار قسم کا ذکر آتا ہے جن میں روایات میں خوشبو، مٹرہ، مٹا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خوشبو جنت کا تحفہ ہے اگر کوئی پھول یا کلمہ پیش کرے۔ تو اس کو دوزخ میں کرنا چاہیے۔ فَإِنَّهُ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ کیونکہ یہ جنت سے آئی ہوئی ہے۔

جنت کے تحفے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ سہ ن چمنا درہم تہو بہمی آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا تاکہ دنیا میں کام کما کر جنت سے ان کو اپنی پسند اس کو جبل البقیس پر رکھا گیا یہ دودھ کی طرح سفید تھا اور رات کو صبح کی طرح چمکتا تھا۔ اہمہ اہمہ انسانوں کے ناموں کی یہ کیوں نے اس پتھر کو سیاہ کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین شرق الهند میں اترے تھے۔ چنانچہ سمجھ المر جان فی آثار ہندوستان کے مصنف لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نزول شرق الهند میں اور حضرت نوحؑ کا نزول جہدین ہوا۔ جہدہ یا غنی معنی دانی یا نانی ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے اس مقام کا نام جہدہ شور ہو گیا۔ صاحب سمجھ المر جان برے پائے کے فہرست اور عالم تھے۔ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر تھے۔

حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور کپڑے بننے کا کام بھی آپ ہی سے شروع ہوا۔ واسم اور اشرفیاں بھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنائیں۔ دیگر انبیاء عیسم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام نجاری یعنی بڑھئی ہوا کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود اور صالح علیہما السلام تاجور تھے۔ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام مویشی پالتے تھے۔ اور ان کا دودھ اور اون وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیشہ گھربانی تھا۔ داؤد علیہ السلام زبہ بناتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام روئے زمین کی عظیم سلطنت کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی گذراوقات کے لیے ٹوکریاں اور زنبیلیں بناتے تھے۔

اہم بیعتی نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے کہ جب آدم علیہ السلام سے عرض سرزد ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے عرض پر نگاہ کی۔ تو وہاں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا پایا۔ آپ نے خیال کیا کہ جس شخصیت کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا

سے تفسیر عریزی فارسی ص ۱۹۲ سے بن کثہ پند سے تفسیر عریزی ص ۱۹۲

سے تفسیر عریزی ص ۱۹۲

ہوا ہے۔ یہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معافی مانگی۔
 اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا عَفَرْتَ لِي۔ اے اللہ! میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل سے دعا کرتا ہوں کہ میری لغزش کو معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تمہیں کیا علم کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ مولا کریم! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ تیرے نام کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نام لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تیری اولاد میں یہ آخری نبی ہوں گے۔ اور میری پوری مخلوق میں ان کی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ یہ روایات ضعیف ہیں بعض نے ان کو موضوع بھی کہا ہے۔ تاہم تشریح کی خاطر ان کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی لغزش کو معاف کر دیا۔ بیہقی کے علاوہ یہ روایات طبرانی، حاکم اور البرہن میں بھی موجود ہیں۔ اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو دنیا میں ابوالبشر کی کنیت سے پکارا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن حضور علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے ہو ابو محمد کی کنیت سے پکارا جائے گا۔ گویا آپ کو ابوالبشر اور ابو محمد دونوں اعزاز حاصل ہیں۔

بخاری اور مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے روز جب اول آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو کہیں گے کہ اے آدم! انت ابوالبشر آپ تمام نسل انسانی کے جد امجد ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ کیا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ فرمایا ہاں۔ نَبِيٌّ اَرْسَلْنَاكَهُ اللہ آپ نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ آپ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ اَوَّلُ الْاَنْبِيَاءِ اَدَمُ اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تذکرہ ایک ایسا عمل ہے جس سے انسان کی سابقہ کوتاہیوں کی معافی ہو جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام

قریب کی تین شرط

کافر ان ہے التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا
ہی ہے۔ جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ مگر توبہ کی قبولیت کے لیے بعض شرائط بھی ہیں۔ اگر
ان شرائط کے ساتھ توبہ کی ہے تو قبول ہوگی ورنہ نہیں۔ توبہ میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی علم
حال اور عمل۔

علمت مادیہ ہے۔ کہ آدمی جانتا ہے کہ میں نے واقعی یہ غلط کام کیا ہے۔ اور اس کے
ارتکاب پر گناہ اور اس کے ضرر کا احساس ہوتا ہے۔ حال کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان اس غلط
کام کو ترک کر دے۔ اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے یہ عمل ہے۔ اس ضمن میں ذامت کا ذکر
بھی آتا ہے التَّوْبَةُ الشَّدَامُ اور اگر کچھ فرائض رو گئے ہوں تو ان کو ادا کیا جائے۔ کوئی
حقوق تلف ہوئے ہوں۔ تو ان کو پورا کیا جائے۔ تب انسان کی توبہ قبول ہوتی ہے۔

امام دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے جس میں آدم
علیہ السلام سے متعلق مختلف باتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام
کی وفات پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مسجد خیف میں (جو کہ مثنیٰ میں واقع ہے) حضرت آدمؑ پر
کی نماز جنازہ پڑھی اور چار تجسّس کیں۔ فرشتوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ اور حضرت
آدم علیہ السلام کو کھد میں دفن کیا گیا۔ اور ان کی قبر کو بان دار بنائی گئی۔ جیسا کہ عام طور پر آج کل بنائے جاتے
ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان کی سرزمین سے چالیس
حج پیدل کیے۔

زمین پر اتارنے
کی حکمت

ان آیات میں اِهْبِطُوا یعنی اتر جاؤ کا لفظ دو دفعہ آیا ہے۔ بغیرین کرام فرماتے ہیں۔
کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اتر جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر جب اس حکم کی فوری تعمیل نہ ہوئی۔ تو دوبارہ
سخنت آؤا۔ اور زمین میں اتر جاؤ۔

یہاں پر یہ ختمہ قابل غور ہے۔ کہ زمین پر اترنے کا حکم کسی سزا کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اس

میں بھی قسمت خداوندی تھی۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ چنانچہ اس ارادے کی تکمیل یعنی خداوند ارضی کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتار گیا۔ آپ نے نیابت کے کام کی ابتداء کی۔ اور پھر یہ فرض آپ کی آنے والی اور میں منتقل ہو گیا۔ گویا زمین پر اترنے کا حکم نہ انہیں بلکہ ایک اعزاز تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے حصے میں آیا کہ انہیں نیابت الہی کا فریضہ سونپا گیا۔

خوفِ محشر
کی حقیقت

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَإِذَا يَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ هَذِهِ جَبَلٌ مِثْرَى حَبِيبٍ" اور جب انبیاء علیہم السلام میرا پیغام اور ہدایت لے رہے ہیں فَكُنْ تَبَعٌ هَذَایَ تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ اُن پر انجام کے لحاظ سے کوئی خوف نہیں ہوگا وَلَا هُمْ يُحْزَنُونَ اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

یہاں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن تو بہت زیادہ خوف ہوگا۔ عام انسانوں کا تو کیا حال ہوگا۔ خود نبیوں کے متعلق آتا ہے کہ وہ فَفَسَىٰ فَفَسَىٰ پائیں گے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ظاہری طور پر تو یہ واقعی خوف ہوگا۔ مگر انجام کے اعتبار سے بالکل خوف نہیں ہوگا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی قہری صفات کا ظہور ہوگا۔ تو خوف دہرا اس طاری ہوگا۔ جیسے کسی مقدمہ میں ملزم بڑا گھبراتا ہے۔ مگر وکیل مدافع کی مثل دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تسلی رکھو۔ آخر کار انجام بخیر ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمدہ ہدایت کی پیروی کریں گے۔ انہیں اگرچہ قیامت کے دن وقتی طور پر خوف پیدا ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آخر کار انہیں خوف نہیں ہوگا۔ ہدایت اصل میں دین کی روح اور حکمت کو کہا جاتا ہے۔ اور دین حق دائمی قانون کا نام ہے جو انانیت کے اصلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی ہدایت کے مفصلات میں نبی، رسول، معجزات، کتب سماویہ اور شریعت وغیرہ آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اتباع ہی ہدایت

ہدایت کے
متبعین

الہ

درس نوزدہم ۱۹

البقرة

(آیت ۲۰ تا ۴۲)

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا
بِعَهْدِيْ اَوْفٍ بِعَهْدِكُمْ وَاَيَّايَ فَاَرْهَبُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِمْنُوا بِمَا
اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرٍ بِهٖ
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيَتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّرٰٓيَا فَاَلْقَوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَا
تَلْبَسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ قٰلِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اے بنی اسرائیل یاد کرو میری ان نعمتوں کو۔۔۔ جو میں نے

تم پر انعام کیں۔ اور پورا کرو میرے عہد کو۔ میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو۔ اور

اور خاص مجھ ہی سے ڈرو ﴿۲۰﴾ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو میں نے نازل کیا ہے

اور وہ ان (اصل غیر محرف شدہ) کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جو تمہارے پاس

ہیں۔ اور نہ ہو تم پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ۔ اور مت خریدو میری آیاتوں

کے بدلے بھڑکی قیمت اور خاص مجھ ہی سے پس ڈرتے رہو ﴿۲۱﴾ اور نہ ملاؤ

حق کو باطل کے ساتھ۔ اور تم حق کو چھپاتے ہو۔ اور تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾

تاریخ بنی اسرائیل

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَعْبُدُوْا مَا لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ اَنْتُمْ اَعْبُدُوْنَ

مہتا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کا ذکر تھا۔ اس کے بعد

وَإِذْ قَالَتْ رَبِّ انِّكَ اَنْزَلْتَنِيْ مِنَ السَّمَاءِ وَتَخَلَّقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ اَوْ اَنْزَلْتَنِيْ مِنْ اَرْضٍ اَوْ اَنْزَلْتَنِيْ مِنْ اَرْضٍ اَوْ اَنْزَلْتَنِيْ مِنْ اَرْضٍ

علیہ السلام کے ذریعے تمام انسانوں کو حاصل ہوئی۔ اب یہاں سے بنی اسرائیل کو خدائی خطاب

ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یہ دلائی ہیں۔ اور ان معجزات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان میں

ظاہر ہوئے۔ بنی اسرائیل کے باطل کھول دینا اور ان کی توبہ کی ہے۔ اور اس قوم میں جو ظالم

پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ بیان یہاں سے شروع ہو کر اور اِذَا ابْتَلٰی

اِبْرٰٓهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ سَمَّكَ بِمَا جَلَّیْكَ

خلافت ارضی عمومی نعمت ہے۔ جو آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کو نصیب ہوئی۔ یہ خلافت بنی اسرائیل میں ۶۰۰ سے تک قائم رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ نعمت چھین لی اور بنی اسرائیل کو حاصل ہو گئی۔ یہاں پر بنی اسرائیل کی ان غلامیوں کا ذکر ہو گا جن کی وجہ سے اس عزت شرف اور فضیلت وہ محروم ہو گئے۔

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ ان دونوں غلامانوں یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کے بعد ائمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جن کا وطن مالوت موجودہ بغداد سے ستر میل دور بابل شہر تھا۔ آپ کی پیدائش کے وقت بابل بہت بڑا شہر اور تہذیب کام کر رہا تھا۔ یہ چالیس مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت بڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں سے ہجرت کی جیسا کہ فرمایا: *إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي*، اور مصر کے رستے شام پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ اور پھر حجاز گئے۔ آپ، اسلام ۶۰۰ ق م تھے۔ پھر شامی پھر حجازی ہوئے۔ اثنی عشری میں فلسطین کو گمان کتے تھے۔ اور یہ شام ہی کے ماتحت تھا۔ بعد میں اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تولد ہوئے۔ آپ کے بارہ فرزند تھے۔ پھر ان کے آگے بے شمار قبیلے ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی آپ کی چچا زاد حضرت سارہ بن تھیس۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ آپ کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور پھر ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم نبی ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی بشارت سادی تھی: *وَمَنْ وَدَّكَوَاسْحَقَ يَعْقُوبَ* یعنی مائے فرزند اسحاق علیہ السلام سے ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام ہوں گے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے: *إِسْحَاقُ عَشْرَةُ أَسْبَاطٍ أُمَّمَ سُوْرَةُ ۱۱۱* میں موجود ہے۔ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک بیسویں بیوی قنور بھی تھی جس کی اولاد بنی قنور کہلاتی ہے

مگر انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے نہ ہونی۔

واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام کے دو بیٹے یعنی عیسیٰ اور یعقوب جبرائیل کے تھے۔ البتہ عیسیٰ ذرا پہلے پیدا ہوئے اور یعقوب علیہ السلام بعد میں۔ یعقوب کا لفظی معنی پیچھے آنے والے کے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ اسحق علیہ السلام کو عیسیٰ کے ساتھ زیادہ محبت تھی۔ اور ان کی بیوی کو یعقوب علیہ السلام زیادہ پیارے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام زیادہ صحت مند اور مضبوط جسم کے مالک تھے اور حضرت اسحق علیہ السلام نے انہیں یہ فریضہ سونپ رکھا تھا کہ وہ دروازے پر موجود رہیں۔ جب تک میں عبادت میں مصروف رہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں تاکہ عبادت میں فصل واقع نہ ہو۔ ایک موقع پر انسانی شکل میں فرشتہ آیا اور اندر جانا چاہا مگر یعقوب علیہ السلام نے روکا۔ جب اسحاق علیہ السلام باہر آئے تو دیکھ کر یعقوب علیہ السلام فرشتے کے ساتھ الجھ رہے ہیں۔ تو انہوں نے تحسین فرمائی کہ واقعی تم نے اپنی ڈیوٹی پوری پوری داک کی ہے۔ فرشتے نے آپ کا نام دریافت کیا تو انہیں یعقوب بتایا گیا۔ اس نے کہا اس کا نام اسرائیل ہے۔ سریانی یا عبرانی زبان میں اسرائیل کا معنی بندہ اور ایل کا معنی اللہ ہے۔ گویا فرشتے نے یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ رکھا۔ جو کہ عبد اللہ کے مترادف ہے۔ یہی ہے آپ کا نام اسرائیل مشہور ہوا۔ اور آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ چونکہ حضرت اسحق علیہ السلام کی محبت عیسیٰ کے ساتھ زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے عیسیٰ سے فرمایا کہ میں آخری وقت میں تیرے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ جب ماں کو پتا چلا تو اس نے چاہا کہ یہ دعا یعقوب علیہ السلام کے حق میں ہو۔ چنانچہ اس نے یعقوب علیہ السلام کو عیسیٰ کا پاس پینا کر ان کے باپ کے پاس بھیج دیا۔ اور ساتھ نصیحت کی کہ باپ کے سامنے آہستہ بولنا کہ وہ تمہیں پہچان نہ سکیں۔ چونکہ اس وقت حضرت اسحق علیہ السلام کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عیسیٰ سمجھے اور ان کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد میں نبوت کو جاری رکھے۔ یہ خصوصی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام

سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ تعالیٰ نے پیار بہا بہا نبی اور رسول اس خانہ ان میں منحرف ہے۔
 کچھ عرصہ بعد عیسیٰ نے باب کو یاد دلایا کہ آپ نے میرے حق میں دعا کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ دعا تو میں نے کر دی ہے۔ عیسیٰ نے کہا کہ وہ دعا تو آپ نے یعقوب علیہ السلام کے
 کے حق میں فرمائی ہے۔ تو انہوں نے کہا۔ اچھا وہ تو اس کے لیے ہو گئی۔ تمہارے لیے دعا ہے
 کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خانہ میں بادشاہت قائم رکھے۔ چنانچہ آپ کی دعا سے بادشاہت کا
 زیادہ تر سلسلہ عیسیٰ کی اولاد میں ہی رہا۔

جب تخت اسحاق علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو ان کے سارے مال و باب
 پر عیسیٰ نے قبضہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو کچھ نہ ملا۔ اسی مال و دولت کی وجہ سے لوگوں کا
 رجوع بھی عیسیٰ کی طرف ہو گیا۔ در یعقوب علیہ السلام ناوار ہونے کی وجہ سے کسی شمار میں نہ آتے
 تھے۔ ان کے ماموں کسی دوسری جگہ مقیم تھے۔ اور بڑے مالدار تھے۔ مال نے مشورہ دیا۔ کہ
 ان کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ اور اس کی بیٹی بھی ہے جس کے
 ساتھ وہ تمہارا نکاح بھی کر دے گا۔ چنانچہ آپ اپنے لایان نامی ماموں کے پاس پہنچے۔ وہ
 آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہو۔ اور کہا کہ اپنے جانی کی بد سوں سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ میں تمہاری
 ہر طرح سے مدد کروں گا۔ چنانچہ اُس نے اپنے سارے مال و اسباب کہ متعین حضرت یعقوب علیہ السلام
 کو بنا دیا۔ اور اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا۔

اس بیوی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیار بیٹے عطا کئے۔ اور اس کے بعد بیوی کا انتقال ہو
 گیا۔ ماموں نے آپ پر مزید احسان کیا۔ کہ دوسری بیٹی کا نکاح کر دیا۔ اس سے دو ذریعہ پیدا ہوئے
 در وہ بھی فرست۔ ہو گئی۔ اس کے بعد ماموں نے تیسری لڑکی آپ کے نکاح میں نہ دی۔ اس
 سے ایک لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ پھر
 ماموں نے اپنی چوتھی لڑکی راحیل کا نکاح کر دیا۔ اس وقت تک حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر
 چالیس برس ہو چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمایا۔ اور حکم دیا کہ اس مقدمہ کو چھوڑ

کہ کنعان چلے جاؤ۔ اور وہاں پر تبلیغ کا فریضہ انجام دو۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے کہا کہ تمہاری جدائی سے تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہر چیز پر مقدم ہے۔ چنانچہ اپنے بخوشی حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ اور ان کی خدمت کے طور پر پانچ سو گھوڑے، پانچ سو اونٹ، پانچ سو گائے پانچ سو خچر، پانچ سو بھیڑیں اور بہت سا دیگر سامان ہمراہ کر دیا۔

کنعان پہنچ کر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ وہاں پر آپ کی چوتھی بیوی راحیل کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے۔ یوسف علیہ السلام ابھی دو سال کے تھے۔ کہ راحیل بھی فوت ہو گئی۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے اپنی پانچویں بیٹی بھی نکاح میں دے دی۔ اور اسے یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں بھیج دیا۔ تاکہ بچوں کی پرورش ہو سکے۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے ہوئے۔ جن سے آگے بارہ خاندان بنے۔

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو بھی اس فضیلت سے محروم نہ رکھا۔ جیسا حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان کی طرف آئے تھے۔ تو راستہ میں عیسیٰ نے بھی آپ کا استقبال کیا۔ اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ذریعے مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے خاندان میں بھی نبوت جاری فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ تو وحی نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ کے خاندان میں ایک بنی الوب علیہ السلام کو پیدا فرمائے گا۔ اور ایک عظیم المرتبت بادشاہ ذوالقرنین بھی آپ کے ہی خاندان میں ہوگا۔ چنانچہ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔

ان آیات میں ان انعامات کا تذکرہ ہے۔ جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر کیے۔ يٰۤاَيُّهَا بَنِي إِسْرَٰءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ لَئِیْ
بنی اسرائیل! میرے ان انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے۔ ان میں سے دو دنیاوی انعام تھے۔ یعنی اس قوم میں انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے اور بادشاہت بھی عطا کی۔ سو فرمانہ

بنی اسرائیل پر
انعامات

میں موجود ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْبِیَاءَ وَجَعَلَكُمْ مَلُوكًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی نے
 کتنا عظیم احسان اس قوم پر کیا۔ اُس وقت اس کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوسری قوم نہیں
 تھی۔ ان کو عزت و دولت اور شہرت حاصل تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگا۔ حتیٰ
 کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے تک ان کی ذلت انتہاء کو پہنچ گئی۔ انجیل اور توراتِ مسیح کی کتابوں
 سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں سال گزرنے
 کے بعد جب نزولِ قرآن کا زمانہ آیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اللہ تعالیٰ
 کا آخری پیغام اور شریعت نازل ہوئے۔ اس وقت بھی بے شمار خرابیوں کے باوجود یہی لوگ
 صاحبِ علم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس مقام پر بنی اسرائیل کو ہی دعوتِ فخر
 دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جنہیں تم اپنی خرابی کی وجہ سے کھو چکے ہو۔ لہذا اب
 یہی راہِ راست پر آ جاؤ۔ بنی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔ اور خدا تعالیٰ کے آخری پیغام کو
 تسلیم کر لو۔ تو تمہاری تپنی ہوئی غت واپس آ سکتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کر دگے۔ اپنی بے رحمی
 پر قائم رہو گے۔ تو تمہارے حصے میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگلے رکوع
 میں ذکر آئے گا۔ کہ بنی اسرائیل میں کس طرح خرابیاں پیدا ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انعامات کا ذکر کر لیا ہے بعد فرمایا وَ اَوْفُوا بِعَهْدِیْ اے
 بنی اسرائیل میرے عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ عہد تو لیا تھا۔ کہ میری اطاعت
 کرنا، انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنا۔ اور فرمانِ حق کو پورا کرنا۔ فرمایا اس کے بعد میں اَوْفُوا
 بِعَهْدِیْكُمْ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تمہارا عہد یہ ہے۔ کہ تمہارے کُناہ معاف کر کے
 تمہیں بخش دوں گا۔ اور جنت تک پہنچا دوں گا۔ تمام بنی نوع انسان نے جو عہد اللہ تعالیٰ سے
 کیا ہوا ہے۔ اُس کے اُس کے مطالبے یعنی میثاق کا ذکر بھی آئے گا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ
 میثاق بھی پورا کرو۔ الَّذِیْ وَاَقَعْتُكُمْ بِہٖ ثُمَّ مَنَیْہُ عَمَیْہُ کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے
 بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ کہ صحیح دین اور سچی بات کو مست چھپانا۔ مگر انہوں نے کیا کیا؟ فَتَبَدَّدُوا
 وَ رَاَوْ ظُهُورَہُمْ ۚ اِس عہد کو پس پشت ڈال دیا۔ نزولِ قرآن کے وقت تک بنی اسرائیل
 میں تبت و اور کتمان حق کی بیماری اپنے عروج پر تھی۔ یہ لوگ توراۃ، انجیل اور دیگر کتب میں موجود

آخری نبی علیہ السلام کے متعلق پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اور اس حسد میں مبتلا تھے کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل کی بجائے بنی امیئل میں کیوں آیا ہے۔ یہ لوگ صاحب علم ہونے کے باوجود متعصب تھے۔ مشرکین نے تو ایمان قبول کر لیا مگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ **مِیَاکَہُ وَلَکُمُ کَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فِیْضُوْنَ** یعنی ان کی اکثریت، مافرانوں کی ہے۔ جب کہ نہایت ہی قلیل تعداد راہِ راست پر آئی ہے۔ چنانچہ ان میں سے حضرت عبداللہ بن سلام جیسے چند حق پرستوں نے اسلام کی دعوت قبول کی۔ الغرض فرمایا تم میرا غمہ پورا کرو۔ میں تمہارا غمہ پورا کروں گا۔ **وَإِنَّا لَنَافِیْوُنَ** اور خاص مجھ ہی سے ڈرو۔ میں ہی تمہارا خالق اور مالک ہوں۔ میں نے تم پر پست بھی انعام کیے۔ آئندہ بھی کروں گا۔ بشرطیکہ تم مجھ سے ڈر کر میرے راستے پر آباد۔

ایمان بالقرآن

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ **وَمِنْهُمْ مَّنْ أَسْلَمَ** اور جو چیز میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیز مٹے گا **فَالْمَا مَعَكُمْ** اس چیز کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ یعنی توراۃ و دینِ سابقہ کتب یاں پر یہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے۔ مگر اس کی شریعت اور احکام کی من و عن تصدیق نہیں کرتا۔ کیونکہ سابقہ دو سر نبی پہلے نبی کی بعض چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا تم اس قرآن پاک کو بحیثیت کلام الہی تسلیم کر لو۔ اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ **وَرَبُّکُمْ لَیُّکْفِیْہُمْ** اور وہ لوگ قرآن پاک کے اولین منکرین نہ بن جاؤ۔

قرآن پاک کا نزول مکہ مکرمہ میں شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے انکار کرنے والے لوگ کفار بن گئے۔ پھر جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں یہود نے اس کا انکار کیا۔ تو اس لحاظ سے قرآن پاک کے اولین منکرین کفار مکہ میں رہے کہ یہود مدینہ۔ مگر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے کہ تم اولین منکرین نہ بن جاؤ۔ مفسرین کرام اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں

مٹے والوں کے پاس تو کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتاب یعنی تورہ تو مہیشہ کے یودھ کے پاس تھی۔ لہذا اہل کتاب میں سے اولین کافرین یہی لوگ تھے۔ اسی لیے ان کو کہا گیا کہ تم اولین سحرین میں سے نہ ہو جانا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسرائیلی بیانیہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اگر تم موجودہ نسل والے بننا کر دو گے تو تمہارے بعد آنے والی نسلیں بھی تمہاری روش پر چل کر بننا کر دیں گی۔ اس میں یہ بھی آئے والی نسلوں کی عمر ہی کے ذمہ دار بھی تم ہی بننا دو گے۔ اسی لیے اولین سحرین نہ بن جاؤ۔

پھر فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا بَایِسٰی فَمَنْ قَلْبُهُۥٓ اُورَمَتْ عَیْۤیٰہُ وِیَہِیْ اَیُّوۡلُہِ دُنْیَاہُ مَحَبَّتِہٖ ہلے تمہاری قیمت۔ تمہاری قیمت سے مراد دنیا کا تھکا مال ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں یعنی کھانا پینا پہنا اور نکاح کرنا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانے کا، بنیم گندگی اور پینے کا، بنگلہ بول ہے۔ اچھے سے اچھا لباس بھی کچھ عرصہ بعد پھٹ جاتا ہے۔ اور اُسے پھینک دیا جاتا ہے۔ رہا نکاح۔ تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے یہ چاروں چیزیں عقیقہ سے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔ مگر لوگ ان حشر اشیاء کے حصول کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔

فرمایا وَ اِیَّایْ فَاَتَّقُوۡنَ اور مجھ ہی سے ڈرو۔ آخرت کی خبر لو۔ دنیا کے پیچھے مت پڑو۔ آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ حساب و کتاب ہو گا۔ اور پھر تمہیں اپنے کئے کی جزا یا سزا بھگتنی ہو گی۔ لہذا مجھ سے ڈرتے رہو۔

وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَحْوَۡا بِالْحَقِّ اور حق کو باطل کے ساتھ غلط مطنہ کر دو۔ وَ تَتَّقُوا الْاَحْوَۡا اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی عام عادت تھی کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی بات چھپا لیتے تھے۔ آگے آئے گا کہ یہ لوگ قرآن پاک پر بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پیپنٹے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پیپنٹے تھے مگر پھر بھی انکار کرتے تھے۔ یہ

یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں ٹٹے ہر ہیں۔ خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریفات ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر تحریف کا عمل اُڑایا گیا ہو۔ وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور جس کتاب کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہو۔ اس کا کیا سے کیا بن گیا ہوگا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جس طرح بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہوا۔ اسی طرح آپ کی امت میں بھی پیدا ہوگا۔ آج کے دور میں دیکھ لیں کہ بدتماش قسم کے علماء محض دنیوی مفاد کی خاطر کس طرح غلط فتوے جاری کرتے ہیں۔ یہ چیز کتمانِ حق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کے لوگ امراء اور بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ حاکم وقت راضی ہو جائے۔ تو اپنی عیش ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم بادشاہ اور فاسق امراء آخرت سے بے خوف ہو کر کھردر جاتے ہیں۔ یہ لوگ علماء کو کھڑے کر کے اپنی من مانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی حال دنیویوں اور دنیویہ فتنیوں کا ہے۔ قانون کی آڑ میں غلام کے حق غصب کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: **وَيُذِلُّ لِمَنْ لَا يَنْفَعُهُ وَحِذِّقْ مَنْ الْوَيْلُ** جو کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اس کے لیے ایک بار ہلاکت ہے **وَيُذِلُّ لِمَنْ يَنْفَعُهُ وَلَا يَفْعَلُ سَبْعَ مَرَّاتٍ** جو جاننے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اس پر سات بار ہلاکت ہے۔ مقصد یہ کہ کتمانِ حق کرنے والے دنیا پرست لوگ حق بات کو جاننے کے باوجود اس کو چھپاتے ہیں۔ اور حق پر عمل نہیں کرتے۔ لہذا یہ سات گنا سزا کے مستحق ہیں۔

پیردوں، گہنی نشینوں اور علمائے سوادِ حال دیکھ لیں۔ انہیں ذرا نفس کا کوئی خیال نہیں کہ پورے ہوسے ہیں یا نہیں۔ مگر مستحبات اور تھوٹی چھوٹی چیزوں کو سینے سے لگائے

بیٹھے ہیں۔ جنہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ ملک پہ کافر کی حکومت برداشت کر لیں گے جیسا کہ پیروں اور علماء سورسے انگریز کی حمایت کی۔ مگر یہ اپنے خود ساختہ عقیدے کے خلاف کوئی چیز برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ کتان حق کے مترحب ہو رہے ہیں۔

آج کل دین کے ساتھ کیا سوچ ہو رہا ہے۔ نہ کسی کو فرائض کی پروا ہے۔ اور نہ واجبات کی معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تشویر ہو رہی ہے۔ پراپیگنڈا جاری ہے۔ تفرقہ بازی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر کالی گلوچ تک زوبت پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو یہاں بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں۔ اے میری امت۔ تم میں بھی وہی بیماریاں نمود کر آئیں گی **حَذُّوْا النَّعْلَ بِالنَّعْلِ** جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔

فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** اور تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے۔ اگلے رکوعات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہوگی۔ آج بھی یہ خطاب موجودہ دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان کی نشانہ ہی بھی ہو رہی ہے۔ گویا یہ دعوت الی القرآن ہے کہ **”إِٰمِنُوا بِمَا أُنْزِلَتْ“** جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پر ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔ قرآن پاک پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور آخری نوشتہ اور صحیفہ ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر اور اس کے پیش کردہ پردہ گرام پر نمل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَبُوا مَعَ الرَّاكِبِينَ ﴿٢٣﴾
 اتَّامِرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ
 تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٢٤﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ
 وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّهَا لَكِبُيرةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٢٥﴾
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَوْنَ رَبَّهُمْ وَلَهُمْ لِيُسَّعِ
 رَجَعُونَ ﴿٢٦﴾

ترجمہ ۵ : دو قائم کرو نماز کو اور دو زکوٰۃ اور دو رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے
 ساتھ ﴿۲۳﴾ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو۔ اور اپنی جانوں کو فراموش کرتے ہو
 حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۲۴﴾ اور مدد طلب کرو صبر اور نماز
 کے ساتھ۔ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے۔ مگر ان لوگوں پر جو عاجزی
 کرنے والے ہیں ﴿۲۵﴾ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے پروردگار
 سے ملنے والے ہیں۔ اور بیشک وہ اسی پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے
 والے ہیں ﴿۲۶﴾

اس رکوع کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر فرمایا۔
 پھر زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ اور ہدایت و رہنمائی کا وہ اصول ہی بتلادیا جس پر جنت میں دوبارہ
 داخلے کا دار مدار ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب ہوا۔ دوسری قوموں کے مقابلے
 میں بنی اسرائیل کو مدت و رزق تک فضیلت حاصل رہی۔ نبوت اور حکومت ان میں رہی۔ ان
 میں بڑے بڑے عابد و زاہد لوگ پیدا ہوئے۔ مگر ایک طویل عرصہ کے بعد اس قوم میں طغیانی
 پیدا ہو گئیں۔ جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت ارغشی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں
 منتقل کر دی۔

گزشتہ صفحہ

گزشتہ درس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن پر کیے گئے انعامات یاد دلانے گئے اور انہیں قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اور انہیں نصیحت کی گئی کہ وہ بنی اسرائیل میں اولین کا فر نہ بنیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آئندہ نسلیں بھی انہی کے قدموں پر چلیں گی۔ اور اس طرح اُن کا وبال بھی کفر میں پل کرنے والوں پر پڑے گا۔ انہیں حق و باطل کی تبلیغ سے اور کتمان حق سے منع کیا گیا اور ترغیب دی گئی کہ تمہاری اپنی کتابوں میں قرآن پاک اور عام البشیرۃ کے متعلق جو پیشین گوئیاں موجود ہیں انہیں ظاہر کریں۔

مدینہ طیبہ کے اطراف میں بسنے والے اہل کتاب یعنی یہود نسی بدتری کے زعم میں مبتلا تھے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے دوسری اقوام کو کم تر سمجھتے تھے، عربوں کو وہ جاہل، اُن پر ہوا اور اُمّی خیال کرتے تھے۔ اس قسم کے اثبات گئے اسی سورۃ میں، سورۃ ال عمران میں اور دیگر سورتوں میں بھی ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا دوسرا باطل زعم یہ تھا کہ نبوت ہمیشہ کے لیے انہی کے خاندان میں جاری رہے گی۔ مگر جب بنی اخرا ان کا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسمعیل میں آگئے تو ان کی ساری برتری ختم ہو گئی اور وہ حسد کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان کے قبول حق سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہیں جوہل اور منصفی برتری حاصل تھی۔ ایمان لانے سے وہ ضائع ہو جاتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور انہیں حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرنی پڑے گی۔ چنانچہ ایسی ہی چیزیں اُن کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ یہود کو حبّ مال و حبّ بہ نسی ایسی بیماریاں لاحق تھیں جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ انہی دو بیماریوں میں مبتلا ہو کر خیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ حبّ مال کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَرَشَدًا لِّلْغَيْبِ نَسِئًا**۔ مال کی محبت ان کے

میں فطرہ بڑی شدید ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبَّاجَمًا تَمْ جی بھر کر مال سے محبت کرتے ہو۔ جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں مانع تھیں۔

ان بیماریوں کا علاج

ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ بتوڑ کیا: وَأَقِمْوُ الصَّلَاةَ نَازِقَامًا کُرو۔ وَأَتُوا الزَّكَاةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی حُبّ جاہ کی بیماری کے لیے نماز شافی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر اور بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا، اس کا مطلب سمجھ لے گا۔ وہ حُبّ جاہ کی بیماری سے شفا یاب ہو جائے گا۔ اسی طرح حُبّ مال کی بیماری کا علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں مثلاً ان کے بخل دور کرنا بھی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ بخل کی لعنت پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو یہی وہ جذبہ ہے۔ جو مال کی محبت کو کم کر کے بخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ حُبّ جاہ اور حُبّ مال کی بیماری کا علاج ہے۔

نماز جامع عبادت ہے

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے: وَأَسْتَعِينُ بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادت کی جامع ہے۔ نماز میں روحانی، نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادت جمع ہیں مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے اور طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ ستر پوشی تو ہر حالت میں لازم ہے۔ مگر نماز کے دوران تو اور زیادہ ہو کہ ہے۔ انسان برہنگی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے تو اگر نماز میں انفاق جیسی عبادت بھی شامل ہے۔ پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رخ کرنا بھی ضروری ہے۔ نماز کی حالت میں انسان معطل ہوتا ہے۔ اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہذا نماز میں عکوف بھی شامل ہے

نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارح خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔ دل سے نیت اور اخلاص بھی ضروری ہے۔ اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح نماز میں شیطان کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔ نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ نماز میں انسان تہمتیں کا تکلم کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ جس کی انسان کو ابی دیتا ہے۔ نماز میں انسان کھانے پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ الغرض اہم بیضاوی فرماتے ہیں۔ کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔ کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔ نماز و زکوٰۃ کا حکم مینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ اور رکوع کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔ اسی لیے تو نماز باجماعت جمائے مذہب میں تقریباً وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ حضور علیہ السلام کی ایسی سنت مؤکدہ ہے۔ کہ اگر بلا عذر ترک کرے تو انسان منافقوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت میں ہے۔ کہ اگر تم جامعہ نماز سے تعلق کر دو گے تو پیغمبر علیہ السلام کی سنت کو چھوٹنے والے بن جاؤ گے۔ اور اگر ایسا کر دو گے تو نَضَلْتُمْ گمراہ ہو جاؤ گے۔ صرف معذور افراد کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ وگرنہ نہ رست آدمی کو بغیر جماعت کے نماز پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں۔ کہ ہم لوگ جماعت میں شریک ہوتے تھے اور جماعت سے پیچھے وہی رہتا تھا۔ جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے۔ یا وہ معذور رہتا تھا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ صرف سجدہ ہی ہوتا تھا۔ اس لیے حکم ہوا کہ رکوع بھی کرو۔ اگرچہ یہ سجدہ سے کم درجے کا رکوع ہے۔ مگر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس نماز میں رکوع نہ ہو، وہ نماز باطل ہو جاتی ہے بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ بیشک رکوع نماز کا ایک اہم رکن ہے مگر مَعَ التَّارِكِينَ سے صاف واضح ہے

۱۔ مسلم مج ۲/۲۲۲ ، ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی مج ۲/۲۱۳ ، ۳۔ معالم التنزیل مج ۲/۲۱۳

۴۔ تفسیر عزیزی فارسی مج ۲/۲۱۳ ، ۵۔ تفسیر ابن کثیر مج ۲/۲۱۳

اُس سے مراد نماز، جماعت ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ اسی سے اجتماعیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سبست ہی بیماریوں کا علاج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو انعامات یا دوائے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے کھڑی پیغام پر ایمان لانے کی تلقین کی۔ پھر ان کی خامیاں ظہر کر کے انہیں تپس اور کٹمان حق سے منع فرمایا۔ ان بیماریوں کا علاج نماز اور زکوٰۃ بتلایا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی سبب بڑی کھڑی کی طرف توجہ دلائی۔ اور فرمایا اَنَّا مُرُّوْذَ النَّاسِ بِالْبِرِّ کیا تم لوگوں کو برائی کا شہرہ دیتے ہو۔ وَتَنُوكُنَ اَفْسَكُنَا اور اپنی جانوں کو فراموش کر دیتے ہو۔ وَاَنْتُمْ تَسْلُوْنَ الْكِتَابَ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ مقصد یہ کہ جس نبی کی طرف تم دوسروں کو دعوت دیتے ہو۔ خود جانتے بوجھتے بھی اس پر عمل نہیں کرتے ظاہر ہے۔ کہ یہودی تورات کے عالم تھے اور وہ لوگوں کو تورات کے حقائق سے روشناس کراتے تھے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے آخری کلام قرآن پاک اور آخری نبی محمد رسول اللہ کے متعلق پیش گوئیاں بھی موجود تھیں۔ جو انسانوں نے لوگوں کو بتائی تھیں مگر جب یہ حقائق سامنے آ گئے تو دوسروں کو غلط کرنے والے یہودی علماء و خود ان حقائق سے منحرف ہو گئے۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہودی عالم اپنے مسلمان رشتہ داروں کو کما کرتے تھے۔ کہ تم جس شخص پر ایمان لاتے ہو۔ وہ جلاشبہ سچا اور آخری نبی ہے۔ اس کا دامن نہ چھوڑنا۔ بخود اس پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ایمان لانے سے اُن کے مالی فوائد ضائع ہوتے تھے۔ اُن کے اسی رویہ کے متعلق فرمایا کہ دوسروں کو تلقین کرنے میں اور خود کو فراموش کرتے ہیں۔ بعض دنیوی شیخی کے بے جہنم کے کندہ تراش بننے ہیں۔ آگے سورۃ ال عمران میں ذکر آئے گا۔ کہ نصاریٰ ایک دفعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیاتِ حجاز دنیا کے مال کی خاطر لیبان سے محروم رہا سیرت کی۔ اور دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ اس دفعہ کے لوگوں نے کہا کہ اگر ہم ایمان قبول کر لیں۔ تو ہمارے دلیفے اور تنخواہیں بند ہو جائیں گی۔ لہذا ہم ایمان لانے کے

یہ تیار نہیں۔ اسی ذہن کو توئی کی طرف دعوت دیتے ہو۔ مگر خود اس سے بچتے ہو یہ کہاں کا انصاف اور عقلندی ہے۔

محمود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ معراج کی رات میرا گھر ایسے لوگوں پر ہوا۔ جن کے ہونٹ جہنم کی قینچیوں سے کاٹے ہوئے تھے۔ میں نے تبرا ئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں انہوں نے بتایا کہ حضور! یہ آپ کی امت کے خطیب ہیں۔ جو لوگوں کو امر بالمعروف یعنی نیکی کا حکم کرتے تھے۔ مگر اپنے آپ کو فراموش کر دیتے تھے۔ اہم رزئی نے بھی ایک روایت بیان کی ہے: کہ جہنم میں ایک ایسا شخص بھی ہوگا۔ جس کی بدلہ سے جہنم والے بھی ہزار ہوں گے۔ لوگوں نے عرض کیا: حضور! ایسا بہشتی شخص کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ صاحب علم شخص جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے: کہ جو شخص دوسروں کو نیکی سکھاتا ہے۔ اور خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے چراغ جو دوسروں کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ مگر خود جلتا رہتا ہے۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے: کہ قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا۔ اور اسے اس حالت میں جہنم رسید کیا جائے گا۔ کہ اس کی آنتیں پیٹ سے نکل کر نیچے کی طرف ٹھک رہی ہوں گی۔ وہ شخص آنتوں کو اس طرح کھینچے گا۔ جیسا کہ حاکم اس کو کھینچتا ہے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے۔ اور پوچھیں گے کہ اے فلاں! تجھے یہ مصیبت کس طرح پہنچی۔ حالانکہ تو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا تھا۔ اور برائیوں سے منع کرتا تھا۔ وہ کہے گا۔ ہاں میں تم کو نیکی کا حکم کرتا تھا۔ مگر خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائیوں سے منع کرتا تھا۔ مگر خود باز نہیں آتا تھا۔ اس لیے آج مجھے یہ منزل رہی ہے۔

تو فرمایا اے بنی اسرائیل! تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو۔ بڑے مسئلے بیان کرتے ہو۔ قرآن پاک کی تہائیت کا اقرار کرتے ہو۔ بنی آخر الزمان کے اوصاف حمیدہ بھی بتاتے

۱۔ تفسیر کبیرہ ۲۔ ابن کثیر ۳۔ تفسیر کبیرہ ۴۔ تفسیر کبیرہ ۵۔ ابن کثیر ۶۔

۷۔ مسلم ۸۔ بخاری ۹۔ تفسیر خازن ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔

ہو مگر خود ایمان نہیں لائے۔ اپنے آپ کو فراموش کیے بیٹھے ہو اَفَلَا تَعْقِلُونَ کیا تم میں عقل و شعور کا مادہ نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

صبر و صلوٰۃ کی
برکات

فرمایا وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ یعنی مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ صبر و صلوٰۃ کو اختیار کرو گے۔ تو برائیاں دور ہو جائیں گی۔ ثبوت الہیاء کا علاج بھی تم صبر کے ذریعے کر سکتے ہو۔ نماز پڑھو گے تو عجز و انکاری پیدا ہوگی اور اس میں مختلف بیماریوں کی شفا ہے۔ پھر فرمایا وَرَبُّكَ الْكَبِيرُ اور یہ نماز بے شک بڑی بھل اور بھاری ہے۔ اَلَا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے یہی نماز رحمت کا سامان بنتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اِذَا حَزَبَهُ اَفْسٌ فَنَزَعَ اِلَى الصَّلَاةِ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی۔ تو نماز کی طرف رجوع فرماتے۔ کیونکہ نماز سے تعلق باللہ کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ جب قدر مضبوط ہوگا۔ اسی قدر مشکلات کم ہو جائیں گی۔ انسان کو مصائب کا احساس اسی وقت ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق باللہ کمزور ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ نماز کئی ظاہری بیماریوں کی شفا کا سبب بھی بنتی ہے۔ اہم ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک دفعہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ شدت درد کی وجہ سے آپ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا آپ پر گزر ہوا۔ تو فارسی لہجہ میں فرمایا اَشْكَمُ درد کیا تھا پیٹ میں درد ہو رہا ہے شکم فارسی میں پیٹ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا فَعَسَا کہ حضور ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ قَدْ فَصَلَ فَاِنَّ الصَّلَاةَ شِفَاءٌ اَطْعَمُوا اور نماز پڑھو کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز پڑھی۔ تو پیٹ کا درد دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا کر دی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔

رجوع الی اللہ

تو فرمایا یہ نماز بوجھل ہے۔ مگر عاجزی کرنے والوں پر نہیں۔ اور وہ کون لوگ ہیں الَّذِيْنَ

يُظَنُّونَ جَوَاقِفٍ كَرْتِے ہيں اَنَّهُمْ قُلُقُوا رِيَّهْمُ كِرْوہ پِنے پر ور دگار سے ملاقات
 كرنے ولے ہيں لفظ ظن اضداد معانی ميں استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ اس كا معنی گمان
 بھی ہوتا ہے۔ اور يقين بھی۔ مگر بياں پر ظن كا معنی يقين ہے۔ عربی زبان ميں بعض دوسرے
 كئی الفاظ بھی متضاد معانی ركھتے ہيں۔ جيسے خون كا معنی سياه بھی اور سفيد بھی۔ اسی طرح حليم كا
 كا معنی گرم اور سرد دونوں طرح ہوتا ہے۔

فرمايا یہ نماز اُن لوگوں پر واجب نہیں ہے جنہیں يقين ہے كہ انہيں ايك دن اللہ تعالیٰ
 كی بدگاہ ميں حاضر ہونا ہے۔ وہاں اعمال كی باز پرس ہوگی۔ اور نماز جيسی نعمت كی قدر وہاں جا
 كر معلوم ہوگی۔ اور انہيں یہ بھی يقين ہے وَ اَنَّهُمْ اَنِّيْ رَاجِعُونَ كہ انہيں اللہ تعالیٰ
 ہی كی طرف لوٹ كر جانا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْمُؤْمِنُونَ "متم
 چیزوں كا رجوع اللہ تعالیٰ ہی كی طرف ہے" وَ اَنَّ اِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی اور ہر چیز كی انتہا
 بھی وہيں ہوگی۔ چونكہ عاجزی كرنے والوں كا ان باتوں پر يقين ہے۔ اس ليے وہ نہایت خوشی
 اور ذوق و شوق كے ساتھ نماز پڑھتے ہيں۔ اُن پر یہ بھاری نہیں ہوتی۔

الہ

البقرة ۲

بِسْمِ رَبِّكَ

(آیت ۴۴، ۵۰)

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلٰىكُمْ
وَالْوَيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۴ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزٰٓئُ
نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۝۴۵
اِلٰ فِرْعَوْنَ يَكُوْمِرُنَكُمْ سُوْرَةُ الْكَذٰبِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ۝۴۶ وَاذْ فَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنَاكُمْ
وَاعْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰

ترجمہ: اے اسرائیل کی اولاد! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر

انعام کی اور یہ کہ میں نے تم کو فضیلت بخشی جہاں والوں کے مقابلے میں ۝۴۴

اور ڈرو اس دن سے کہ نہیں بچائے گا کوئی نفس دوسرے نفس سے کچھ بھی، اور

قبول کی جائے گی اس سے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے فدیہ۔ اور نہ ان کی

مدد کی جائے گی۔ ۝۴۵ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم کو نجات دی فرعون

والوں سے۔ وہ چلکے تھے تم کو بہت بُری نذر۔ وہ ذبح کرتے تھے تمہارے

بیٹوں کو۔ اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس بات میں آزمائش

تھی تمہارے رب کی طرف نسبت بڑی ۝۴۶ اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے

تمہارے لیے دریا کو بھاڑ دیا تھا۔ اور ہم نے تمہیں نجات دی اور اہل فرعون کو غرق کیا۔

اور تم دیکھ رہے تھے۔ ۝۵۰

پسے رکوع میں اجمال تھا۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل

بہایات

کا ذکر کیا ہے۔ اور انہیں وہ انعامات و معجزات یاد دلانے ہیں جو ان پر ظاہر کیے گئے تھے۔

نزدیک قرآن کے زمانے کے بنی اسرائیل کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایمان قبول کر لیں۔ نیز اس

قوم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ بل ایان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روش سے بچتے رہیں۔ کہیں ان کی غرابیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فرعون کی خلاقیت میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بے شمار غرابیاں اور سرکشی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مشہور نبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ سرکشی کا جو مادہ اس قوم میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ برقرار رہا۔ یہ سب باتیں ان آیات سے واضح ہوں گی۔

بنی اسرائیل
کی فضیلت

اسرائیل کا معنی اللہ کا بندہ ہے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
لَبِئْسَ مَا كُنْتُمْ يَدْعُونَ فَذَكِّرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں بنی اسرائیل کی غلامی سے
آزادی بحیثیت قوم انیس ہزار تری دینا اور ان میں کثرت سے نبی بھیجنے وغیرہ شامل ہیں اور دوسری بات
یہ کہ وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ میں جہان والوں پر فضیلت بخشی۔ سورۃ مائدہ
میں آتا ہے: إِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مَثَلًا لِّدَاوُدَ اور کثرت سے انبیاء مبعوث
فرمائے۔ اور تم کو وہ چیز عطا کی جو جہان والوں میں سے کسی دوسری قوم کو عطا نہیں کی۔

یہاں پر بنی اسرائیل کی جہاں والوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں وضاحت سے بیان
کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت
کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ گویا دونوں جہانوں میں امت محمدیہ کی فضیلت مسلم
ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے دین میں دینی اور دنیوی ہر دولہانہ
سے باقی تمام عالم پر برتری حاصل تھی۔ اُس زمانے میں اس قوم میں صدائیت بھی پائی جاتی تھی۔
اور اُن کی طبیعت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے
کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک بڑا حصہ تاریخ بنی اسرائیل
پر مشتمل ہے۔ برخلاف اس کے ہندو قوم ہزاروں برس تک برسرِ اقتدار رہی ہے مگر سوائے
چھوٹے موٹے قصے کہانیوں کے ہندوؤں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اپنی یہ غامی خود ہندو بھی

تسلیم کرتے ہیں۔ گو بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں، ان میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ
کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کر لیا۔ انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی۔ تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ اور نہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کئے۔ جنہوں نے اپنے زریں دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ ان مؤرخین میں علامہ طبری، قیسری، صدیقی، جبری میں ہوئے ہیں۔ ابن خلدون اور ابن کثیر، انیسویں صدی کے مؤرخ ہیں۔ ابن اثیر، جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔ جو مفسر بھی ہیں۔ اور تاریخ دان بھی۔ مگر آج ہمیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ مستفید نہیں ہو پاتے جبکہ انگریز کی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ان کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کر دیا، آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے۔ اُسے اب یورپ کے افراد پر فخر ہے۔ ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نہ اُسے محفوظ کرنے کی فکر و تدبیر ہوتی ہے۔

امت مسلمہ
کی برتری

بہر حال یہ چیز بنی اسرائیل کے خصائل میں سے ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو محفوظ کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضیلت بخشی اور فرمایا کہ میں نے تمہیں عاقلین پر فضیلت بخشی۔ یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ عالمین سے مراد اقوام عالم ہیں۔ اور اس سے صرف انسان مراد ہیں۔ کیونکہ دنیا کی باقی اشیاء تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ زَيْنَہُ لَكُمْ۔ لہذا برتری صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ میں اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ فضیلت مطلقاً ہر زمانے کے لیے نہیں تھی حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ میری امت سب امتوں سے

بعد میں آنے والی ہے۔ مگر قیامت کے دن سب آگے ہوگی۔ ان کا حساب و کتاب بھی باقی
امتوں سے پہلے ہوگا۔ اور جنت میں بھی سب سے پہلے جائیں گے۔ انہیں باقی تمام امتوں پر برتری
حاصل ہوگی۔

برتری کا معیار
تقویٰ ہے

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان پر کیے گئے انعامات یاد دلانے کے بعد فرمایا: **وَالْتَقُوا**
يَوْمَآ لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا اور اس دن سے دوسرے دن کو کسی نفس نہ بچائے
گیا۔ دوسرے نفس سے کچھ نہیں۔ بہت ہی خوفناک اور خطرناک دن آنے والا ہے۔ ہر نفس کو
اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق بجھنا پڑے گا۔ یہ دیکھو اس دن انسان کی برتری تقویٰ کے
اعتبار سے ظاہر ہوگی۔ تقویٰ کی تشریح میں شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی تھی: **إِنَّ**
اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ تقویٰ یہ ہے کہ انسان عدل و احسان کا دامن تھام لے۔ قربت
داروں کے حق ادا کرے اور غش اور بے حیائی کی باتوں سے بچتا ہے۔ غصہ اور عمل میں
اپنوں اور بیگانوں سے عدل لازم ہے۔ اور احسان تو بڑی منزل ہے۔ حقوق کی ادائیگی —
اس سے بھی آگے ہے۔ یہ تمام چیزیں تقویٰ میں شامل ہیں۔

مستشفاعت

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی۔
شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش
برحق ہے۔ قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش ہوگی۔ اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی
گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کافر کے حق میں سفارش معفیہ نہیں ہوگی کسی کافر سے
سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: میری سفارش برحق ہے۔ اور یہ میری امت
کے ہر اس شخص کو پہنچے گی **مَنْ رَايَ شِرْكًا بِاللَّهِ شَيْنًا** جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک
نہیں بناتا۔ مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی جیسے وہ
صحیح ہوگا، مشرک اور کافر نہیں ہوگا۔ تو سفارش معفیہ ہوگی۔ **مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَ**

بِإِذْنِ اللَّهِ تَعَالَى كِ اجازت کے بغیر بھی کوئی سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی دوسری شرط یہ ہے
مَوْضِعُ لَمْ قَوْلِهِ سَفَرُ شَيْءٍ كَيْسَ حَقِّ مِیْنِ ہوگی۔ جس کا عقیدہ اور بات اللہ تعالیٰ کو پسند
ہوگی۔ فاسد عقیدہ ان کے ہاتھ میں سفارش کا کوئی مکان نہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔ جس وقت ہر
کوئی چیز مضیہ نہیں ہوگی۔ حشر میں بُرّی بُرّی نہیں آئیں گی۔ جب قمری تجلی دوسرے نازل ہو رہی
ہوگی۔ تو بغیر غلیسہ السدہ نبی تمہارے جائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نفسی نفسی پکاریں گے۔ اس
موقع پر سفارش کہاں ہوگی۔ ہاں بعض دوسرے مواقع پر دو شرائط کے ساتھ سفارش ہوگی کہ اللہ
تعالیٰ کی اجازت ہو اور جس کے حق میں سفارش کی جا رہی ہے۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔

فرمایا اُس دن سے ڈر جس دن سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ وَلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ اور جس دن فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کہ کوئی شخص فدیہ دے کر اپنی
جان چھڑا سکے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ صاف موجود ہے کہ اگر کوئی شخص سونے کی
بھری ہوئی پوری زمین بھی فدیہ دیکر اپنی جان بچانا چاہے گا۔ تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اول تو اتنا
مال و دولت، سونا، چاندی، مسیا ہونا ہی ناممکن ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے۔ تو اتنا بڑا
فدیہ بھی کسی کا نہ آئے گا۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ اور نہ کسی طرف سے ان کی مدد ہوگی۔ دنیا
میں کسی کو چھڑانے کے یہی طریقے ہیں۔ کیسے سفارش چل گئی۔ کیسے فدیہ یا نذرانہ دے دیا یا کہیں جتنا بند
کرنی۔ مگر مین حشر میں ان میں سے کوئی چیز بھی کارگر نہیں ہوگی۔

بعض لوگوں نے سفارش کا عقیدہ بالکل ایسا بنایا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے کفارے
کا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ یہ غلط عقیدہ ہے۔ سفارش حقیقت میں انسان کے عقیدے اور اعمال
کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہودیوں نے بھی غلط امید لگا رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ اور وہ کسی ختنہ کے ہوئے اسماعیل کو دوزخ میں
نہیں گرنے دیں گے۔ مگر جو چاہیں کرتے رہیں۔ دوزخ میں نہیں جاسکتے۔ آگے آ رہا ہے کہتے

تھے۔ وَقَالُوا لَنْ نَمُوتَ الشَّارِرُونَ يَا مَعْزُودَةٌ اگر ہم دونوں میں گئے بھی تو
 ہم فتنے دن کے لیے جتنے دن ہمارے ہوں گے بچنے کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ لَنْ
 يَدْخُلَ الْجَنَّةَ رَافِعٌ كَانَ هُوَذَا أَنْصَرِي یعنی جنت کے دروازے
 یورن اور عیسائی میں۔ ان کے علاوہ اور بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ امر غلط تعبیر ہے
 سفارش کے متعلق ہم لوگوں نے اسی قسم کا عقیدہ بنایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رضی ہو یا، فرض ہے
 درست ہو یا باطل، اعمال کا کوئی حصہ ہو یا نہ ہو، ہمارے سفارشی میں بچا لیں گے۔ فیہوں کی شریعتیں
 بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے۔ مکلف منہوں ہوتا ہے۔ اس سے بچا لیں
 ہوتی ہے۔ عقیدے اور اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا، قرآن پاک میں صرف موجود ہے، تاتاق
 كُلُّ نَفْسٍ نَجَاهُ عَنْ نَفْسِهَا بِنَفْسٍ بِذِي عِلْمٍ سے دنیا کرتے گا۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ دو دن بھی آنے والے ہیں جس دن اللہ تعالیٰ
 انسان سے براہِ راست خطاب کرے گا۔ وَلَيْسَ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ شَرٌّ جَانٍ جب
 خدا تعالیٰ اور انسان کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، براہِ راست سوال و جواب ہوں گے۔
 انسان سوال ہے اور جس سفارش کے عیسائی یا مشرک یورپی قائل ہیں، ایسی سفارش کا اسلام میں
 کوئی مقام نہیں ہے

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوتا ہے: وَذُحِّيْتُكُمْ مِنْ
 فِرْعَوْنَ اور یہ کہ وہ اس وقت کو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی، فرعون نے
 بنی اسرائیل پر عذاب کر کے پھاڑ ڈالا تھا۔ اس کے عذاب بھی اس کی زبان میں ملے تھے۔
 اور عذاب دسم میں فرعون کے ساتھ شریک ہوتے تھے، وہ تمہارے ساتھ کیا سرگ کرتے تھے۔
 يَوْمَ مَوْنَكُمْ سُوْرَ الْعَذَابِ وہ تمہیں عذاب کے دن میں مونس بنے تھے۔ يَذُحُّوْنَ
 بَنَاءَ كُمْ مَدَائِكُمْ پھر وہ بچ کر رہتے تھے۔ وَيَسْتَحْيُونَ نَسَاءَكُمْ اور تمہاری عورتوں
 کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

مردوں کے قتل اور عورتوں کے زندہ رکھنے کا نمل بنی اسرائیل کے ساتھ دودھ بھری گئی۔ پہلی دفعہ یہ ظلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے دیا گیا۔ جب بچوں نے پیش گوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ اُس وقت فرعون نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہو۔ اُسے ذبح کر دیا جائے اور اُسے زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مگر جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر میں ہی اُن کی پرورش کی۔ اور وہ سارے واقعات پیش آئے جو سورۃ قصص میں مذکور ہیں۔

ظلم کی اس چکی میں کتنے بچے پیسے۔ اسکے متعلق مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُس وقت نوے ہزار بچے ذبح کئے گئے۔ ظلم و جبر کی یہ انتہا تھی۔ اُن والدین کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ جن کے سامنے ان کے نومولود بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ ایسے والدین کی پریشانی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اُس احسان کو یاد کرو۔ جب میں نے تمہیں اس ظلم سے نجات دی۔

بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا دوسری دفعہ حکم فرعون نے اُس زمانے میں دیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بن کر آئے اور تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ اس وقت فرعون کو دوبارہ خطرہ پیدا ہوا کہ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے کسی طرح کم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بڑا بچہ پیدا ہو۔ اُسے پید ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ لڑکیاں ہماری خدمت گزاری کے کام آسکیں گی۔

فرمایا وَفِي ذَلِكَ لَكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ بنی اسرائیل کے لیے واقعی یہ بہت بڑی آزمائش تھی کہ اپنے سامنے بچوں کو ذبح کرنا کہ وہ کس طرح اس امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جب بنی اسرائیل اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہت اور حوصلہ نہ چھوڑا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ظلم سے نجات دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دوسرا بڑا احسان یہ بتلایا **وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ** اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا اور تم کو نجات دی بنی اسرائیل جب ہجرت کر کے مصر آئے تھے۔ تو اس وقت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کے بہتر آدمی تھے۔ چار پانچ صدیوں کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ستر ہزار ہو چکی تھی موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میرے ان بندوں کو لے کر یہاں سے نکل چلیں۔ آپ نے اپنی قوم سے مشورہ کیا اور طے یہ پایا کہ بغیر اطلاع یہاں سے نکلنا درست نہیں بعد فرعون سے اجازت حاصل کر لینی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون سے اجازت طلب کی کہ ہم باہر کسی تقریب میں جانا چاہتے ہیں اجازت مل گئی۔ انہوں نے فرعونوں سے زیورات وغیرہ بھی حاصل کر لیے۔ کہ ایک خاص تقریب میں شامل ہونا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل سفر پر روانہ ہو گئے۔ سارا دن گزر گیا۔ اگلی رات فرعونوں کو احساس ہوا کہ کہیں بنی اسرائیل بالکل ہی نہ چلے جائیں۔ ان کا پتا کرنا چاہیے۔ فرعون نے تعاقب کا حکم دے دیا۔ ایک دن لشکر کی تیاری میں گزر گیا۔ اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ بنی اسرائیل مسلسل چلتے رہے۔ مصر سے مشرق کی جانب بیکہ قلمزم آتا ہے۔ اس کو عبور کرنے کے بعد صحرائے سینا آتا ہے۔ یہ بارہ کوس کی مسافت ہے۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ فرعون کا لشکر بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ شکاری اور بازاری لوگ ملا کر کل نفری ساٹھ لاکھ کے قریب تھے۔ اور جب بنی اسرائیل بیکہ قلمزم کے کنارے پر پہنچے تو پتا چلا کہ پیچھے فرعون لشکر لے کر آ رہا ہے بڑے گھبرائے کہ اب تو ہم بچ پڑے جائیں گے۔ اور ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تسلی دی کہ گھبراؤ مت **إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ** بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ضرور راہنمائی کرے گا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا **أَنَّا اضْرِبُ بِعَصَايَ الْبَحْرَ** یعنی اے موسیٰ اپنی رومی سے سمندر میں بارہ جگہ ضرب لگاؤ۔ بنی اسرائیل کے بارہ

قبیلے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارہ مقامات پر ضرب لگائی اور بارہ
 رستے کمند میں بن گئے۔ بارہ کوس کے لیے رستے میں پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ گون پانی
 سمجھ ہو گیا۔ اور ان بارہ راستوں کی درمیان دیواروں میں کھڑکیاں بھی بن گئیں۔ تاکہ دریاں ہر ایک
 قبیلے کے ایک دو سے قبیلے والوں کو پہنچ سکیں۔ یہ سب کچھ معجزانہ طور پر ہوا جس کی تفسیر قرآن
 پاک اور تفسیر میں موجود ہے۔ مگر سرسبز اور پودوں کی فرق اس کا احوال کرتے ہیں۔

بہر حال تمام قبیلے اپنے اپنے رستوں پر روانہ ہوئے۔ تیغیے سے فرعون کا لشکر بھی ان
 پہنچا۔ انہوں نے دیکھ کر پانی میں رستے بنے ہوئے ہیں۔ اور بنی اسرائیل ان راستوں پر چل
 دیاں ہیں۔ فرعون کھڑوں پر سوار تھے۔ مگر ان کے گھوڑے پانی میں نہانے کے لیے تیار نہ
 تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل علیہ السلام کو کھڑی پر سوار کر کے بھیجا۔ آپ آگے چلے۔ کھڑی
 کی بوسٹھ کر فرعون کا کھڑا بھی تیغیے چل پڑا۔ میکائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون کے
 سارے لشکر کو تیغیے روک چنانچہ انہوں نے کہا کہ دیکھو بنی اسرائیل تمہارے ہاتھوں سے نکلے
 جاتے ہیں۔ حاقب کر کے ان کو پھڑ پھڑا کر چنانچہ سارا لشکر پانی میں بنے ہوئے راستوں پر چل نکلا
 بنی اسرائیل بارہ کوس مسافت طے کر کے کمند سے پار ہو گئے۔ اور فرعون کا سارا لشکر پانی میں
 بنے ہوئے رستوں کے درمیان آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: **فَغَشَّيْهُمْ مِنَ اللَّيْلِ**
مَا غَشَّيْهُمْ پھر پانی کی موجوں نے انہیں اس طرح گھیر کر ان میں سے ایک بھی زندہ نہ
 بچا۔ صرف فرعون کی ریش کو پانی نے عبرت کے لیے باہر بھینک دیا۔ اسی واقعہ کو یاد دہاتے
 ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَأَغْرَقْنَاهُ فِي غَرَضٍ ثُمَّ تَمَادَّ فِرْعَوْنُ وَكَانَ يَرِيدُ**
تَمَازُؤًا اور یہ سب کچھ تباہی آنکھوں کے سامنے ہو گیا۔ اس حسان کو یاد کرو۔ جب تمہارا
 لیے کمند میں۔ رستے بنائے بن کے ذریعہ تم نے کمند کو جو کرنا۔ اور فرعونوں سے نجات پال۔
 مگر اس پانی میں فرعون کے سارے لشکر کو تباہ کرنے کے حلق کر دیا۔ ان حسانات کو یاد دلانے کا مقصد
 یہ تھا کہ اب بھی اپنی برائیوں سے باز آ جاؤ۔ اور اُس دن سے ڈر جاؤ۔ جس دن نہ کئی سزا کا کام آئے
 اور نہ کسی سے نذر قبول کیا جائے گا۔ وہ کچھ میں نے تمہارے لیے نہاں کیا ہے اس پر ایمان رکھو۔

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِمَّن بَعْدَ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَارَأَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقْوِمُ رَأْسُكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

ترجمہ: اور اُس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا۔ اور تم ظلم کرنے والے تھے ﴿۵۱﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو اس کے بعد تاکہ تم شکریہ ادا کرو ﴿۵۲﴾ اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿۵۳﴾ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! بے شک تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ بوجہ بنائے کے بچھڑے کو معبود۔ پس توبہ کرو اپنے پیہ کرنے والے کے سامنے۔ پس قتل کرو ایک دوسر کو۔ یہ بہتر جتنا ہے پیہ کرنے والے کے پاس۔ پس اُنہی نے رجوع کیا تمہارے اوپر بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿۵۴﴾

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو نعمات فرمائے ان کا ذکر مسلسل آ رہا ہے۔ فرعون کی غلامی سے نجات دلانے، دریا کو پھاڑ کر معجزانہ طور پر پانی میں راستے بنانا اور بنی اسرائیل کو بچانا اور پھر فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت وغیرہ کا ذکر آچکا ہے۔ اس درس میں بعض مزید نعمات کا تذکرہ ہے۔ منجملہ ان کے بنی اسرائیل کو کتاب اور شریعت عطا کرنا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَرَدَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً اس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ کوہ طور پر چالیس رات تک تنہائی میں اعتکاف کریں۔ قرآن پاک میں ہے کہ اصل وعدہ ایک مہینہ کا تھا۔ مگر بعد میں بڑھا کر چالیس رات کر دیا گیا۔ وندہ یہ تھا کہ مسلسل چالیس رات کے اعتکاف کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جائے گی۔ اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر چکے تھے۔

وَعَدْنَا بَابَ مَنَا عِلْمَ کَاصِیغَہ ہے۔ اور اس کا معنی بھی وَعَدْنَا ہی ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنی رسول اور صاحب شریعت تھے۔ نہ تعالیٰ کے خلیفہ بھی تھے۔ لفظ موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جسے عربی میں موحی یا موحی ہے۔ عبرانی زبان کا اصل لفظ مَحِیث تھا۔ معنی پانی اور شا کا معنی درخت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں پانی میں بہتے چلے آئے تھے۔ جب انہیں اٹھایا گیا وہاں درخت بھی موجود تھے۔ اس بنا پر آپ کا نام میثا اور پھر عربی میں موسیٰ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سولہ سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر مبارک ایک سو تیس سال تھی۔ اسی عمر میں یہ سائے واقعات پیش آئے۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا۔ آپ کا شجرہ نسب اس طرح ہے موسیٰ بن عمران بن بصیر بن فہر بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم لاوی بن یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور عرف عام میں بڑا بیٹا بن ریاست اور نیابت کا وارث ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام کو دونوں حیثیتیں حاصل تھیں حقیقی ریاست یعنی نبوت بھی ان کو حاصل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول بنایا۔ اور عام ریاست یعنی نیابت بھی بڑا ہونے کی حیثیت سے آپ کو ہی حاصل تھی۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کو احساس ہوا کہ وہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ لہذا ان کے پاس اپنا قانون بنانا چاہیے۔ جس سے وہ رہنمائی حاصل

کریں۔ اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔ چنانچہ قوم کی خواہش پر موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہمیں کوئی قانون عطا کیا جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ طور پر آکر چالیس دن کا اعتکاف کرو۔ تو تمہیں کتاب دی جائے گی۔ جو تمہارے لیے مکمل قانون ہوگی۔

تفسیر معالم التنزیل اور بعض دیگر تفسیر میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا میں وارد ہوئے اور انہوں نے چالیس سال میدان تیر میں گزارے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی وہیں ہوئی۔ ہارون علیہ السلام بھی اسی مقام پر فوت ہوئے۔ تاریخ سے بھی یہ چیز ثابت ہے کہ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ہی صحرانوردی کرتے رہے۔ یہ لوگ مصر کی طرف نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ارض مقدس پر حملہ کرو۔ وہاں پر تمہیں قبضہ دلایا جائے گا۔ مگر یہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چالیس سال بعد نئی نسل نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ارض مقدس پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے، اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ کوان کے زمانے میں شام اور فلسطین پر بنی اسرائیل قابض ہوئے۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں قوم عمالئہ کی حکومت تھی۔

معالم التنزیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر قلزم کو پار کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کے کچھ آدمیوں کو مصر کی طرف بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کا انتظام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ چور، ڈاکو، قزاق، مفسد وغیرہ ملک میں بد امنی پھیلادیں۔ یہ بات اگرچہ عام روایتوں کے خلاف ہے تاہم اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بعض لوگوں کو وہاں بھیجا ہو۔ مگر آپ خود وہاں نہیں گئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کوہ طور پر معتکف ہوئے تو وہاں سے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراہ ملی۔

توراة کا اعلیٰ معنی قانون ہے اور اس سے مراد قانون شریعت ہے۔ اپنے زمانے میں توراة بڑی عظیم المرتبت کتاب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ ایسی کتاب عنایت کروں گا۔ جسکی شریعت اور قانون قرون تک جاری رہے گا۔ آسمانی کتب میں سب سے اعلیٰ مرتبہ قرآن پاک کا ہے اور اس کے بعد توراة کا۔ جس طرح قرآن پاک میں قانون فوجداری۔ دیوانی۔ اخلاق۔ عبادات معصوم وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح توراة میں بھی ہر قسم کے قوانین موجود ہیں جس طرح توراة کا معنی قانون ہے۔ انجیل کا معنی بشارت ہے۔ زبور کا معنی صحیفہ ہے۔ اور اس میں زیادہ تر دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن ہے۔ جس کا معنی پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

حکمت نامہ
نعمت ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ذوالقعدہ کی ابتداء میں کوہ طور پر معصیت ہوئے اور ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے توراۃ عطا کی۔ گویا پورا ماہ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن آپ نے اعتکاف کیا۔ یہ چالیس دن کا بھی خاص اثر ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ أَخْلَصَ لِلَّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ظَهَرَتْ يَتَابِعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ عَلَى لِسَانِهِ جس نے چالیس دن تک اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کیا۔ حکمت اس کے دل سے نکل کر اس کی زبان پر ظاہر ہو جائے گی۔ حکمت و الثور کو کہتے ہیں اور یہ بڑی گہری بات ہے جسے نصیب ہو جائے۔ وَمَنْ يَتَوَاتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی۔ اُسے خیر کثیر مل گئی۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اِمْسِكْ لِقْمَانَ كَحِكْمَتِ عَطَاكِ۔ یہ لقمان اللہ والے ایک بزرگ تھے۔ نبی نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی دانائی عطا کی تھی۔ تو مقصد یہ ہے کہ چالیس دن تک اخلاص برتنے سے حکمت زبان پر جاری ہو جائے گی۔ حدیث شریف کا یہ مطلب ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ خُصِدَ طین اَدَمَ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا
اَدَمَ عَلَیہِ السَّلَامُ اَنْ تَمُوتَ یَاسُ رَوزِ تَمَکِ خَمِیْرِ کُنْ گئی۔ اور یہ اللہ کے سلسلے میں بھی آتا ہے۔ کہ جب

مددی سیر
کی حکمت

حمل قرار پاتا ہے تو چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے۔ اس کے بعد علقہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے چالیس دن بعد گوشت کا لوتھر بنتا ہے۔ پچھ چالیس دن بعد اس میں روح انسانی ڈالی جاتی ہے۔ اس سے پٹہ روح حیوانی ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام عام طور پر چالیس دن کا پندرہ مرتبہ میں چالیس دن روزہ بھی رکھواتے ہیں۔ اور عبادت بھی کر دیتے ہیں جس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک خوبصورت عورت باجماعت نماز پڑھا کرتی تھی۔ کسی نوجوان کی نظر پڑی تو اس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے عورت کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ وہ بھی سمجھ گئی۔ کہ یہ شخص فتنے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ عورت کامل الایمان تھی۔ کہنے لگی کہ میں تجھے ملاقات کا موقع اس شرط پر دیتے کو تیار ہوں کہ تم حضرت عمرؓ کے پیچھے چالیس دن تک نماز ادا کرو۔ اور یہ اس حالت میں ہو کہ تمہاری بکیر اولیٰ فوت نہ ہو۔ اس شخص نے اسے نہایت آسان کام سمجھتے ہوئے نماز باجماعت شروع کر دی۔ ابھی وہ روز ہی گزرتے تھے کہ اس میں تغیر آنا شروع ہو گیا۔ جب چالیس دن مکمل ہوئے تو اس شخص کی کایا ہی پٹ چکی تھی۔ اب اس عورت نے پیغام بھیجا کہ تمہاری شرط پوری ہو چکی ہے۔ تم اگر ملاقات کر سکتے ہو۔ نوجوان نے جواب بھیجا کہ اب میری ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہو چکی ہے۔ تمہاری ملاقات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چالیس دن کے چلنے کا اس نوجوان پر یہ اثر ہوا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس واقعہ کا ذکر اپنے خاوند سے کیا۔ اور اس نے سارا واقعہ حضرت عمرؓ کو سنا دیا۔ آپؓ فرمایا صَدَقَ اللہُ تَعَالٰی اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا اِنَّ لِمَنْ سَلَوٰةً تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاۃِ وَالْمُنْكَرِ بے شک نماز بے حیائی اور بڑے کاموں سے روکتی ہے۔ اور پھر نماز بھی ایسی جو امیر المؤمنینؓ کے پیچھے ادا کی گئی ہو۔ سُبْحَنَ اللہ اس کا کیا ہی اثر ہو گا۔ بہر حال چالیس کے عدد کا یہ خاص اثر ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لیے کوہ طور پر معتمد ہو گئے تُو اتَّخَذْنٰہُ
الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِہٖ۔ تم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھرت کو عبود بنایا۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ مگر سالہ پستی

اور تم بڑے ظلم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود تم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حالانکہ "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَالْكَافِرُوْنَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ" کافر کرنے والے بہت بڑے ظلم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دخل انداز کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شریک بٹھراتے ہیں۔ سورۃ طہ میں آتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے رہے۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ گوسالہ پرستی ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ میت سمجھ کر صرف بچھڑے کی پوجا ہی شرک نہ فعل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوجھ کی بھی پوجا کی جائے گی۔ وہ شرک ہی ہو گا۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ "فَعَسَىٰ عَبْدُ الْبَنِيَّ تَبَادُوهُ دِيَارًا كَابِدَهُ تَبَاهُ يَوْمَ دَرَمٍ كَابِدَتَاهُ يَوْمَ كَيْلٍ كَابِدُوهُ"۔ "اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَمْ يُعْطَ سَخِطَ" اگر اسے دے دیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ یہ دراصل درجہ و دنیا کی عبادت ہی تو ہے۔ اس کو بھی گوسالہ پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک عام معمول ہے کہ جو چیز تجھے نہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دیتی ہے۔ وہ تیرا طاغوت ہے۔

مختلف قوموں کے
بیک وقت
اثرات

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہارون علیہ السلام جیسے نبی کی موجودگی میں بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کی غالب وجہ یہ ہے کہ مصر میں صدیوں تک رہتے ہوئے بنی اسرائیل نے مصریوں کے اثرات قبول کر لیے تھے۔ مسرن لوگ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ لگائے کی پوجا کرتے تھے۔ اور سوج کی پوجا کرتے تھے۔ فرعون کا معنی ہی بڑا دیوتا ہے۔ اور یہ سوج کے نام پر بنایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مظاہر ندرت کی پوجا کرتے تھے۔ یہی چیز بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر چکی تھی۔ لہذا انہوں نے بھی بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

اقوام عالم کے ایک دوسرے پر اثرات تاہیٰ کی طور پر ثابت ہیں۔ برصغیر کے مسلمان ہندوؤں کے آثار سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کی بہت سی دیکھیں سکندروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مرنے والے کا تیجا۔ ساتواں۔ پالیسواں وغیرہ ہندو مذہب میں۔ درختوں کی لڑکیوں کا ان دیکھوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل چونکہ مصریوں کے غلام تھے۔ لہذا انہیں ان کے اثرات بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر گئے۔ موجودہ زمانے میں دیکھ لیس جو قومیں انگریزی غلامی میں رہی ہیں۔ وہ سب ان کی تمنہیب و تمدن سے متاثر ہیں۔ مشرقی ممالک میں سے ایرانیوں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے ان کا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال عربوں مصریوں اور شامیوں کا ہے۔ بعینہ مصریوں کی عادات بنی اسرائیل میں سرایت کر چکی تھیں۔ لہذا موقع ملتے ہی انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

بعض اسرائیلی اصولی عقیدہ کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کر جاتا ہے۔ اور اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ہندوؤں میں اوتار کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی شکل میں ظاہر ہو گیا ہے۔ یا فلاں جہنم میں اس نے ظہور کر لیا ہے۔ تو اسی قسم کے غلط عقیدہ کی بنا پر سامری بخت انیس نمبر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ سامری نے کہا "هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ" یعنی تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا الہیسی ہے اللہ تعالیٰ اس بچھڑے میں حلول کر آیا ہے۔ لہذا اس کی پوجا شروع کر دو۔ بچھڑے نے ہاں تو شروع کر ہی دیا تھا۔ جمال قسم کے بنی اسرائیل سامری کی باتوں میں آگئے۔ اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

باقی۔ بایہ سوال کہ سامری نے یہ کد کد کیسے ظاہر کر دیا۔ تو یہ شخص مسیحا، مسٹر یا مداری یا جادوگر تھا۔ وہ مختلف قسم کے نیک جانتا تھا، چنانچہ اس نے چال بازی سے کام لیا۔ جب فرعون کا لشکر بنی اسرائیل کے تعاقب میں بحیرہ قلزم پر پہنچا اور ان کے گھوڑے سمندر میں اترنے سے بچھڑے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار کر کے بیجا جو لشکر فرعون کے آگے آگے چل رہی تھی۔ سامری نے دیکھا کہ جس جگہ پر جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کا پاؤں لگتا ہے وہاں فوراً ہنر اُگل آتا تھا۔ وہ بچھڑا۔ کہ اس میں کوئی کد کد ہے، اس نے گھوڑی کے پاؤں کی جگہ کی گھوڑی سی سی نمونہ کر لی۔ وہ سارے تر تھا ہی۔ اس نے سونے کا بچھڑا بنایا۔ اور اس کے منہ

میں وہ مٹی رکھ دی۔ جس کی وجہ سے بچہ پڑے نے بولنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے مشہور کر دیا۔
کہ خدا تعالیٰ اس میں حلول کر آیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام
کی واپسی

موسیٰ علیہ السلام چالیس روزہ اعتکاف کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب لے کر واپس آئے
تو دیکھا کہ کئی لوگ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ سخت ناراض ہوئے۔ مشرکین کو زجر کیا۔
اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے بھی بڑے ناراض ہوئے کہ آپ نے قوم کو شرک میں مبتلا ہونے
سے کیوں نہ روکا۔ بھائی نے عذر پیش کیا کہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو انہیں ہر چند شرک
سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر یہ تو میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ "وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي"
یہ سارا واقعہ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات
نہیں مانتے تھے۔ تو آپ ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ اس کے جواب میں ہارون علیہ السلام
نے کہا کہ میں نے تفریق کو پسند نہ کیا۔ کہ آپ واپس آکر اعتراض کرتے کہ قوم کو دو ٹکڑوں
میں کیوں تقسیم کر دیا۔ ان میں پارٹی بازی پیدا کر دی ہے۔ لہذا میں نے انہیں کے درمیان بہتے
ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان بدبختوں نے میری بات نہ مانی۔

بچہ پڑے کے
بجاریوں کا
قتل عام

جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان ہو گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ
انہوں نے غلط کام کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو عرض کیا کہ ہمارے اس جرم کا ازالہ کس
طرح ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ مِّنْ اٰیٰتِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ تمہاری توبہ قبول کر لی مگر بڑے
سخت طریقے سے جیسا کہ آگے آیت میں آتا ہے۔ وَإِذْ آمَنَّا مَوْسٰی الْكَتٰبَ وَالْقُرْآنَ
جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور فرقان یعنی فیصلہ کن طاقت یا معجزات عطا کیے
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا وَإِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهِ یَقَوْمِ اِنَّكُمْ
ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔
بِاِتِّخَاذِکُمُ الْبَعْدَ کہ ایک بچہ پڑے کو معبود بنالیا ہے، فتَوَلَّوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ
پس توبہ کر اپنے پیہ کر لے اے کے سامنے اور یہ توبہ صدق دل سے ہونی چاہیے۔ محض زبانی

توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا طریق کار یہ متعین فرمایا کہ فَاَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ اپنی
 جن جانوں کو قتل کرو۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ مشرکوں کو قتل کر
 دیں۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ فرمایا یہ بظاہر بہت بڑا امتحان ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے
 کو قتل کرو۔ مگر یاد رکھو ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ یہ بات تمہارے
 پیہا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔

الغرض حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ان بارہ بھائیوں کو لے کر آگئے جنہوں نے
 پکھڑے کی پوجا سے اجتناب کیا تھا۔ اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں
 برہنہ تواریں تھیں۔ ہارون علیہ السلام ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور کہتا يَا مَعْشَرَ بَنِي
 اِسْرَآئِيْلَ اِنَّ اِخْوَانَكُمْ اَتَوْكُمْ شَاهِرِيْنَ سَيْوْفَهُمْ يُرِيدُوْنَ
 اَنْ يَّقَتُلُوْكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْبِرُوْا یعنی اے بنی اسرائیل کے گروہ۔ یہ تمہارے
 بھائی برہنہ تواریں لیے تمہارے قتل کے لیے آئے ہیں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ اپنے
 قتل میں مزاحمت نہ ہونا۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کے ہمراہیوں نے تواریں چلانا شروع کر دیں ان
 کے پیٹے ہی عزیز واقارب مائے گئے۔ بیشمار لوگ قتل ہوئے۔

فرمایا جب یہ شرط پوری ہوگئی تو فَتَابَ عَلَيْكُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے تمہاری توبہ قبول
 کر لی اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے توبہ
 کی قبولیت کا فائدہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل قتل ہو کر آخرت کے دائمی عذاب سے بچ گئے۔

الْقَدْرُ
درس بت در

البقرة
(آیت ۵۵ تا ۵۷)

وَإِذْ قُلْتُمْ يُعْرَسَىٰ لَئِنْ تَوُفَّيْتُمْ لَأَنزِلَنَّ اللَّهُ جَهَنَّمَ فَلَاحُذَلُكُمْ
الضُّعِفَ ۚ رَأَيْتُمْ تَتَنظَّرُونَ ۝ ٥٥ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ
مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ٥٦ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ
الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ كَأَنَّ الْغَمَامَ
طَبَيِّتٌ مَّا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ
يُظْلِمُونَ ۝ ٥٧

ترجمہ: اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے۔

تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر پس پھر یہاں تک کو بھیجی گئی اور تم دیکھ رہے تھے ۵۵

پھر اٹھایا ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ۵۶ اور ہم نے تمہارے

اوپر بادل کا سایہ کر دیا۔ اور تمہارے اوپر من اور سلویٰ اتارا۔ لکھا: پاکیزہ چیزیں جو ہم نے

تمہیں روزی دی ہیں۔ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ۵۷

بنی اسرائیل کی خرابیوں اور ان کی سرکشی کا ذکر آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر جو

ربط آیات

انعامات کیے ان کا ذکر بھی ہو گیا ہے۔ گزشتہ درس میں بیان ہوا تھا: وَإِذْ أَنزَلْنَا

الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ ۚ یعنی اس وقت کو دھیان میں لاؤ۔ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب

اور فیصلہ کن بات عنایت کی۔ اس کے لیے خود بنی اسرائیل کے لوگوں نے خواہش ظاہر کی

تھی کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ حیات ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور

پر اعتکاف بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اور تکمیل اعتکاف پر اللہ تعالیٰ نے توراۃ عطا فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کتاب توراۃ لے کر قوم کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے

روایت ہے
کی خواہش

تمہارے لیے یہ ضابطہ حیات دیا ہے۔ قوم نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سنا دیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے

کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ

نے آپ کو دی ہے۔ یا آپ خود بنا لائے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اُسی واقعہ کی طرف اشارہ کئے گئے ہیں۔ اسرائیل کو خطاب ہے وَإِذْ قُلْنَا لَهُمْ يُوسَىٰ اذْهَبْ اَنْتَ وَآخُوتَاكِ بِذِكْرِ رَبِّكِ هِيَ هُنَا۔ کہائے موسیٰ: يَا مَرْيَمُ اقْنُصِيْكِ اَنْتَ وَآخُوتَاكِ بِذِكْرِ رَبِّكِ هِيَ هُنَا۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہے۔ حَتَّىٰ نَسْرىَ اللّٰهَ جَهَنَّمَ یہاں تک ہم خود اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ چلو تمہارا بیٹا یہ شرط بھی پوری ہوگی۔ آپ نے ستر آدمی منتخب کئے۔ کہ میرے ساتھ طور پر چلو۔ وہاں میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست سنا دوں گا کہ یہ کتاب اُسی نے نازل کی ہے۔ قوم طور پر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ آپ نے ہر قبیلے سے نوچر آدمی نکلے۔ بارہ قبیلوں کے ستر آدمی جمع ہوئے۔ ان میں دو آدمی حضرت یوشع اور قابیل کے گئے۔ کہ ہمیں آپ کی بات پر یقین ہے۔ لہذا ہمیں طور پر جانے کی ضرورت نہیں۔ چوہا ان دو آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام: يَا مَرْيَمُ اقْنُصِيْكِ اَنْتَ وَآخُوتَاكِ بِذِكْرِ رَبِّكِ هِيَ هُنَا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔ کہ ہاں یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی بات سننے کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائے۔

بعض مفسرین کرم کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے کچھ بڑے کی پوجا کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا۔ کہ کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے اس فعلِ شیع کی معافی طلب کریں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد ان لوگوں نے یہ بے ادبی کی۔ کہائے موسیٰ: يَا مَرْيَمُ اقْنُصِيْكِ اَنْتَ وَآخُوتَاكِ بِذِكْرِ رَبِّكِ هِيَ هُنَا۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق نہیں کریں گے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

تفسیری روایات اور بائبل کی روایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ سننے کے بعد بھی توبہ کو کتاب الہی تسلیم نہ کیا فَاَحَدٌ مِنْكُمْ الصَّٰعِقَةُ تَوٰنِسُ۔ بجلی نے پکڑ لیا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی کہ کیمدم بجلی چلی اور سب کو فنا کر گئی۔ کہتے ہیں کہ

بجلی دراصل عالم مثال کا حجاب نوری یا ناری تھا۔ جس کی چمک ظاہر ہوئی تھی۔ اور جوان لوگوں کی
تباهی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا۔ کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔
وَأَنْتُمْ مُنْظَرُونَ۔

رویت الی اس
جہاں میں ممکن نہیں

بنی اسرائیل کی رویت الہی کی شرط قابل قبول نہیں تھی۔ کیونکہ اس جہاں میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہاں کے بعد جب اگلے جہاں میں سنبھیں گے۔ تو وہاں پر یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اِنَّكُمْ لَنْ تَدُوْرَ رَبَّكُمْ عَزَّوَجَلَّ حَتَّى تَمُوْتُوْا تَمَّ مَعْنٰی بغیر اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی رویت تمام محدثین اور فقہار کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو گا۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَجُوْہٌ یُّنَظَّرُوْنَ نَاضِرَةٌ ۝۱۶۱ اِلٰی رُفُفًا نَاضِرَةٌ ۝۱۶۲ ہلکی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے۔ مگر یہ سب اگلے جہاں کی بات ہے۔ اس جہاں کے کثیف اعضاء میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ زیارت الہی سے مشرف ہوں۔ بلکہ اگلے جہاں کے لطیف اعضاء میں اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت پیدا فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی رویت کا انکار بعض گمراہ فرقے مثلاً رافضی، معتزلہ اور خارجی وغیرہ کرتے ہیں۔ جن کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ممکن ہے۔ اور نہ اگلے جہان میں دلیل ان کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے۔ جہت اور سمت سے بھی پاک ہے۔ اور رویت کسی مکان اور سمت میں ہی ممکن ہے۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے وغیرہ لہذا اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رویت قرآن و سنت سے ثابت ہے مگر اس رویت کی کیفیت کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بے کیف رویت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ انسان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دے کہ اسے بے کیف رویت الہی نصیب

ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ روایت تو یقیناً ہوئی مگر لا تَذَرُكَهُ
الْبُصَارُ وَهُوَ يُذَرُّكَ إِلَّا بُصَارَةً۔ انسانی آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر وہ
آنکھوں کو پالیتا ہے۔ یہاں یہ کیفیت ہے۔ مگر وہاں کیا ہوگا۔ وہاں تو تجلیات ہوں گی۔ اور
علی قدر المراتب ہوں گی۔ وہاں ذاتی اور صفاتی دونوں قسم کی تجلیات ہوں گی۔ جن میں انسان دیکھے گا
خدا تعالیٰ کی روایت اس طریقے سے ہوگی۔ مگر یہ اس جہاں میں ممکن نہیں۔

آگے سورۃ اعراف میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام
کیا تو انہیں روایت کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ عرض کیا رَبِّ ارْنِیْ اَنْظُرَ الْیَتِّ ذُو الْکَرِیْمِ میں تجھے
ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا لَنْ تُرَیْہُ تَمْنِیْنِ دیکھ سکتے فرمایا پیڑ کی طرف دیکھو۔
فَاِنْ نَسَقْنَا مَکَانَہُ فَتَوَفَّ تَرَسِیْنِ اگر یہ پیڑ اپنی جگہ پر قائم رہ گیا تو پھر شاہ تَم
بھی مجھے دیکھ سکے۔ فَلَمَّا تَحَلَّى رَبُّہُ لِلْجَبَلِ جب اللہ تعالیٰ نے پیڑ پر تھوڑی سی تجلی ڈالی۔
سَحَلَّہُ دَکَّآ۔ پیڑ ریزے ریزے ہو گیا۔ وَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا اور موسیٰ علیہ السلام ہوش
ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے تَبَنَّتِ الْیَتِّ ذُو الْکَرِیْمِ میں تو بہ کرتا ہوں
میری درخواست درست نہیں تھی۔ فرمایا فَخُذْہَا اَتِیْتُکَ۔ اے موسیٰ! جو میں تمہیں دے
دوں اسی پر اکتفا کرو۔ وَکُنْ مِنَ الشَّکْرِیْنَ اور شکر گزار بن جاؤ۔ مقصد یہ کہ روایت الہی اس
جہاں میں ممکن نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اہل فیصلہ ہے۔ جسے بدل نہیں جاسکتا۔

حضور علیہ السلام نے معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا یا نہیں۔ اس میں مختلف آراء
ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ دیدار کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور قاضی شہار الشہابی پتی و
فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ مگر عالم بالا میں کیا۔ اس مادی جہاں
میں نہیں کیا۔ ————— عالم بالا میں روایت کے وقت تو حضور
علیہ السلام حفیظۃ القدس میں پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں تو روایت یقیناً ہوگی۔

الغرض جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان
نہیں لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ بھلی پڑی اور سترے ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب

بنی اسرائیل کو ہلاک کرنا
اور دوبارہ نفع کرنا

موسیٰ علیہ السلام کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی۔ مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ملاک کر دیتا۔ تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔ یہ بیوقوف ہیں۔ ان کی وجہ سے میری ذات پر کوئی حرج نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہمارے آدمی سے جا کر مر ڈائیے۔ اے مولا کریم! مہربانی فرما نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور فرمایا۔ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔ سرتج لفظ موجود ہے۔ وہ لوگ مر چکے تھے۔ موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔ بعض توجیہ کرتے ہیں کہ مرے نہیں تھے۔ بلکہ سکتے پڑ گیا تھا۔ پھر برٹش میں آگئے۔ یہ بات درست نہیں۔ مَوْتِكُمْ سے واضح ہے۔ کہ ان لوگوں کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم کا باقی حصہ راکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پوسے کے پوسے زندہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ قرآن پاک میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔ جب عزیر علیہ السلام سوال کے بعد اٹھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ كَفَرُ لِبَشَرٍ تم کہتے دن سوئے ہو۔ عرض کیا لِبَشَرٍ يَوْمًا اور بعض کیوجہ اَيَّامٍ دن یا اس کا کچھ حصہ سو یا ہوں فرمایا بَلَدٍ لِبَشَرٍ مِائَةِ عَامٍ تم تو سو سال تک سوئے ہو۔ اتنا عمر گزر گیا۔ اس دوران تمہارا گدھا فنا ہو گیا۔ اس کی مہیاں چورا چورا ہو گئیں۔ اب دیکھو اس کی ہڈیوں کو سم کیسے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر انہیں گوشت پہنائے ہیں۔ اور زندگی بخشے ہیں۔ برخلاف اس کے کھانا جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے۔ مگر وہ بالکل تازہ پاس پڑا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ وہ گھاسٹرا نہیں۔ آخر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ قادر ہے۔

ہے۔ وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے کر سکتا ہے۔

الغرض! اُن ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا کہ ہم جی غلطی پر تھے۔ ہمیں ایسی تفتیش نہیں کرنی چاہیے تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم میں اُگڑا ہوا ہی دی۔ کہ بے شک ہم نے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی ہے۔ اے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

جلد سہوا

اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ شام، فلسطین، تمہارے جدا مجہد تہذیب ابراہیم اور اسحق علیہما السلام کی وراثت ہے۔ لہذا تم اپنی وراثت دوبارہ حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کا ٹھکانا یہی ہے اب اس علاقے پر عمالہ قوم کا قبضہ ہے۔ تم اُن کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں مہار و وطن واپس دلا دیں گے۔ وہی وطن جہان تمہارے آباد و آباد تھے۔ اور جن کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ تم مٹوڑی سی محبت کرو۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کریں گے۔

بنی اسرائیل مسلسل غلامی کی حربے بزدل ہو چکے تھے۔ اُن میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن کے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاد پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ غلامی ہار تھا۔ آج ہمارا حال بھی یہی ہے انگریز کی سوسالہ غلامی کے نتیجے میں اخلاق بگڑ چکے ہیں۔ جنہوں نے انگریز کا دودھ پیا ہے۔ ان کے اخلاق کی درستگی کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ نئی نسل آئے گی۔ نئے حالات پیدا ہوں گے۔ تو عرصہ کے بعد اخلاق کی درستگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

قوم عمالہ بڑے سخت لوگ تھے۔ جب بنی اسرائیل نے ان کی جرأت و شجاعت کے کارنامے سنے تو اُن کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہاد نہیں کر سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بڑا سمجھایا کہ تم صرف کم ہمت بانہ صحر۔ اللہ تعالیٰ ضرور فتح عطا فرمائیں گے۔ سو قلمذہ میں تفصیلات موجود ہیں۔ یہ قوم کسی طرح جہاد پر آمادہ نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا میں مبتلا کیا۔ چالیس سال تک صحرا میں نظر بند ہے۔ "يَتِيمَهُؤْنَ فِي الْاَرْضِ"

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْرِ الْفٰسِقِيْنَ اے موسیٰ! یہ فاسق لوگ ہیں۔ ان پر افسوس نہ کریں۔ یہ اسی سرزمین میں حیران و پریشان پھرتے رہیں گے۔ اس صحرائے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ نیز یہ کہ یہ ساری نسل ہمیں ختم ہو جائے گی۔ نئی نسل کا نیا خون آئے گا تو ان میں جذبہ جہاد بیدار ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام وہیں وفات پا گئے۔ پرانی نسل کے وہ لوگ جنہوں نے فرعون کی غلامی کا دور دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ ستر سال کے بعد نئی نسل نے علم جہاد بند کیا اور شام و فلسطین کو فتح کیا۔

بدل کا سایہ

بنی اسرائیل کی تمام تر فرمایوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو انعامات سے نوازتا رہا۔ صحرائے تیرہ میں نظر بندی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں معاش امد و منگی کے اسباب معجزانہ طور پر مہیا فرمائے۔ بنی اسرائیل خیموں میں اقامت پذیر تھے۔ جب خیمے پھٹ گئے۔ تو ان کے لیے سورج کی گرمی سے بچنا مشکل ہو گیا۔ صحرائے گرمی بھی ایسی جہاں کی گرمی سے چھ گنا زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک اور انعام فرمایا وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کر دیا جب دن کے وقت دھوپ تیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ بادلوں کو حکم دیتے وہ بنی اسرائیل پر چھا جاتے۔ اور اس طرح وہ دن کے وقت سورج کی تیش سے محفوظ رہتے۔

مَن اور سَوٰی

صحرائے سینا میں خورد و نوش کے لیے کوئی چیز نہ ملتی تھی۔ نہ کھیتی باڑی اور نہ کوئی فصل ملے گی چھ لاکھ ستر ہزار افراد کے لیے کھانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نسل بدترج بڑھ رہی تھی۔ اور اشیائے خورد و نوش کی ضرورت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے پینے کا انتظام اس طرح فرمایا وَانْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوٰی اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر مَن اور سلویٰ نازل کیا۔ مَن کا فعلی معنی احسان ہوتا ہے۔ سورہ جہرات میں آتا ہے۔ يٰمَعْنُوْكَ عَلٰیكَ اَنْ اَسْلَمُوْا اَبْ پُر احسان بتلاتے ہیں۔ کہ وہ ایمان لے آئے ہیں۔ تاجم مَن میں یہ معنی پوشیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت و مشقت کے احسان کے طور پر انہیں کھانا مہیا کیا۔ کوئی کھیتی باڑی نہیں کرنی پڑی۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کاروبار کرنا پڑا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالکل محنت میں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیا۔

من ترنجبین کی قسم کے دانے تھے۔ جیسے دھنیا کے دانے ہوتے ہیں۔ یہ شہادت شریہ
 مآدو تھا۔ جو رات کو بنی اسرائیل کے خیموں یا دوسری رہائش گاہوں کے ارد گرد برس جاتا تھا۔ اور
 اس کی مقدار اس قدر کافی ہوتی تھی۔ کہ ہر فرد کو ایک ایک سیر کے قریب میسر آ جاتا تھا۔ صبح اٹتے
 تھے۔ اور یہ دانے اکٹھے کر لیتے تھے۔ یہ ان کی چوبیس گھنٹے کی خوراک کے لیے کافی ہوتا تھا۔
 چونکہ ہفتے کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ اس لیے جمعہ کے دن دو دن کی خوراک مل جاتی تھی۔

من کے دانوں میں خاص قسم کی شہادت ہوتی تھی۔ جو کہ حیات انسانی کے لیے بڑی ضروری ہے۔
 انسانی جسم کی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے شہادت کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کا جسم ٹھنڈا ہو کر
 ختم ہو جانے کا۔ قدرت نے ان کے جسم میں ایسا نظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ ان کو جو بھی غذا
 استعمال کرتا ہے۔ یہ جگر میں پہنچ کر شکر بن جاتی ہے۔ یہ شکر ہر قسم کے اناج اور پھلوں وغیرہ سے
 حاصل ہوتی ہے۔ اگر جسم یہ اصلی شکر نہ بھی کھائیں۔ تو بھی ان کی جسم خوراک کے دیگر اجزاء سے شکر
 حاصل کر لیتا ہے۔ گویا انسانی جسم کو لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اشیائے خورد و نوش
 سے جگر میں پیدا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جسم کے باقی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسانی جسم
 کو شہادت پر زمین یا لحمیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دانوں وغیرہ سے بھی حاصل ہوتے ہیں الغرض!
 بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے من کے دانے مہیا کر کے ان کی یہ ضرورت پوری کر دی۔

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد میں عبود نامی کعبور اور من کی تعریف فرمائی ہے۔
 حدیث میں آتا ہے: الْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَفِيهَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّعَةِ عَجْوَةٍ۔
 جنت کی کھجور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے زہر اور سحر کا علاج رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا: الْكَلْبَاءُ
 مِنَ الصَّنِ وَمَاءُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ یعنی کھنسیاں من سے ہیں اور ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ
 نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ یہ چھوٹی موٹی زرد و سفید کھنسیاں خورد و بینی سے۔ بڑی لذیذ
 چیز ہے۔ انسانی جسم کے لیے گوشت کا اثر رکھتی ہے۔ نہ ان کا کوئی نفع ہوتا ہے۔ اور نہ ان
 کی کوئی مخالفت کرتا ہے۔ خود بخود اُٹتی ہیں اور لوگوں کے کام آتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اس کا پانی سر میں ملا کر لگایا جائے یا ویسے ہی سلائی اس کے پانی میں بھگو کر آنکھوں میں لٹکائی جائے۔ تو آنکھوں کی کئی بیماریوں کے لیے شفا کا حکم رکھتی ہے فرمایا یہ کھنبیاں جس ہی کی ایک قسم ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تہ بنجمن کی قسم کے اس مادہ کو بنی اسرائیل کے لیے خوراک کا ذریعہ بنایا۔

سکوی سلوان کے مادہ ہے۔ یہ میٹر کی قسم کا جانور تھا۔ ہر ہفتے ان جانوروں کے غول کے غول دریائے شہر کی طرف سے اڑ کر آتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے خیموں کے قریب آکر بیٹھ جلتے تھے۔ جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے تھے۔ انہیں پکڑنے کے لیے دوسرے شکار کی طرح ان کو محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ جو بنی ذرا اندھیرا ہوتا تھا۔ بنی اسرائیل ان جانوروں کو آسانی کے ساتھ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق پکڑ لیتے تھے۔ پھر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت پکاتے تھے۔ اور کباب بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ درجے کی خوراک مہیا کی تھی۔

اپنے آپ پر غلہ

بادل کے سائے اور خوراک کی ہم رسانی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت عطا کی تھی۔ تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ ایک بہت بڑا ستون نما ڈھلوان تھا جس سے بنی اسرائیل برہنہ حاصل کرتے تھے۔ رات کے وقت یہ ڈھلوان اٹھتا تھا جس سے اس قدر روشنی میسر آجاتی تھی۔ جو بنی اسرائیل کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

فرمایا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ بنی اسرائیل کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو روزی دی ہیں وَمَا ظَلَمُونَا اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بلکہ انہوں نے اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں ہم نے عطا کی ہیں۔ انہیں خوب کھاؤ پو۔ مگر ان کا ذخیرہ نہ کرو۔ لیکن انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوشت گلنے لگنے لگا۔ مسلم شریعت کی روایت میں آئے۔ لَوْ لَا بَنُو آدَمَ یعنی اگر بنی اسرائیل ذخیرہ اندوزی کا ارتکاب نہ کرتے تو گوشت انہیں لَا تَأْكُلُونَهَا خواہ مہینوں پڑا رہتا۔ مگر ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے گوشت سڑنے لگا۔ اس

طرح گویا انہوں نے خود اپنا نقصان کیا۔ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا۔ بعد خود اپنی جانوں پر ظلم کے مرتب ہوئے
 اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے
 طرح طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ جہاد کا انکار
 کیا۔ نبی کی تکذیب کی۔ اس کو ستایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام
 فرمایا۔ پانی کی ضرورت پیش آئی تو جیسا کہ آئے آئے گا وہ بھی مہیا فرمایا۔

الْاٰ

درس سبت و چهار

البقرة

آیت ۵۸، ۵۹

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ
شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَازِغِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾
فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ
فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا
كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور
کھاؤ اس میں سے جہاں بھی تم چاہو کھاؤ گے۔ اور داخل ہو دو دروازے میں سجدہ
کرتے ہوئے۔ اور کنوئیں۔ ہم بخش دیں گے تمہاری غلطیوں کو۔ اور زیادہ دیں گے
ہم نیک کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ پس تبدیل کر دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات
کو۔ سوائے اس کے جو ان کو کوئی گئی تھی۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے
ظلم کیا عذاب آسمان کی طرف سے۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

تجلیات

جس طرح ابتداء رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ یٰبَنیٰ اِسْرَآءِیلَ اذْكُرُوا
نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ اِیْ ہٰی ہٰی۔ اسی طرح ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل
ہی ہیں۔ جہاں اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل
کے تقصیر، سرکشی اور نافرمانی کا حال بھی بیان ہو رہا ہے۔ انعامات میں سے فرعون کی غلامی سے
آزادی کتاب تورات کا حصول اور من و سلویٰ کا ذکر ہوا۔ پھر ان کی نافرمانی کا ذکر ہوا۔ انہوں نے
اللہ تعالیٰ کی بے ادبی کی جس پر انہیں سزا بھی ملی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ
تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جہاد کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں
شام و فلسطین کا وہ علاقہ واپس دلا دیں گے جو تمہارے آباء و اجداد کا مسکن رہا ہے۔ یہ کہ بنی اسرائیل

نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ وہاں پر بڑے محنت لوگ ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ خود بخود اس بستی سے نکل جائیں تو ہم وہاں جانے کو تیار ہیں۔ اس کی مکمل تفصیلات تو سورۃ مادہ میں ہیں۔ تاہم کچھ باتیں سورۃ بقرہ میں بھی آ رہی ہیں۔ ان کی نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل ستر سال تک تیسہ کے بیابان میں سرگردان پھرتے رہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے مقروض اور سرکش کا حال بیان فرما کر دوسرے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ سرکش کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو من و سلویٰ کھاتے ہوئے کئی سال گزر گئے۔ بعض روایات میں اٹھارہ سال کا ذکر آتا ہے۔ تو انہوں نے بعض دوسری چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ جس کا ذکر اگلے کوع میں آئے گا۔ کہ ہم ایک ہی طرح کا کھانا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ من و سلویٰ کی بجائے سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کو چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر تم ایسا ہی چاہتے ہو۔ تو اس بستی میں چلے جاؤ۔ وہاں پر یہ چیزیں تمہیں میسر آجائیں گی۔

وہ کون سی بستی تھی جس میں بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم ہوا تھا۔ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں بعض مفسرین اسے بیت المقدس سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ اریحا نامی بستی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بستی کے لوگوں سے جہاد کرو۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا۔

اس معاملہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ بستی میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں واقع ہوا یا ان کے بعد۔ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ وہ بستی موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد فتح ہوئی۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی نئی نسل جہاد پر آمادہ ہوئی۔ ترانیں شاد اور فلسطین پر غلبہ حاصل ہوا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ من و سلویٰ کی بجائے دوسری خوراک کی طلب ہے۔ تو اس اریحا نامی بستی میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں میسر آئیں گی۔

فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَادْخُلُوهَا بِالسَّلَامَةِ هَذِهِ الْقَرْيَةُ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب بنی اسرائیل!

ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کھاؤ اس میں کھلے طور پر وصعت کے ساتھ۔ تمہیں اس معاملہ میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہاں یہ بات یاد رکھو کہ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اور اس بستی کے دروازے میں داخل ہو جبکہ کرتے ہوئے بستی میں داخل ہوتے وقت سجدہ کرنے سے مراد سجدہ شکر ادا کرنا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ

سجدہ شکر

نے تمہیں فتح عطا کی ہے۔ اس بستی کا قبضہ دلایا ہے۔ تو اس کے بدلے غرور و تکبر نہ کرنا بلکہ عاجزی اور انکاری کرتے ہوئے سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا یا کرنا انبیاء علیہم السلام کا عمل اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: کہ جب مکہ معظمہ فتح ہوا۔ تو حضور علیہ السلام اونٹنی پر سوار تھے۔ اور داخلے کے وقت آپ سر کو جھکائے ہوئے تھے۔ آپ اگر کمر داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ پھر آپ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ اسی طرح جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایران کا پایہ تخت مدائن فتح کیا۔ اور آپ نے اس قلعہ میں جا کر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر تھا۔ جو فتح و کامیابی پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی یہی حکم تھا۔ کہ جب فتح حاصل ہو جائے۔ اور اس بستی میں داخل ہونے لگو تو نخوت و تکبر کی بجائے عاجزی دکھاتے ہوئے اور سجدہ شکر بجالاتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ یہ آسمانی تعلیمات کا اہم اصول ہے۔

معرکہ بدر میں بڑے بڑے کفار مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی تو اہل ایمان نے شکرانہ کے طور پر دو نفل پڑھے۔ اور اس بات پر اللہ رب العزت کا شکر یہ ادا کیا۔ کہ اس نے اہل ایمان کو ظالموں سے نجات دلائی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحر قلزم سے باہر نکالا اور لشکر فرعون کو غرق کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی سجدہ شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے کہ جب کوئی نعمت ملے تو سجدہ شکر بجالاتے ہیں شریعت محمدیہ میں سجدہ شکر کی بجا آوری نہایت مستحسن فعل ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: کہ سجدہ شکر ادا کرنے کے لیے دو رکعت نماز

نفل ادا کرنی چاہیے۔ تاہم صرف سجدہ کر لینا بھی درست ہے۔

استغفار
برکات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو احکام دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وَقُولُوا حِطَّةٌ اور زبان سے یوں کہیں کہ اے اللہ! ہماری غلطیوں کو معاف فرما دے۔ حِطَّہ کا فعلی معنی مٹا دینا ہے۔ ہماری خطاؤں کو گرا دے۔ لفظ حِطَّہ دراصل اَحَطُّطَ عَنَّا حِطًّا کا مخفف ہے۔ یعنی ہماری غلطیوں، کوتاہیوں اور خطاؤں کو مٹا دے معاف کر دے یا ہر گز فرما۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سجدہ اور استغفار کی تلقین کی۔ اور فرمایا کہ اگر تم اپنی خواہش کے مطابق خوراک حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ان دو شرائط کے ساتھ بستی اریحا میں داخل ہو جاؤ۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کی کوئی ابتداء ہوتی ہے، وَأَوَّلُ الْخَيْرِ الْإِسْتِغْفَارُ اور خیر کی ابتداء استغفار سے ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرے۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے: وَخَيْرُ الْخَطَايَا بَيْنَ التَّوَابُونَ بِرِغْصِهَا کہ غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں مگر بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ گنہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہی ہے جیسا اس نے کوئی گنہ نہ کیا ہو۔

فرمایا جب تم استغفار کر لو گے۔ مجھ سے معافی مانگ لو گے۔ تو پھر میں اس کا صلہ یہ دوں گا۔ كَرَفَعْنَا لَكُمْ ذُلَّكُمْ بِمَقَارِنِ خَطَايَاكُمْ اور لغزشوں کو بخش دیں گے۔ معاف کر دیں گے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کریں گے بلکہ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ نیکو کاروں کو مزید اجر عطا فرمائیں گے۔

علم خداوندی
میں تبدیلی

بنی اسرائیل کی طبیعتوں میں قہر اور سرکشی ٹھہر چکی تھی تو معمولی سے معمولی حکم بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ فَسَدَ الَّذِينَ ظَلَمُوا پس تبدیل کر دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا تُوْرًا غَيْرَ تَذَنِّي قِيلَ لَهُمْ وہ بات جو انہیں کہی گئی تھی۔ یعنی انہیں حکم تیرہا

کہ کچھ ہٹکا داکرتے ہوئے جائیں۔ وہ اکڑتے ہوئے اور چوڑا گھیسے ہوئے داخل ہوئے۔ اسی طرح حکم یہ تھا کہ زبان سے استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں۔ مگر انہوں نے لفظ حِطَّة کی بجائے حِنْطَة کہنا شروع کر دیا۔ کنا تو یہ چلبیے تھا کہ اے اللہ ہمیں معاف کرے حِطَّة مگر انہوں نے کہا حَبَّة فی شَعْرَة یعنی ہمیں تو خوشی کے اندر گندم چاہیے۔ ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کہہنے لگے۔ جو کہ حدیث کے بے ادبی، گستاخی اور سرکشی تھی۔

یہاں پر لفظ ظَلَمُوا کہہ کر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ احکام کو تبدیل کرنے والے سائے کے سائے بنی اسرائیل نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا جس طرح پکھڑے کی پوجا کرنے والے بھی۔ سائے کے سائے لوگ نہیں تھے۔ اسی طرح احکام میں تبدیلی کے مرتکب بھی کچھ لوگ تھے۔ چنانچہ آگے ان کی سزا کا ذکر بھی آئے گا۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی نصیر تبدیلی کی جو کہ بہت بُری بات ہے۔ انہیں تو اتباع کرنا چاہیے تھا اِنک مامور ہے۔ لہٰذا اے اللہ تعالیٰ کے ہر فرمان پر تسلیم خم کر لینا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جو کوئی بھی احکام خداوندی میں تغیر و تبدل کا باعث بنے گا۔ وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوگا۔

عالمی قوانین اور
حق شفعہ

اسلامی اصولوں میں تغیر و تبدل ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں بھی بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں جنرل ایوب خان کے زمانے میں عالمی قوانین نافذ ہوئے۔ علما کرام نے ہر چند احتجاج کیا کہ اس کی بعض شقیں قرآن و سنت کے خلاف ہیں مگر حکومت کے سربراہوں نے یہ قوانین آج تک نافذ چلے آئے ہیں۔ اسی طرح حق شفعہ کا قانون بنایا۔ امدادیت کی رے شفعہ صرت بین قسم کے لوگوں کے لیے ہے۔ یعنی شفعہ کا وہ شخص حد ہے جو یا تو جائیداد کی عیست میں شریک ہو یا حق میں شریک ہو یا پڑوسی ہو۔ مگر اب درمیں اور بھی ملائی گئی ہیں۔ حالانکہ اہم شافعی توپڑوسی کے حق کے بھی قابل نہیں ہے مگر اس دہے میں مزارع اور بائع کے لڑکے وغیرہ کو بھی حق شفعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ خدائی قانون میں ترمیم نہیں تو اور کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انیس سزا دی۔ اگر آج بھی کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جہلت مے مے تو یہ اس کی حکمت ہے۔ دوزخ اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

زمین کی آبادی
اور بربادی

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کی آبادی نیکی اور اطاعت سے ہوتی ہے اور مخلوق کی برائیوں کی وجہ سے اس کی بربادی ہوتی ہے۔ فسق و فجور کو آپ بیشک ترقی کا نام دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کھیل تماشہ، لہو و لعب، بدکاری، فحاشی، زنا، سود خوری وغیرہ سب بگاڑ کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ آبادی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی آبادی تو ہر حال نیکی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہوگی۔ جس قدر کچھ چین نصیب ہوگا۔ اسی قدر آبادی ہوگی۔ جس قدر گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ اتنی ہی بے چینی بڑھے گی۔ لوگ اضطراب اور طرح طرح کے مسائل کا شکار ہوں گے۔ لہذا معلوم ہوا کہ نافرمانی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ہم سب کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے کہ نیکی اور بدی میں تمیز کریں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں، نافرمانی سے پرہیز کریں۔

وَإِذَا سَأَلَكَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ نَسْلًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ
كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ ⑥۰

ترجمہ : اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ پس ہم نے کہا کہ اپنی راسٹی کے ساتھ پتھر کو مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ تحقیق جان یا سب لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ۔ اللہ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ اور زمین میں فساد نہ کرو۔ بوسے رچلو ⑥۰

گذشتہ آیات میں اُن انعامات کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ منجملہ ان کے دشمن سے رهایی اور ذلت ناک عذاب اور غلامی سے نجات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ صحرائے سینا میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے سر پہ بادل کا سایہ کیا۔ خوراک کے لیے مَن اور سنوی فراہم کیا۔ جب بنی اسرائیل نے بنسری اور تڑکاری کا مطالبہ کیا۔ تو انہیں ایک دوسری بستی میں اترنے کا حکم دیا جہاں ہر چیز میسر تھی مگر ساتھ یہ نصیحت بھی کر دی کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل ہونا۔ مگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کو تبدیل کر دیا۔ سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے اگر اگر کہ بنی میں داخل ہوئے۔ اور زبان سے استغفار کرنے کی بجائے بعض یہودہ باتیں کہنے ہوئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرد کی یہ نذر دی کہ آسمان سے طاغون کی صورت میں عذاب نازل ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل ہلاک ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ انہوں نے صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو ٹھکرا دیا۔

بنی اسرائیل
کی طلب کرنا

توراة اور بعض اسرائیلی روایتوں میں ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل ذاتی سکات کے قریب

ایک مقام پر تھے۔ اسے قارون کی ہستی بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کچھ پہاڑی ہے۔ اور کچھ صحرا ہے۔ پانی نہ پایا ہے۔ اس مقام پر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں۔ حلق خشک ہو رہے ہیں۔ اسے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لیے پانی کا بندوبست کرو۔ اس معاملے میں وہ موسیٰ علیہ السلام سے اس قدر بدتمیزی سے پیش آئے کہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں ان الفاظ کے ساتھ دعا کا آغاز کیا کہ اے مولیٰ کریم! بنی اسرائیل میرے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آ رہے ہیں کہ مجھے شکار کرنے کے درپے ہیں۔ لہذا تو ہی ان کے لیے پانی کا انتظام فرما۔ آیت زیر درس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اٰسَ وَاقِعَهُ كُوَيْدًا ۚ وَجَبَّ مَوْسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۖ فَاٰنَىٰ
 قَوْمَ كَيْلَے پانی طلب کیا۔ استسقی کا لفظی معنی طلب آب ہے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑا گڑانا استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔ حضرت ابو علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات میں ملتا ہے کہ قحط سالی کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا۔ يٰقَوْمُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ۖ ثَلَاثَةً تَوْبَتُوْا اِلَيْهِ ۚ اِنَّ قَوْمَ بَنِي رَءٍ اسْتَغْفَرُوْا رَبَّهٗمْ اَوْ تَرَوْهُمْ كَرُوْا ۚ وَيُرْسِلِ السَّمَاءُ عَلَیْكُمْ مِدْرَدًا ۚ تَاْكُلُوْهُم مِّمَّا رَاٰتُمْ اَسْمَانُ ۚ سَے پانی برسائے۔ جب کبھی دنیا خشک ساں لاشکار ہو جائے۔ زمین۔ باغات۔ انسانوں۔ حیوانوں کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو جائے۔ تو فرما بھی آب کے لیے کسی تدبیر اختیار کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان تدابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے بننے لگن ہوں کی معافی مانگیں۔ صدقہ خیرات کریں۔ جسکے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ باران رحمت نازل کرے گا اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔ غرضیکہ استسقی کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

استغفار کی
حقیقت

عناں کرام میں سے ہم ابو صفیہ و کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ فقہاء است و اجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ہے گی۔ آپ نے دین کا پختہ اور خلاصہ اس طریقے پر پیش کیا کہ تمام علمی قریں اسے بخوش قبول کر

استغفار کا طریقہ

گیں۔ اہمیت پر آپ کا بڑا احسان ہے جس طرح محدثین کرام نے احادیث کے الفاظ کی حفاظت کی، مفسرین کرام نے قرآن پاک کی تشریح بیان کی اسی طرح فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے ضروری مسائل کا استنباط کیا۔ اور مشکلات کے حل پیش کئے۔ انہوں نے دین اسلام کو احسن طریقے پر اہمیت کے ساتھ پیش کیا۔ راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔

اہم و واجب فرماتے ہیں کہ استغفار کی کیفیت یہ ہے کہ ان ان اے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ اس کے لیے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ تاہم استغفار کے عام طور پر دو طریقے ہیں۔ جیسا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ہستی سے ہر کھلے میدان میں نکل جائیں اور دو رکعت نماز ادا کریں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ استغفار کے لیے صرف مومن کھنچے ہوں۔ کسی کافر و قریب آنے والے دین۔ چہرہ جھرنی اور انکاری کے ساتھ دو نفل ادا کریں۔ اس کے بعد دعا کریں اللہ تعالیٰ ہذا دن رحمت نازل کرے گا۔ اور خشک سال دور ہو جائے گی۔

دوسرا طریقہ بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ منبر پر تشریف فرما تھے خطبہ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک شخص نے اگر عرض کیا کہ حضور! مجازہ جاک سو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوئیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ پانی برسا دے۔ آپ نے منبر پر بیٹھے بیٹھے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ آپ دعا فرماتے تھے کہ اسی کائنات سے بادل کہ ایک ٹکڑا نمودار ہوا دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادل ابل گیا۔ اور یکایک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایک تیسرا طریقہ بھی ہے کہ کسی بھی نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کی جائے۔ استغفار کی یہ کیفیت۔ وہ نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صورت ایسا ہی باکمی ہے۔

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ ساری قوم سخت پریشانی کے عالم میں تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جبریل کے پیش آئے۔ پھر آپ دعا میں مصروف ہو

گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ یعنی پانی
 پڑی اس پتھر پر بارہ۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ جو ہنسی لاشعری پتھر پر بارہ کی فَالْفَجْرَتْ مِنْهُ
 اُثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا اس میں سے بارہ چشمے بھوٹ بڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے
 بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرمادیا۔

اس بابے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ دو کون سا پتھر تھا جس پر لاشعری مانے سے پانی
 جاری ہو گیا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ پتھر موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں موجود تھا تفسیری
 روایات کے مطابق یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے دنیا میں آیا تھا۔ اور سلا بعد نسل موسیٰ
 علیہ السلام تک پہنچا۔ تاہم کسی صحیح روایت سے ایسا ثابت نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی
 بعض روایات سے موسیٰ علیہ السلام کے ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اس
 زمانے میں بنی اسرائیل کے لوگ پرے کا خاص خیال نہیں کرتے تھے۔ نہات وقت بھی ایک
 دوسرے کے سامنے کپڑے اتار کر نہانا شروع کر دیتے تھے۔ بر خلاف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام
 بڑے زیادہ تھے غسل کرتے وقت سر پرستی کا خاص خیال رکھتے اور پرے میں نہاتے۔ دین کا
 اصول بھی یہی ہے کہ بول و براز پر غسل کرتے وقت دوسرے شخص کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔
 ایسے اوقات میں پردہ واجب ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل الٹی ذہنیت کے ملک تھے موسیٰ
 علیہ السلام کو پرے میں غسل کرتے دیکھا تو سمجھا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب ہے جسے چھپانا
 چاہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آپ کو اُورہ کی بیماری لاحق ہے جس میں خیسے پھول جاتے ہیں۔
 اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی بڑے پتھر کی
 اوٹ میں اس پتھر پر کپڑے رکھ کر پرے میں غسل فرما رہے تھے کہ وہ پتھر آپ کے کپڑوں
 سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے یہ ماجرا دیکھا تو سخت پریشان ہوئے ثَوْبِي حَجَرَ ذ۔
 ثَوْبِي حَجَرَ یعنی پتھر میرے کپڑے۔ پتھر میرے کپڑے کہتے ہوئے۔ پتھر کے پیچھے بھاگے

۱۔ معالم التنزیل ص ۱۲۹، ابن کثیر ص ۱۱۱، تفسیر غزیری فارسی ص ۱۲۹۔

۲۔ بخاری ص ۳۸۳، مسلم ص ۱۵۳، معالم التنزیل ص ۱۲۹۔

اور اسی حالت میں اپنی قوم کے پاس پہنچ گئے۔ لوگوں نے آپ کو برہنہ حالت میں دیکھا مگر جسم میں کوئی عیب نہ پایا تو کہنے لگے مَا بِمُوسَىٰ مِنْ بَأْسٍ لِّعِزِّ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ کو تو کوئی بیماری لاحق نہیں۔ ہم تو غلط سمجھ رہے تھے۔ بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام اس بھاگتے ہوئے پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو اپنی جلالی طبیعت کے مطابق اُس پتھر کو اپنے ڈنڈے سے خوب پیٹا جس کی وجہ سے اُس پتھر پر لافنی کے پانچ ڈنڈے نشان پڑ گئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ بڑا مبارک پتھر ہے۔ ایک طرف اس نے میرے حکم کی تعمیل کی کہ کپڑے لے کر بھاگ نکلا اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اتنا نرم ہو گیا کہ اس پر لافنی کے نشان نہ پڑ گئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس پتھر کو اپنے پاس رکھ لو۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ کہتے ہیں۔ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں تھا۔ اور جب بنی اسرائیل نے پانی طلب کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی پتھر پر لافنی ماری۔ بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ بہر حال یہ تفسیری روایات میں کسی آیت یا صحیح حدیث سے ثابت نہیں

بعض تاریخی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وادی حوریب میں جو پہاڑی سلسلہ اور چٹانیں ہیں۔ وہیں زمین پر پڑی ہوئی ایک چٹان پر موسیٰ علیہ السلام نے لافنی ماری تھی۔ اور اس میں سے پانی برآمد ہوا تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس پتھر میں اب پانی تو نہیں ہے۔ مگر پانی کے نکلنے کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سوراخوں سے کسی وقت پانی نکلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پانی بنی اسرائیل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نکالا تھا۔ جب وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ پانی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تو وہ بھی ختم ہو گیا۔

پانی کے بارہ چشمے پھوٹنے کی حکمت یہ تھی کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی موقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ

کے حکم سے ہوا۔ یہ معجزہ تھا۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ بحیرہ قزم میں کیا ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے لاکھٹی چلائی اور بارہ راستے بن گئے۔ پانی کناروں کے ساتھ منبجہ ہو کر رہ گیا۔ وہاں لاکھٹی مارنے کا حکم ہوا۔ تو پانی میں راستے بن گئے اور سیاں لاکھٹی ماری تو خشک بھتر سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔ پانی نکالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ لاکھٹی مارنا مہتمار کا کام ہے۔

نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ بکود کرنے والی وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر اگر لوگ ٹھوکر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کو ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ وہ تَرَبَّأَ ذِی اللہ تھا۔ فرمایا وَ اُنَبِّئُ الرُّكْعَةَ وَالْاَبْرَصَ وَ اُنْحِ الْعَمُوْیَ بِاِذْنِ اللہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادہ زاد اندھے اور ابرص کو ٹھیک کر آہوں۔ اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ یَّاتِیَ بِاٰیٰتِہِ اِلَّا بِاِذْنِ اللہ۔ فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہادی عظیم علیہ السلام کی زندگی میں بے شمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکالنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی رحمت علیہ السلام کا معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کہتے ہیں کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پر تھا۔ راستے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا سبب بانی ہے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا۔

پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیلے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارکہ کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آؤ پانی پی لو اور اس سے وضو کرو۔ لوگوں نے پانی حاصل کیا۔ اس سے وضو کیا اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا شہر سیراب ہو گیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھایا اور پانی نکلنا بند ہو گیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور علیہ السلام کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ بحجر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہویا جمائے رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ اصل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

برفعت پر
اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من و سلویٰ کا بند رست ہو گیا۔ اور پینے کے لیے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كُلُوا وَشَرِبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ** اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوزع انسانی کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ اسے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ شیخ سعدیؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

ابو باد و مرد و خورشید و فلک در کلدند تا توانی بخت آری و بخت غمخوری
ہمراہ بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نباشد کہ تو سرمان نہری
فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔ تاکہ تو روٹی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔ روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہیے کہ روٹی کا یہ ٹکڑا کتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچا ہے۔ کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کرڈروں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے، پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کن کن مشینوں سے گزر کر آتا ہے۔ اسی طرح لباس کی تیاری میں کتنی مشینیں، کتنا خام مال، کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ تب جا کر

زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس ملک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔ اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کس قدر انصافی کی بات ہوگی۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دو سکر مقام پر آتا ہے: کَلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ حلال اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں وَاشْكُرُوا لِلَّهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ ناداروں کو محروم نہ رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم ملک ہو مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔ یہ کس کی عنایت ہے۔ یاد رکھو۔ اگر غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو محروم رکھو گے۔ ان کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور مستحقین پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے۔ کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اُسے دیکھنا چاہیے۔ کہ سوسائٹی میں کوئی بھوکا یا ننگا نہ ہے۔ خاص طور پر سربراہان مملکت کا یہ فرض منجس ہے۔ کہ اپنے اپنے ملک میں عاجمندیوں کی خبر گیری کریں۔

صیار الدین برنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ یا حاکم حقیقت میں وہ ہے جس کی سلطنت میں کوئی شخص بھوکا یا ننگا نہ ہے۔ امور سلطنت اس طریقے پر سرانجام دینے چاہئیں کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔ بے شک اعلیٰ درجے کی ضروریات نہ بھی حاصل ہو سکیں۔ تو کم از کم ادنیٰ شعبے کی توہین چاہئیں۔ ہر شخص کے کھانے پینے، پہننے اور بننے کے بے انتظام ہونا چاہیے۔ لہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں نیکی کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے، جس کے پاس خداوندی الارض دولت آتی ہے وہ اسے اپنے بادا کی سمجھتا ہے۔ نہ خدا کا حق نہ رسول کا حق اور نہ انسانیت کا حق کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ مستحقین پر خرچ کرنے کی بجائے رسم و رواج پر خرچ ہوتا ہے۔ مشرکانہ افعال پر خرچ ہوتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی پر خرچ ہوتا ہے یہ ساری ناشکر گزاری کی

مات میں اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حساب نہیں لے گا یا اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ہر چیز کا محاسبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کھاؤ اور پو اللہ تعالیٰ کی روزی سے وَلَا تَقْتُلُوا فِي الْأَرْضِ صُفْبَيْنَ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۔ فساد سے مراد خدا تعالیٰ کے قانون، شریعت اور دین کے خلاف چلنا ہے۔ سائے فساد کی جڑیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو سر مقام پر فرمایا: كُنُوا صِدْقًا فِي الْأَرْضِ حَلَلًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوتِ الشَّيْطَانِ حلال اور پاک چیزیں کھاؤ مگر شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ شریعت کے خلاف قدم اٹھانا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ بدعت، شرک، معصیت وغیرہ خلاف شریعت ہیں۔ اور اسی کو فساد کہا گیا ہے۔ جہاں فساد ہوگا وہاں امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ نہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کر سکتے ہیں۔ نہ قانون شریعت کا احترام کر سکتے ہیں۔ اسلام کا نام کتنے زور شور سے لیتے ہیں۔ مگر عمل صفر کے برابر ہے۔ البتہ ظلم و ستم کا کوئی شمار نہیں۔

اس ماہ کی ابتدائی تاریخوں کی اخباری خبر ہے کسی گھر میں نوجوان لڑکی اور بچہ تھا۔ ماں باپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دو سپاہی دونوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اور ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور اُس بچی کے ساتھ زیادتی کی۔ یہ تو ان سرکاری کارندوں کا حال ہے۔ جو خود دھوکہ کی حفاظت پر مامور ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے۔ تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مجرموں کی نشاندہی ہونے کے باوجود اگر اُن تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچتا تو اس صورت میں کیا خدا تعالیٰ کا قہر نازل نہیں ہوگا۔ بہر حال اس قسم کے واقعات فساد فی الارض کے ہونے میں وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔

الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ بیو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

الْعَمَّ

دیکھتے ہیں

نہجہ ۲۵

(آیت ۶۱)

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمْوِسِي كُنْ لَنَا نَصِيرًا عَلَى طَعَامٍ زَاجِدٍ فَادْعُ لَنَا دَبَّكَ
يُخْرِجُ كُنَّا مَعًا تَنْبِثُ الزَّرْضُ مِنْ بَقَائِهَا وَقَتَابُهَا وَقَتَابُهَا
وَعَدَّيْهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَتَبِدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي
هُوَ خَيْرٌ أَهْبَطُوا مَصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبِ اللَّهِ ذَلِكَ
بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ الْحَقِّ
ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

ترجمہ: اور جب کہ تم نے اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم
کے کھانے پر۔ پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے وہ
چیزیں نکالے جن کو زمین اگاتی ہے۔ اپنی ترکاریوں سے اور اپنی کھجوروں سے
اور اپنے گندم سے اور اپنے مسور سے اور اپنے پیاز سے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا
تم بدل میں لیتے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے اس سے جو بہتر ہے۔ کسی شرم میں اتر
جاؤ۔ بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تم نے مانگا۔ اور ان پر ذلت اور
مسکنت مسلط کی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب لیکر لوٹے اس وجہ سے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ
کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے۔ اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ بات
اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی۔ اور وہ مد سے گئے نکل جاتے تھے ﴿٦١﴾

ربط آیات اللہ تعالیٰ کے بنی اسرائیل پر انعامات، ان کی سرکشی و مرتد اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے
قہر و غضب کا تذکرہ گزشتہ دوس سے چلا آ رہا ہے۔ فرعون کے مظالم، بنی اسرائیل کا مصر سے
خروج، پھر چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگردانی، شام و فلسطین میں داخلہ، من و سلویٰ اور
پانی کی فراہمی کے تمام واقعات تفصیلاً آچکے ہیں۔ اب اس آیت میں جس واقعہ کی طرف

اشارہ ہے۔ وہ بھی بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں ہی پیش آیا۔

غلامی کے اثرات

در اصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا: غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر

مقصود یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں بھی موجود ہے: عَبْدًا مَّحْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ غلام مملوک کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تک بدل جاتا ہے۔ اس کی رائے اپنی رائے نہیں رہتی۔ اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔

بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ وہاں رہ کر ان میں جفاکشی پیدا ہو۔ بھوک پیاس اور مشقت برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اور غلامی کے دور کی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ تاکہ یہ لوگ آئندہ زمانے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ کسی ملک کے وارث بن کر نظم و نسق چلانے کے اہل بن سکیں۔ پھر ستر سال تک یہ لوگ غلامی کے اثرات میں گرفتار رہے۔ اپنے اصلی مقام سے غافل رہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بار بار کہنے کے باوجود ذہنی غلامی کے خول سے باہر نہ نکل سکے۔

جب پرانی نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے کروٹ لی۔ خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع جبرائیل بنی ہوئے۔ تو ان کی قیادت میں بنی اسرائیل کی نئی نسل نے شام و فلسطین کو فتح کیا۔ مَشْرِقَ الْأَمْرِضِ وَمَغَارِبَهُمَا مَشْرِقُ الْأَمْرِضِ وَمَغَارِبُهُمَا کے سائے علاقے اللہ تعالیٰ نے ان کو دلا دیے۔

علم کی تہی

ارشاد ہوتا ہے: وَادَّخَلَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِيُؤْمِنُوا بِكَ لَوْ كُنَّا فَاعْلَمُوا عَلَىٰ طَعَامٍ وَاجِدٍ بنی اسرائیل اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ صحرائے سینا میں بلا مشقت من و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کے مزاج پر

چکے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من اور سلوی دو مختلف کھانے تھے۔ مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا۔ کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پر پی نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچھلی یاد آرہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی ہنریاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پر ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔ اے موسیٰ علیہ السلام، فَادْعُ لَنَا رَبَّنَا اَب ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔ یُخْرِجْ لَنَا کَرۡوۡہَ نَمۡلٍ ہمارے لیے مِمَّا تُنۡبِئُ اَزۡمُرۡضُ وہ چیزیں جن کو زمین اُگاتی ہے۔ مِّنۡ بَقِلٰہَا اپنی ترکاریوں سے وَقۡتًا یَّہۡکَا اور اپنی لکڑیوں سے وَقۡتًا یَّہۡکَا اور آندہ سے وَعَدَ یَّہۡکَا اور اپنی مسورے وَکَصَلٰہَا اور اپنے پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں تو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ دیجئے۔ دلائیے۔ من و سلوی جیسی قوت بخش غذا سے ان کا جی بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے مزہ کا ذائقہ بدل چاہتے تھے۔ بنی اسرائیل کی اس فرمائش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش کی۔ قَالَ اور فرمایا اَتَتَّبِعُ لَوۡنَ الَّذِیۡ ہُوَ اَذٰی بِالَّذِیۡ ہُوَ خَیۡرٌ کیا تم ایک ادنیٰ اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کہتے ہو قوف ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ تو تمہیں من و سلوی جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ اور تم ہنری ترکاری اور لہسن پیاز کے پیچھے پھر رہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مختلف من و سلوی سے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب و کتاب سے بھی بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر ان کے مطلوبہ لہسن پیاز پر تو حساب کتاب ہی ہو گا۔ یہ بھی ان کے گھٹے کا سودا تھا۔ مگر وہ اُسی پر مشر تھے۔

کاشتکار جی مشقت
طلب کا مرتبہ

جب بنی اسرائیل کا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے

کھلوا یا کہ اگر تم ہی چیزیں چاہتے ہو۔ اِهْبِطُوا مِصْرَ اَوْ کُفِیْ شَہْرِیْنَ اَوْ جَاؤْ۔ وہاں جا کر کھیتی بڑی کرو۔ بل چلاؤ۔ آبپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔ فَاِنَّ لَکُمْ مِمَّا سَاَلْتُمْ واپس جو کچھ تم چاہتے ہو تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔ بعض فرماتے ہیں کہ انگشٹ کی قراۃ میں اِهْبِطُوا مِصْرَ واپس مصر چلے جاؤ۔ وہاں جا کر اُسی طرح کھیتی بڑی کرو جس طرح فرعونی کرتے تھے۔ اور بنزریاں وغیرہ حاصل کر لو۔ مگر دوسری قراۃ یعنی مِصْرَ اَوْ کُفِیْ شَہْرِیْنَ کے ساتھ زیادہ راجح ہے۔ یعنی کسی شہر یا قصبے میں اتر جاؤ۔ اور کاشتکاری کرو۔ تم اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کر لو گے۔ تم ایک اعلیٰ چیز چھوڑ کر اس کے بدلے میں معمولی چیزیں چاہتے ہو۔ یہ چیزیں تمہیں محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوں گی۔

پیشے لحاظ
فضیلت

حضرت ابوالامامہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے کسی گھر میں لہ کا پھل دیکھا تو فرمایا۔ یہ جہاں بھی ہو، وہاں ذلت کا دور دورہ ہوتا ہے کاشتکاری بذاتِ خود ایک مشقت طلب کام ہے۔ اس کے علاوہ دلیہ اور آبیانہ وغیرہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ شہری تندیب سے اللہ انسان بہت سی اچھی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔

کاشتکاری ایک اچھا پیشہ بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی تعریف بھی آئی ہے۔ اس پیشے کو فضیلت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہترین پیشہ جہاد ہے، اس کے ذمیلے حاصل ہونے والا مال پاکیزہ ترین ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر تجارت کا پیشہ ہے۔ رزق کا زیادہ تر حصہ اللہ تعالیٰ نے تجارت میں ہی رکھا ہے۔ اس کے بعد کاشتکاری چھٹی یا ہٹی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص کوئی فصل کاشت کرتا ہے۔ کوئی دانہ بوتا ہے یا پودا یا درخت لگاتا ہے۔ اس کے پھل میں سے اگر کوئی جائز وغیرہ کھائے گا۔ تو بونے والے کو صدقے کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کاشتکاری کو یہ فضیلت بخشی ہے۔ اس طرح فرمایا چوتھے نمبر پر صنعت و حرفت کا پیشہ ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے مختلف پیشوں کی یہ درجہ بندی ہے۔ بنی اسرائیل کے جتنے بھی واقعات ذکر کئے جہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اسی ترتیب کے

یہودیوں کی
ذلت و برائی

ساتھ واقع ہوئے ہوں جس ترتیب کے ساتھ انہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا بیان محض عبرت اور تنبیہ کے لیے ہے۔ کہ نوع انسانی ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اور برائیوں سے اجتناب کرے۔ ان کے ضمن میں یہودیوں کو بار بار خطاب کیا جا رہا ہے۔ کہ دیکھو تمہارے اباؤ اجداد میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ان سے عبرت حاصل کرو۔ اور ایسی برائیوں سے باز آ جاؤ۔ انہی نافرمانیوں کی وجہ سے وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اُنْ پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔ مسکنت مال کی کمی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذلت و رسوائی کی لعنت اُنْ پر اس وقت مسلط کی گئی جب وہ بحیثیت قوم عادی مجرم بن گئے۔

یہ عام مشہور بات ہے۔ کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم ہیں مگر یہ درست نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ درنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ سو وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔

حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دو تین ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک در بدر رہے پھر پھرتے رہے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی برداشت نہ کیا۔ جہنمی دے ان کے دشمن۔ اٹلی و لے ان کے دشمن۔ یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آج اعتراض ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دعوے تھا کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہو گا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہو گا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ معاذ اللہ قرآن پاک کا دعویٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ چوتھے پائے میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہو گا۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ اِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تھام لینے کی وجہ

سے۔ ہاں قرب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت اُن کو عروج حاصل ہوگا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تویہ قریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس وغیرہ کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کو نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہاتھ اٹھالے تو یہودی سلطنت دردن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ الغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطہ زمین پر عروج حاصل ہے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت یہی ہے۔ وَبَاءُ وَيَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مذابہ ہی لے کر لوٹے۔

آیات الہی
کا انکار

فرمایا ذلک بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ بنی اسرائیل کی ذلت رسوائی کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ امیس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”إِنِّي عَلَىٰ ذِكْرِ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ“ جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت برستی ہے گی اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ جو کفر کی حالت میں مر گیا اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ ان پر اللہ تعالیٰ۔ اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت مسلط ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹھکراتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کیا ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام
کا قتل

بنی اسرائیل پر لعنت مسلط ہونے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ وَفَعَلُوا نَافِلَاتٍ بِنَفْسِهِمْ الْحَقِّ کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں متا ہے۔ کہ انہوں نے یرمیا بنی شعیان بنی۔ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دیگر سینکڑوں نبیوں کو قتل کیا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں خدا تعالیٰ کے تین سوا نبیاء علیہم السلام کو شہید کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے ایسا کرنے

سے منع کیا اور انہیں ملعون و ملامت کی تران کو بھی شہید کر دیا گیا۔ یہ قوم اس قسم کی عادی مجرم بن چکی تھی جس کی وجہ سے یہ مغضوب اور ملعون ٹھہری۔

یہاں پر بَعِثْنَا الْحَقَّ پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ نبیوں کے ناحق قتل کا کیا مطلب ہے؟ جبکہ نبی کا قتل تو بلاشبہ ناحق ہی ہو گا۔ نبی کا قتل برحق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تو مفسرین کرام اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں پر ناحق کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قاتل خود سمجھتے تھے کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سخت عذاب روز قیامت اس شخص کو ہو گا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو گا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو گا۔ دونوں قسم کے اشخاص سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے۔ امیر بن خلف کی مثال موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنے نبیوں سے اس ملعون کو رہا تھا بشرطین مکہ میں سے یہ بڑا خزانہ قسم کا کاڑھ تھا؟

ناظرانی اور
سے مجاور

نفرض! سابقہ بنی اسرائیل کی خرابیاں اور ان کی سزائیں بیان کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل کو سمجھا جا رہا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ۔ خدا کا آخری نبی آگیا ہے۔ اَمِنُوا بِمَا اَنْزَلْتُ جو کچھ میں نے نازل کیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ۔ معافی کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو جاؤ۔ اپنے اخلاق و اعمال درست کر لو۔ تو تم آج بھی عروج حاصل کر سکتے ہو مگر وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت مسلط کر دی گئی۔ انکار آیات اور قتل انبیاء کے بعد تیسری وجہ یہ بیان فرمائی۔ ذَلَّتْ بِمَا عَصَوْا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ عصیان کا معنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ضائع کرنا ہے۔ وہ لوگ حقوق اللہ کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے کسی حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ کَاذِبُوا يَعْتَدُونَ وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ تعدی کا معنی انسانوں کی جانوں اور مالوں کا تلف کرنا ہے۔ بنی اسرائیل کا ذوق ہی بدل چکا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحیح مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ سچی اور

بدی میں تمیز کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ ذَسَرْتَنَّا حَسَنًا وَسَاءَ ثَنًا سَيِّئًا۔ جب تمہاری نیکی تمہیں نیسی لگے۔ اور بُرائی سے نفرت ہو۔ تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو اور اگر نیکی اور بدی میں تمیز پاتی نہیں رہی تو سمجھ لو کہ تمہیں روحانی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

اس کی مثال انسانی جسم کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ جب آدمی تندرست ہوتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ درست ہوتا ہے۔ اسے میٹھی چیز میٹھی لگتی ہے۔ اور کڑوی چیز کڑوی لگتی ہے مگر جب جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اگر کوئی شخص نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے۔ تو وہ صحیح مومن ہے۔ ورنہ وہ بیمار ہے۔

بنی اسرائیل کے لوگ بیمار تھے۔ وہ تعدی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا پاس رکھتے تھے۔ اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال کرنے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے معصوم نبیوں کو قتل کیا جو خدا تعالیٰ کی رحمت اور انسانوں کے لیے موز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی، اس کے احکام کو حیلوں، بہانوں یا تادیلوں کے ذریعے ٹھکرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی برائیوں کی تفصیلات سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء اور مادہ وغیرہ میں آرہی ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ کہ کہیں تم بھی اسی قسم کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جانا، وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ، تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا۔ کہ ہم نے سنا لیا۔ حالانکہ وہ انکار ہی کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انہیں لوگوں کی روش پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی ہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیل ہو جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَانصَرَىٰ وَالْمُتَكَبِّرِينَ مِنْ
أَمْرِ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلُوا صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: جو لوگ مسلمان ہوئے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور جو نصرانی ہوئے

اور صابی، جو شخص بھی ایمان لایا — اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر

اور اپنے تمام کئے۔ پس ان کے لیے ان کا اجر ہے۔ ان کے رب کے پاس اور ان پر

کچھ خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

اس آیت میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں، فساد فی الارض، اس کے نتیجے میں ان
پر سلاطین جانے والی ذلت اور مسکنت کا ذکر تھا۔ آیت زیر درس کے بعد بنی اسرائیل کی یکے بعد دیگرے
خزانیوں کا ذکر ہوگا۔ اس درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتا دیا ہے۔ جس کی پابندی
انتیبا کر کے اور جس پر عمل پیرا ہو کر ان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ قانون کسی خاص فرقے
یا گروہ کے لیے نجات مختص نہیں کرتا۔ بلکہ جو بھی شخص اس میں دیے گئے اصول کی پابندی کرے
گا۔ وہ نجات پا جائے گا۔ خواہ وہ کسی خاندان کی نسل یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ اصل
بنی اسرائیل کے نسبى تفاخر اور مذہبی فرقت کی تردید ہے۔ جس میں وہ مبتلا تھے۔ اور اسی نام
بزدلی کی وجہ سے اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی مومنین، یہود، نصاریٰ اور صابین
کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ سورۃ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ نزول قرآن کے
وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ ان میں مشرکین، یہود، نصاریٰ اور صابی ہیں۔ حضرت
مولانا شیخ السبکی اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت

کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے جنہیں وہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کی پستل کرتے ہیں۔ زبلہ پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

ابن ایمان

اس آیت میں جن مذاہب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ ان میں سرفہرست اہل ایمان ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الْكَافِرِيْنَ اَمْسُوْا بِئْسَ لَكُمْ وِجْيٰهٖ اَيُّ مَسٰكِنٍ۔ ان کے جو ایمان لائے یعنی مسکن ہوئے صرف اَمْسُوْا میں وہ تمام لوگ آجیتے ہیں جو بظاہر ایمان لے آئے۔ اور ان میں منافقین بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بھی کلمہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں بھی ادا کرتے تھے۔ نبی علیہ السلام کی مجلس میں بھی بیٹھتے تھے۔ اور پھر آپ کی اطاعت کا دعویٰ بھی کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اَمْسُوْا کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں اَمْسُوْا سے مراد وہ اہل ایمان ہیں۔ جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر اس کے رسولوں پر اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس خطاب کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ محض زبانی دعوئے ایمان سے نجات ممکن نہیں ہے۔

ہادوا
کا منوم

دوسرے نمبر و فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ هٰکَدُوْا اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے۔ یہاں پر مطلقاً یہودی نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا جو یہودی ہوئے۔ اس میں امتیاز یہ ہے۔ کہ یہود ایک نسل مذہب سے یہ تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ یہودی وہ ہیں جو نسلی طور پر بنی اسرائیل ہیں۔ لہذا یہودی ہونے سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو اگرچہ نسلی طور پر یہودی نہیں ہیں۔ مگر انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا۔ نزول قرآن کے وقت مدینہ کے گرد دلوں میں بنی طی وغیرہ ایسے قبائل تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دُور یا اس سے بھی پہلے جب بڑے بڑے حوادث پیش آئے۔ تو یہ لوگ اپنے اس وطن سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پر ان کے قلعے اور آبادیاں تھیں یہ لوگ صاحب علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اصل یہودی تھے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اسلانی عربی النسل تھے۔ مگر یہودیوں سے متاثر ہو کر اس مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں کے

متعلق کہا گیا ہے کہ جو یہودی ہوئے۔

یہودیوں کو یہود کہنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ نخستین کلام فرماتے ہیں کہ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ نام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یودا کے نام پر ہے۔ اس نام کی دوسری توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے: **هٰذَا نَا الْيَكْنَ** - **هٰذَا**۔ **هُوَ** کا معنی ہوتا ہے۔ رجوع کرنا۔ یہ مومن علیہ السلام کا دعائہ کلمہ ہے۔ جب بنی اسرائیل نے سخت گستاخی کی۔ اور کہا کہ ہم ہرگز اس کتاب کو نہیں مانیں گے۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود ہم سے ہم کلام ہو کر اس کتاب کی تصدیق نہ کرے۔ تو موسیٰ علیہ السلام قوم کے سر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا مطالبہ پور کر دیا۔ مگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر بجلی کی صورت میں نازل ہوا۔ اور وہ سر آدمی ہلک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سخت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ کہ مولا کریم! میں قوم کو جا کر کیا بتاؤں گا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی وہاں لے جا کر مروا دیے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اور عرض کیا تھا: **اِنَّ هٰذَا نَا الْيَكْنَ**۔ مولا کریم! ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ تو بعض فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو یہود لقب اس **هٰذَا نَا** کے بارے سے دیا گیا تھا۔

اس وقت پر یہی دنیا میں یہودیوں کی تعداد دو کروڑ کے ٹک بہت ہے۔ برخلاف اس کے نصاریٰ کم و بیش دو ارب کی تعداد میں ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر کاربند کہتے ہیں۔ مگر ان میں ابتدائے زمانہ ہی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ ان میں سرکشی کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ بعد میں یہ عادی مجرم بن گئے۔ عیسائی ان کی رشتہ میں داخل ہو گیا۔ اور یہ لوگ حقوق العباد کو ضائع کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انبیا علیہم السلام کو قتل کیا۔ یہ لوگ اپنے آباء اجداد کے شیعہ افعال پر نادم ہونے کی بجائے۔ ان پر فخر کرتے تھے۔ کہ وہ بہت اچھا کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے اعمال اور اخلاق میں بے شمار قبائح یہاں تک تھیں۔ اور آج تک موجود ہیں۔

یہودیوں کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جسمانی صورت کے معتقد ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو جسمانیت سے متبرا سمجھتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ اس کا تعلق جسم کے ساتھ بھی ہے۔ اس جسم کو وہ مثالی اور نورانی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جسمانیت شعاع کی طرح ہے۔ جو پھیل جاتی ہے۔ اور سکڑ جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے رویت الہی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْدَةً ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر گریہ، ہنسی، حزن اور غم کا بھی اطلاق کرتے ہیں۔

یہودی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی بڑی بدگمانی رکھتے ہیں۔ بلکہ ان پر تہمتیں لگاتے ہیں۔ تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام پر کیا کیا بستان باندھے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی کہ آپ ہارون علیہ السلام سے حسد کرتے تھے اس لیے آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کیا۔ (العیاذ باللہ) حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں سفارشی تھے کہ: "وَأَشْرِكُكُمْ فِي آمْرِى" (۳۲) کُنْ نَبِيَّكَ كَثِيرًا لِّئَلَّا يَكُونَ لِي دُعا کی تھی۔ "هُوَ أَفْضَلُ مِنِّي لِسَانًا" وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ اے اللہ میری زبان میں بکنت ہے۔ "رَدَا يَصْدَقْنِي" اے میرا معاون بناؤ جو میری تصدیق کرے۔ کہیں فرمایا اے میرا وزیر بناؤ۔ ہم مل کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "أَوْتَيْتَ سُوءًا يَغْوِسُ" اے موسیٰ تیرا سوال پورا کر دیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے مگر یہ بد بکنت یہودی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا۔

یہودیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے بلکہ ولی مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی تو محض ایچی ہوتا ہے۔ مگر دلی نبی سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں تقرب الی اللہ کا وہ زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔

ان بد بختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سونے کا کچھرا خود حضرت بارون علیہ السلام نے بنایا تھا یا انہوں نے بنانے کا مشورہ دیا تھا (العیاذ باللہ) اسی طرح انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ تہمت لگائی کہ انہوں نے اپنے کمانڈر انچیف اور یا کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو گھر میں رکھا (العیاذ باللہ) انہیں لوگوں نے سمجھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا کہ یہ جادوگر اور طلسمات کا ماہر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے بارے میں بہت بڑا جھوٹ ہے۔

یہودی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت دائمی ہے جو کبھی منسوخ نہیں ہوگی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی منکر ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے سخت مخالفت کی۔ اور انہو دجال تک کہا۔ ان بد بختوں نے ان کے منہ پر تھوکا اور انہیں سولی پر لٹکانے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر زنا کی تہمت انہی ظالموں نے لگائی۔ (العیاذ باللہ) یہودیوں کی یہ اخلاقی بدعتیں اور ان کی بڑی خصلتوں کی تفصیلات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ بعض چیزیں تفاسیر میں ملتی ہیں۔ اور بعض تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

نصاری کی وجہ تسمیہ

مومنین اور یہود کے تذکرہ کے بعد تیسرے گروہ کے متعلق فرمایا وَالنَّصَارَىٰ اور نصاریٰ جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لفظ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے۔ اور نصرت کے معنی مدد کرنے کے ہوتے ہیں۔ منسرن کرام فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچاتے تو آپ لوگوں کو مٹی طپ کر کے فرماتے: مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ اللَّهُ تَعَالَىٰ کے راستے میں کون میرا مددگار ثابت ہوگا۔ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِؑ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کے لیے تیار ہیں چنانچہ اسی لفظ سے ان کو نصاریٰ کا نام دیا گیا۔ یعنی نصرت کرنے والے۔ مدد کرنے والے بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے۔ اس بستی کا نام

ناصرہ تھا۔ چنانچہ اس بتی کی نسبت سے اس گروہ کو نصرانی کے لقب سے طعن کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مدینہ کی نسبت کر کے منیٰ کہلاتا ہے۔ یا کسی کو مکی یا شامی وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نصاری کے
عقائد باطلہ

نصاری بھی عجیب و غریب عقائد رکھتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا عقیدہ بالکل مجرا چمکے۔ آج کل کے مسیحی پولس نامی ایک شخص کے بگاڑے ہوئے ہیں۔ یہ شخص مسیحیت کا مبلغ تھا۔ اس نے دین مسیحی کا بالکل حلیہ بگاڑ دیا۔ پولس نے بھی عیسائیت کو اس طرح خراب کیا جس طرح عمر بن لُحی نے دین ابراہیم کو بگاڑ دیا تھا۔ عرب اقوام تقریباً دو ہزار سال تک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مذہب پر قائم رہے۔ اتنے عرصہ تک یہ توحید پرست رہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اس شخص نے عربوں میں بت پرستی کا طریقہ ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نازل قرآن کے وقت سارا عرب شرک میں غرق ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

پولس نے مسیحیت کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول ٹٹنے والے لوگ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ اور ٹیلیٹ کا مسئلہ ان میں رواج پا گیا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آ رہا ہے کہ انہوں نے "إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ" کا عقیدہ بنالید اور اس طرح گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اُس وقت انہوں نے چار گروہ بنالیدے۔ مگر اس وقت کے کچھ تو ملک اور پروٹسٹنٹ دونوں گروہ شرک ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی توحید پر قائم نہیں رہا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا یا ابن اللہ کہا۔ انہوں نے یہ عقیدہ بھی قائم کر لیا کہ خدا عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا ہے۔ یہودیوں نے بھی یہی کہا تھا کہ خدا کچھڑے میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح کا باطل عقیدہ عیسائیوں نے وضع کر لیا۔

سیّد علی جمہوری صاحب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے دو فرقے مردود ہیں۔ اور باقی دس فرقے مقبول ہیں۔ دو مردود فرقے یہی حلول

وایے فوتے ہیں۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی انہی لوگوں کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ خدا اقلے
 بندے کے اندر داخل ہو گیا ہے (العیاذ باللہ) تو یہ حال یہ لوگ بھی اس قسم کی بدعتیہ گئی کا شکار
 ہو چکے ہیں وَالصَّابِغِیْنَ اور صابی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صابی کا عام فہم معنی بے دین ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک
 دین چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے تو اسے صابی کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عرب کے مشرکین
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے تھے۔ یعنی انہوں نے پرانا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے
 تاہم اس مقام پر جس صابی فرقہ کا تذکرہ ہے مفسرین نے اس کی بہت سی تفصیلات بیان کی
 ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فرقہ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ
 نیک نیتی اور سعادت حاصل کرنے کے لیے انسان کسی نبی کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ
 روحانیات اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے تو اس کے لیے یہی کافی ہے۔ انہیں سے
 ان ان فیض حاصل کر سکتا ہے۔ یہ لوگ مختلف قسم کے بسکھل بناتے ہیں۔ مثلاً آفتاب، مابتاب
 ستاروں اور ملائکہ کے نام کے بسکھل بناتے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ قبلہ کی طرف منکر کے سجدہ کرتے
 ہیں۔ یہ لوگ ستاروں کو سجدہ بناتے ہیں۔ اور انہیں قبلہ تصور کرتے ہیں۔

اس فرقہ کے متعلق یہ بھی بکھلے ہوئے ہیں کہ یہ تین نمازیں پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں صابیوں کے
 جانشین پر دیزی اور چکڑاوی ہیں۔ چکڑاوی بھی تین نمازوں کے قائل ہیں۔ ان کے بعض لوگ دو نمازیں
 پڑھتے ہیں اور بعض صرف ایک۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں اسی طرح پر دیز کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ
 نماز کی کوئی حقیقت نہیں۔ صحیح نماز وہ ہوگی جو حکومت مقرر کرے گی۔

صابیوں کی اور بھی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کو کوئی شخص
 ہاتھ لگا دے۔ تو اس کے لیے غسل ضروری ہو جاتا ہے یہ لوگ گدھے اور کتے کے گوشت کو تو
 نہیں کھاتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اونٹ اور بچے دار جانور کے گوشت کو بھی یہودیوں کی طرح
 حرام سمجھتے ہیں۔ یہ پیاز اور باقلی کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔ آرمی، یا مار پھلی یعنی سانپ کی مانند مچھلی
 بھی ان کے ہاں حرام ہے۔ یہ لوگ شراب کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں۔ مگر نئے کو حرام گردانتے

ہیں۔ طلاق کے متعلق ان کا شرعی مسئلہ یہ ہے کہ حاکم وقت کی اجازت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اُن کے ہاں ایک سے زیادہ نکاح بھی جائز نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک عورت سے ہی نکاح ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے صابیوں کے مختلف بیگلوں کی شکل و صورت کا بھی تذکرہ کیا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ علتِ اولیٰ (FIRST CAUSE) یعنی تخلیق پر بھی بیکل بندتے ہیں۔ عقل کا بیکل الگ ہوتا ہے۔ سیاست کا الگ۔ اسی طرح صورت کا بیکل بندتے ہیں۔ اور پھر نفس کا بیکل گول شکل کا بناتے ہیں۔ زحل سیارے کا بیکل مدس شکل کا ہوتا ہے۔ اور مشتری کا بیکل مثلث شکل کا۔ آفتاب کا بیکل مربع شکل کا ہوتا ہے۔ اور مہتاب کا بیکل مٹمن یعنی آٹھ پہلو کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ قیامت کا بالکل انکار کرتے ہیں۔ اس کی بجائے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ چھتیس ہزار چار سو پچیس سال کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر برزی روح کا ایک ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً انسان، چرند، پتہ، کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر ایک کا ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے آئندہ نسل ملتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ دور جب تک موجود ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے گا۔ اس کے بعد یہ تناسخ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ علیٰ ذہن القیاس۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کلدانیوں کی ایک بہت بڑی تہذیب گندی ہے اس کا مرکز بابل شہر تھا۔ جو کہ کم و بیش ایک سویل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر بغداد سے قریباً ستر یا سویل دور تھا۔ اس سے پہلے آشوریوں کی تہذیب کا دور دورہ تھا۔ وہ ختم ہوئی ہو تو کلدانی تہذیب کو عروج حاصل ہوا۔ انیس کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ آپ وہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ مگر مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور شام و فلسطین کو مرکز بنایا۔ پھر خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ تو صابیوں کی طرح یہ کلدانی بھی ستاروں اور روحانیت کے قائل تھے۔ اور ان کو قبلہ بنا کر ان کی طرف سجدہ کرتے تھے

حنیفی بقابل صابی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے مذہب ہیں۔ ایک حنفی اور دوسرا صابی۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صابی دور تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دور حنفیت شروع ہو چکا ہے اب حنفیت کی آگے تین شاخیں ہیں۔ یعنی مسلمان، یہود اور نصاریٰ۔ ان میں سے صرف مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (ملت) پر قائم ہیں۔ باقی دونوں گروہ اصل دین سے ہٹ چکے ہیں۔

دور ابراہیمی سے پہلے جو صابی گروہ تھا۔ وہ اب بھی موجود ہے مگر اس کی بھی تین شاخیں ہیں۔ یعنی مجوس، برہمن اور بدھ، مجوسیوں کو زیادہ تر عروج ایران میں ہوا۔ وہاں ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ایران بعہد ساسانیوں میں موجود ہے کہ مجوس کی بھی دو قومیں ہیں ایک کا نام ایرج ہے۔ اور دوسری کا طور۔ قدیم زمانے میں ایران کے بادشاہ فریدون کے دو بیٹے ایرج اور طور تھے۔ انہیں کے نام پر مجوس کی دو شاخیں پھیل گئیں۔ مجوسی بھی دراصل ایک کتا تھے۔ مگر ہندوؤں کی طرح انہوں نے بھی مذہب کو بگاڑ دیا۔

حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مجوسیوں کے کسی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ زنا کیا۔ اور پھر اسے جائز قرار دینے کے لیے وقت کے علماء کو ساتھ ملایا۔ خود غرض مفتیوں اور عالموں نے بادشاہ کے حق میں فتویٰ دے دیا کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بھی تو بہن کے ساتھ نکاح جائز تھا۔ گویا مجوسیت میں اس قسم کی بے حیائی بھی رواجی تھی کہ ماں کے ساتھ نکاح بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں کی دوسری شاخ برہمن ہے۔ جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور تیسرے بدھ ہیں۔ جو چین اور جاپان میں آباد ہیں۔ یہ سب کی سب صابی امتیں ہیں۔

ان چار گروہوں یعنی اہل ایمان، یہود، نصاریٰ اور صابی کا تذکرہ کر کے اب وہ اصول بتائے جا رہے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ تو فرمایا ان چاروں گروہوں میں سے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ثُمَّ تَخَضَعَ لِحُكْمِ رَاجِلٍ يُّدْعِيْ اِلٰى الْاِيْمَانِ لَآ يٰۤاِيْمَانُ۔ یعنی کوئی شخص کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا بڑا کافر اور مجرم ہو۔ بدترین قسم کا ظالم ہو۔ اگر اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی۔ اور

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا۔ تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور وہ نجات حاصل کر لے گا۔ ایمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا کافی نہیں۔ بلکہ اس کی صفات، اس کی تقدیر و حدائیت، اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو۔ کہ خدا بنی نہیں بھیجتا یا حکم جاری نہیں کرتا۔ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر بغیر توبہ کے مر گیا، تو وہ جہنمی ہے۔ بنی بھیجتا، حکم جاری کرنا، شریعت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا انکار بھی دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا انکار ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض پہنچانے والی مخلوق ہے۔ یہ لطیف اجسام والی نورانی، پاک اور منزہ مخلوق ہے۔ ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالآخرۃ

فرمایا ایمان حاصل کرنے کا دوسرا قانون ایمان بالآخرۃ ہے۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یہ وہی دن ہے جو اس جہان کا آخری دن (LAST DAY OF THIS WORLD) ہو گا۔ پچاس نمبر سال کے اس دن میں تمام انسانوں کا حساب کتاب ہو گا۔ اور اس کے بعد دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ گویا قیامت کے دن کو ماننا بھی اتنا ہی لازم ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ جو شخص روز جزا کا انکار کرے گا۔ وہ بھی کفر میں داخل ہو جائے گا۔

اعمال صالحہ

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے بعد تیسرا قانون وَعَمِلْ صَالِحًا ہے۔ یعنی نجات کا حق دار وہ شخص ہو گا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دیتا ہو۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر اعمال صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہیں۔ فہمائے کرام البتہ جہاد کو بھی بنیادی اعمال میں شمار کرتے ہیں۔ توجہ لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ان بنیادی اعمال کو بھی انجام دیں گے۔ ان کے متعلق فرمایا فَدَمَّرْ جَزَاءَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اَنْ كَرَّانَ کے رب کے پاس بدلہ لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا وَرَاحَتُكَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ان پرستقبل میں کوئی خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ وہ سابقہ اعمال

پر غمگین ہوں گے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ مگر یہ طبعی اور عارضی ہوگا۔ بالآخر وہ ہر قسم کے خوف سے بچ جائیں گے۔ بعض اوقات دنیا میں بھی بعض نیک لوگوں کو مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اور وہ ملال و حزن سے دوچار ہوتے ہیں مگر یہ عارضی چیز ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے ایسے لوگوں کو خوف نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ حشر و اسے دن کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ بڑے دن کی گھبراہٹ بھی انہیں خوفزدہ نہیں کرے گی۔ اللہ ان کے دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ وَتَلْقَاهُمُ الْمُطَهَّرُونَ فرشتے ملاقات کریں گے تو انہیں تسلی دیں گے۔ کہ گھبراہٹ اب تمہارے لیے امن ہی امن ہے۔ اور آئندہ بھی کوئی خوف نہیں ہوگا۔ کہ ہم سے کسی وقت کوئی نعمت چھین جائے گی۔ یا کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ لوگ دنیا میں انجام دیے گئے اپنے کسی عمل پر بھی غمگین نہیں ہوں گے۔

الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویدار ہو یا یہودیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہو یا صابی۔ نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ آخرت کے دن پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے مگر نجات کا دار و مدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتلادیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آ رہی ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ
بِقُوَّةٍ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۲﴾ ثُمَّ لَوَّيْتُمْ مِمَّنْ كَبَدَ
ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۳﴾

تم جبرہ بنہ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔ اور ہم نے تمہارے
اوپر طور کو بلند کیا۔ جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور یاد کرو جو کچھ اس میں
ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور

اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے ﴿۶۴﴾

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ہی ذکر ہے۔ اس سے پہلی آیت میں قانون
نجات کی تفصیل بیان کی گئی تھی کہ نجات کسی خاص فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا
دار و مدار ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ پر ہے۔ آیات ذریعہ میں بنی اسرائیل کی توجہ
اس واقعہ کی طرف دلائی جا رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جو کتاب میں
تمہیں دے رہا ہوں اس کے احکام کی پابندی کرو گے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ یہ احکام تو بڑے مشکل
ہیں ہم سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈرانے کے لیے ان کے سروں پر کورہ طرہ
کو کھڑا کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَلَئِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ
ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔

بنی اسرائیل
کا عہد

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات حاصل ہو گئی۔ فرعون اور
اس کے تمام لشکر ہلاک ہو گئے۔ تو بنی اسرائیل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی کہ ہمارے
لیے کوئی شریعت مقرر کرو۔ جس کی ہم پابندی کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

تورات عطا فرمائی۔ مگر وہ طرح عرض کے جیسے بہانوں سے اس کے احکام کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور تو انہوں نے تورات کے منزل من اللہ ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور اعتراض یہ کیا کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے کیلئے تیار نہیں جب تک خود اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق نہ کرے۔ کہ یہ اس کی عطا کردہ کتاب ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام شراذیموں کو لے کر کوہ طور پر گئے۔ ان لوگوں نے اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔ مگر اس کے باوجود گستاخی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی کہ بجلی آئی اور سب کو خاکستر کر گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندہ کی عطا کی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود طور سے واپس آنے والے لوگوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہم سے ہمکلام ہوا ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ یہ کتاب میں ہے ہی دی ہے۔ مگر اس کے تمام احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس قدر ممکن ہو۔ اس پر عمل کر لینا اور باقی کو چھوڑ دینا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا۔ کہ تورات کے جملہ احکام تو بہت مشکل ہیں۔ لہذا ہمیں ساری تورات پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہوں نے صحیح احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اس کتاب پر عمل کرنے کا پختہ عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی کو فرمایا گیا ہے۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا جیسا کہ

الفاظ سے ظاہر ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائے کی طرح کھڑا کر دیا تھا۔ اتنی خوفناک صورت حال تھی کہ پہاڑ کسی وقت بھی ان پر گر کر ان کو پکنا چور کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پوچھا کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے یا نہیں۔ تو انہوں نے عہد کیا کہ مولا کریم! ہم سے یہ مصیبت ہالٹ ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر عمل پیرا ہوں گے۔

معجزات کے بعض منکرین رَفَعْنَا کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

کہ پیڑ کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلق نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ بنی اسرائیل کو پیڑ کے دامن میں اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ پیڑ کا کچھ حصہ ان پر ٹھکا ہوا تھا۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے سورۃ اعراف میں نَتَقْنَا کا واضح لفظ آتے ہے جبکہ مطلب کھڑا کر کھڑا کر دینا ہے اور معجزانہ طور پر ایسا ہو جانا کوئی عیب بات ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی نکال سکتا ہے سمندر کو پھینک کر اس میں بارود راستے بنا سکتا ہے۔ مگر اور سنوئی نازل کر سکتا ہے وہ اگر کسی پیڑ کو اٹھا کر سروں پر معلق کر دے تو کون سی بڑی بات ہے۔ بلکہ تورات میں تو یہ تفصیل بھی آتی ہے کہ نہ صرف پیڑ معلق ہو گیا تھا۔ بلکہ ساتھ دھواں اٹھ رہا تھا اور آگ کے شعلے سامنے نظر آ رہے تھے الغرض ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ عہد لیا۔ جس کا تذکرہ اس آیت میں آتا ہے لغوی طور پر پیڑ پر بولا جاتا ہے۔ جو سرسبز ہو۔ یعنی اس پر بکثرت درخت پائے جائیں۔ خشک پیڑ کے لیے طور کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں پر جس پیڑ کا ذکر ہے یہ وہی طور ہے۔ جو صحرائے سینا کے اطراف میں واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے شرف تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی پیڑ پر آپ کو توراۃ ملی تھی۔

دین میں جبر نہیں

بنی اسرائیل کے سروں پر طور معلق کر کے عہد لینے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ تو جبری عہد ہو گیا۔ جو کہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ یعنی دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر یہاں پر جبراً عہد کرایا گیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ خشک دین میں جبر نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کو کوئی دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ خواہ اس کا دل ماننے یا نہ ماننے۔ کم از کم اسلام میں تو ایسا نہیں ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے۔ کہ تبلیغ کی جائے۔ اسلام کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ اس کے متعلق اگر کوئی غلط فہمیاں ہیں۔ تو انہیں دور کیا جائے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ اور اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اسلام کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کسی بھی زمانے میں کسی پر جبر نہیں کیا۔ نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا۔ البتہ کیمونسٹوں اور عیسائیوں کی تاریخ واضح ہے۔ کہ انہوں نے کیسے کیسے ظلم کئے۔ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اور بعض کو تہ تیغ کیا گیا۔

کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قطعاً جبر روا نہیں۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے۔ جو قانون ظلمی کا سر تکب ہو گا۔ اس پر جبر بھی ہو گا۔ بنی اسرائیل پر پیارا معلق کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جو عہد کیا تھا۔ اس کی پابندی کرو۔ ورنہ یہ پیارا تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ تورات میں تو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مدفن یہیں بنے گا۔

اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے۔ تو سارا معاملہ ہی درجہ برہم ہو جائے گا۔ حدود اور تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ جب کسی طرز کو سزا دی جائے گی۔ تو وہ جبر جبر کی دہائی مینے لگے گا۔ کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے۔ اُسے جبر اکوٹے لگائے جائے ہیں یا اُسے جبر اقصیٰ میں ڈالا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہو گا۔ بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہوگی۔ الغرض! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبر سزا دی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کے زمانہ میں سلطان سلیم ترکی نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر حکم دے دیا کہ ترکی کی عملداری میں تمام عیسائیوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے۔ اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو اس حکم کی خبر ملی۔ تو فوراً سلطان کے پاس پہنچے اور اس سے اس حکم کے متعلق دریافت کیا۔ سلطان نے تسلیم کیا کہ اُس نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر یہ حکم صادر کیا ہے۔ تو شیخ الاسلام نے دروڑک الفاظ میں سلطان سے کہا کہ آپ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر آپ غیر مسلموں پر جبر کر رہے ہیں کہ وہ اسلام میں داخل ہوں۔ سلطان بات کو سمجھ گیا اور اپنا حکم واپس لے لیا یہ تاریخی واقعہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور انہوں نے اس کی پابندی کا اقرار کیا تو اہتمساک بالکتاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ اُسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ اہتمساک بالکتاب کا مطلب یہ ہے کہ اُسے تسلیم کرو۔ اس پر ایمان رونا اور پھر اسی کے مطابق عمل کرو۔ مضمون کرام فرماتے ہیں: نہ پورے کوشش اور جانفشانی کے ساتھ اس کا

پڑھنا پڑھانا۔ لیکن سچا۔ اس میں مندرج قوانین کی پابندی کرنا انسان کی ترقی اور خطیرۃ القدس کا نمبر بننے اور علیتین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ غرض کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب مضبوط ہاتھوں سے پکڑنا نہیں۔ بلکہ اس کے قوانین پر سختی کے ساتھ عملہ رائج کرنا ہے۔ محض خالی خالی وعدوں سے کام نہیں بنے گا۔

قوانین کی پابندی

استمک بالکتاب کے بعد دوسرے نمبر پر فرمایا وَاذْكُرُوا مَا فِيْهِ اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد کرو۔ یعنی اس کو پڑھتے پڑھاتے۔ ہو۔ یہ قرآن پاک قانون خداوندی ہے۔ سنت رسول اس کی شرح ہے۔ مگر آج کتنے لوگ ہیں۔ جو قرآن و سنت سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات ہمیں سمجائی جا رہی ہے۔ کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔ اُسے یاد کرو۔ اس کو خود پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس کی تشریح کرو۔ تاکہ قانون کی تفصیلات عوام ان تک پہنچ سکیں۔ جس طرح ایک عام دنیوی حکومت کے قانون کی تشریح ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

شاد عبد العزیز فرماتے ہیں۔ کہ حاکم وقت کو اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہونا چاہیے۔ جیسے کوئی باپ اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ ایک باپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ ہر شریف النفس باپ ایسا ہی چاہے گا۔ بلکہ باپ تو یہ پسند کرے گا۔ کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ ترقی کرے۔ اسی طرح حاکم کو بھی اپنی رعایا کی تربیت اور ادب و کمال حاصل کرنے چاہیے۔ اور اپنے قانون کی خوب تشریح کرنی چاہیے۔ تاکہ رعایا کا کوئی فرد اس سے ناواقف نہ رہے۔ اور قانون پر عمل پیرا ہو جائے۔ اب اگر حاکم خود اپنے قانون کی پابندی کرے گا۔ تو رعایا بھی اس پر کاربند ہوگی۔ اور اگر وہ خود پابندی نہیں کرتا تو وہ دوسروں سے کیسے پابندی کر دے گا۔ جو شخص خود فاسق و فاجر اور بدکار ہے وہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا کیا درس دے گا۔ جو خود جوار کھیتا ہے۔ وہ دوسرے جوار یوں کر کیسے سزا دے گا۔ شرابی حاکم شرابیوں سے کیسے

نہیں گا۔ لہذا ضروری ہے کہ حاکم پہلے خود قانون کی پابندی کرے اور پھر دوسروں کے سختی کے ساتھ پابندی کروائے۔ اس کے بعد جو کوئی قانون شکنی کرے اسے سخت ترین سزا دے۔

فرمایا وَإِذْ كَرُمُوا مَا فِيهِ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اور اس کے پڑھانے کے لیے وسائل بھی مہیا کرو۔ مدرسے قائم کرو۔ معلم مقرر کرو تاکہ ہر خاص و عام اس کی تعلیمات سے مستفید ہوں۔ اُسے علم ہونا چاہیے کہ ہمارا قانون بہترین قانون ہے۔ اس دستور سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دستور نہیں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میں تمام شریف ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ غور کریں گے تو اسلام سے بہتر کوئی قانون نہیں پائیں گے۔ لہذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ جس طرح میں نے اس دستور کو قبول کر لیا ہے۔ آؤ تم بھی اسے لے لو۔ اور فلاح پا جاؤ۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے۔ وَإِذْ كَرُمُوا مَا فِيهِ کا یہی مطلب ہے۔

وہ کون سے جرائم ہیں۔ جو اس دنیا میں نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توفیر دیا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ کہ زنا کے قریب تک نہ جاؤ۔ مگر آج آپ کے سامنے کیا کیا واقعات پیش ہو رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور پھر انہیں ہلاک کر دینا ایک عام معمول بن چکا ہے جس سرزمین پر اس قسم کے واقعات پیش آتے ہوں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے نازل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی آسکتا ہے، ۱۹۱۷ء میں روس میں کیا ہوا۔ پونے دو کروڑ انسانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ بڑے بڑے مالداروں کو ٹانگوں سے باندھ کر کسی کسی میل تک ٹھسٹا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں کی طرف ذاری کرتے تھے یہ لوگ انسانیت کے دشمن تھے۔ جس معاشرے میں اس قسم کے ظلم ہوتے ہوں اور ان کے انسداد کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ عنقریب دنیا کے سامنے آجائے گا۔

فرمایا جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے اسے یاد کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا لَعَلَّكُمْ تُشْقَوْنَ کہ تم متقی بن جاؤ گے۔ اگر انسان کا عقیدہ صحیح ہو۔ قرآن پاک کو پڑھتا پڑھاتا ہے۔ ذہینہ تبلیغ انجام دیتا ہے۔ تو متقیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ اور تقویٰ ایک ایسی چیز ہے۔

جس کو اختیار کرنے سے شریعت کے احکام کی تعمیل انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک کو **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی عسکر

فرمایا اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد **ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ** تم اس کے بعد اس عہد سے پھر گئے۔ اسے پورا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بھی تم پر مہربانی کی اور تمہیں موقع دیتا رہا کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کر سؤ۔ حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک بھی نازل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری نبی علیہ السلام بھی آچکا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ایفائے عہد کرتے ہوئے **وَامِنُوا بِهَا** انزلت **مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** اس چیز پر ایمان لے آؤ جو میں نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک جو کہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے۔ جو پہلے سے تمہارے پاس ہے۔ یعنی توراۃ اور دیگر کتب سماویہ۔ لہذا اب بھی موقع ہے کہ ایمان لے آؤ **وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ** اور اس کے ساتھ اولین کفر کرنے والے نہ بنو اگر ایسا کر دو گے تو آنے والی نسلیں بھی تمہارے ہی نقش قدم پر چل کر راہِ راست سے ہٹیں گی۔

فرمایا اس کے باوجود **فَكُونُوا قٰصِدِيْكُمْ** **وَرَحْمَةً اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ** کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی **لَا كُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ** تو تم نقصان اٹھانے والوں میں نہ ہوتے۔ فوراً ہلاک ہو جاتے اور تمہیں دوبارہ موقع بھی نہ ملتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہِ راست پر آ جاؤ۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور دوبارہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُفُّوا قِرْدَةً خَاسِبِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو، ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سب کے لئے دنِ یادتی کی تھی۔ پس ہم نے ان کو کما کر ذیل بندہ بن جاؤ ﴿۶۵﴾ اور بنا دیا ہم نے ان لوگوں کو عبرت ان کے لیے جو اس وقت موجود تھے۔ اور جو پیچھے آنے والے تھے۔ اور متقیوں کے لیے نصیحت بنادیا ﴿۶۶﴾

یہود کا مقدس دن ہفتہ

گذشتہ آیات میں اُس عہد و پیمان کا ذکر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ کہ وہ تورات پر عمل پیرا ہوں گے۔ اب ان آیتوں میں خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد دلایا ہے جس میں ان نافرمانوں کو سزا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی درِ یادتی کی تھی ہفتے کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم نازل فرمایا تھا کہ اس دن کوئی شخص کوئی کام نہ کرے نہ تجارت کرے نہ زراعت کرے نہ مزدوری کرے اور نہ کوئی دوسرا کام انجام دے حتیٰ کہ گھر میں کھانے پینے کی بھی ممانعت کر دی۔ اور حکم دیا کہ اس روز صرف عبادت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ کر دی کہ جو کوئی ہفتے کے روز اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی کاروبار کرے گا۔ وہ جاک ہو جائے گا۔

جموں نصیحت

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے توار کا دن مقدس ہے مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی

رکھا ہے۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم بھتے کے روز شکار نہیں کرتے بلکہ اگلے روز کرتے ہیں۔ لہذا یہ کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

شاہ عبدالغزیزہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہی حیلہ استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ تو انہوں نے لوگوں کو کھیتی سے منع کیا اور بتایا کہ اس روز شکار کرنا حرام ہے۔ یہ حیلہ سازی بہت بُری بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کام تو ہم اپنے اباؤ ^{بعد} سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں ہے۔ کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے کہ جس چیز کو تم شرک بتاتے ہو۔ یہ کام تو ہم منذ بعد نسل کرتے چلے آئے ہیں۔ اگر یہ واقعی بُرائی کا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور ہمیں روکنے کے لیے ہمارے ہاتھ بند کر دیتا۔ چونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لہذا یہ کوئی بُرا کام نہیں۔

الغرض! حضرت داؤد علیہ السلام نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور برائیوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح تنبیہ کی۔ کہ اگر تم اپنی بُری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آ گئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ گویا ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ تران کے مقابلے میں صاحبین کا ایک گروہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا۔ جو خود تو بُرائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا۔ مگر دوسروں کو روکنا بھی نہ تھا۔ آگے قرآن پاک میں آتا ہے کہ یہ گروہ بُرائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر صالحین کا گروہ انہیں جواب دیتا "مَعِذَةُ إِلَى رَبِّكُمْ وَعَلَيْكُمْ وَيَتَّقُونَ" کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے مذہبی کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تم نے انہیں بُرائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہو گا۔ قیامت کے روز ندامت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت

لوگوں تک پہنچائیں۔ اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص راہِ راست پر آجائے
 اسی واسطے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے: کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ
 کو مجھڑا عطا کیا اور جہاد کے لیے روانہ کیا تو فرمایا: لَآ اَنْ يَّلْبِسَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا اَخِيْرًا
 مِنْ اَنْ — تَكُوْنَ لَكَ حُصْرَ النَّفْسِ اگر ایک آدمی نے بھی تمہاری وجہ سے ایمان
 قبول کر لیا۔ تو یہ تمہارے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے بھی بہتر ہوگا۔ جہاد کا اصل مقصد
 جنگ و جدال نہیں بلکہ اس کا مقصد فتنہ و فساد کو مٹانا اور درندہ صفت لوگوں کو راستے سے ہٹانا ہے
 وقت گزرتا گیا۔ اور یہ قینوں گروہ اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار صحابین نے سوچا
 کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک گھبرا کر رہیں گے۔ کیوں نہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔
 کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور ہم بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے
 باقی دو گروہوں کا بائیکاٹ کر دیا اور قریب ہی اپنے علیحدہ علاقے میں مستقل ہو گئے۔ ان دونوں
 علاقوں کے درمیان دیوار یا کوئی اور آڑ بھٹی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔
 البتہ ایک دوسرے کی آوازیں سن سکتے تھے۔

انسان بند
 بن گئے

ایک دن ایسا ہوا کہ صحابین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سنی۔ اور
 نہ ہی ان کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے جھانک کر دیکھا۔
 تو اللہ تعالیٰ کا حکم اچکا تھا فَقُلْتُ لَهُمْ كُوْنُوا قِرْدَةً خَاسِیْنِ یہ ہم نے کہا کہ تم سب
 ذیل بند رہن جاؤ۔ چنانچہ صحابین نے دیکھا کہ اس گروہ کے بڑے بڑے خنزیروں کی شکل میں اور
 نوجوان طبقہ بندروں کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ٹھکیں تبدیل ہو چکی ہیں مگر شعور باقی ہے۔ اپنے
 کیے پر نادم ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے فلاں رشتہ دار
 ہیں۔ اور یہ فلاں رشتہ دار ہیں۔ اس مقام پر صرف بندروں کا ذکر ہے، ہم دوسرے مقام خنزیر بھی آتا
 ہے۔ فَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرْدَةَ وَالْخَنَازِيرَ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس شکل و صورت
 میں تین دن تک زندہ رہے۔ اس کے بعد ہلاک ہو گئے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان بندہ اور خنزیر یکے بن گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں ڈارون کی تھیوری کا بھی عام چرچا ہے۔ جو کہ سچ ہے۔ کہ موجودہ انسان بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ پہلے سب بندہ ہی تھے۔ مگر ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اس کا دعویٰ اس دلیل پر مبنی ہے۔ کہ بندہ کی شکل انسانی شکل کے مشابہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بندہ یا خنزیر کی نسل نہیں ہے۔ اور نہ بندہ انسان کی نسل سے ہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ بندہ اور انسان پہلے بھی علیحدہ علیحدہ نسلیں تھیں اور آج بھی ویسی ہی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معترضین ڈارون کی تھیوری کو تسلیم کرنے میں تو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے مگر جب قرآن پاک لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو بندروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ تو انہیں یقین نہیں آتا۔

بخاری اور مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منع کیا تھا کہ تمہارے لیے چربی کا استعمال جائز نہیں۔ خواہ حلال جائز ہی کی ہو۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس طرح حیلہ سازی کی کہ چربی خود تو نہیں کھاتے تھے۔ مگر اسے پگھلا کر فروخت کر دیتے تھے۔ اور اس کی قیمت کھا جاتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ تمہارے لیے چربی حرام ہے تم اسے کیوں کھاتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم چربی تو نہیں کھاتے۔ بلکہ اسے فروخت کر دیتے ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ اے ایمان والو! اس چیز کا ارتکاب نہ کرو جس کا یہود کرتے تھے۔ فَتَسْجَلُوا مَحَارِمَ اللَّهِ بِأَفْئِئَةِ الْحِيلِ کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حیلے بہانے سے حلال کر لیتے تھے۔ کیسے تم بھی ان کی پیروی نہ کر کے مغضوب علیہ نہ بن جانا۔

یہود بعض برائیاں کھلے عام کرتے تھے مثلاً سود علی الاعلان کھاتے تھے اسی طرح دوسروں کا مال ناحق کھا جاتے تھے مگر ان برائیوں پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی شکلیں مسخ نہیں کیں۔ ایسا کیا ہے۔ تو اُن جرائم پر جن کا ارتکاب انہوں نے حیلے بہانے سے کیا۔ معلوم ہوا کہ ناجائز

حید سازی بہت بڑی خصلت اور بہت بڑا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حید سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا، نہ بڑا سخت جرم ہے ایسا کرنے والوں کی اگرچہ اب شکلیں تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حید سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی آمدنیوں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حید سازی اور حرام ہے۔

جائز حید سازی

اگر نیت نیک ہو اور حید سازی حرام سے بچنے کے لیے کی جائے تو یہ جائز ہے۔ حضور علیہ السلام نے بعض امور میں خود حید سازی کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آتا ہے: کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے بہت اعلیٰ قسم کی کھجوریں لائے۔ آپ نے دریافت فرمایا اَکُلْتُمْ خَبْرًا خَبْرًا فَهَكَذَا کیا خبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! بعض گھٹیا اور ناقص قسم کی کھجوریں بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے مزید دریافت کرنے پر صحابہؓ نے بتایا کہ ہم ادنیٰ قسم کی دو صاع کھجوروں کے عوض اعلیٰ قسم کی ایک صاع کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ذَلِكَ الرَّجُلُ یہ تو سود ہو گیا۔ ایک ہی جنس کا لین دین تو بڑا بری کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ذکر کم و بیش۔ ایسا نہ کرو۔ یہ حرام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے مسئلہ کا حل یہ ہے۔ کہ پہلے ادنیٰ قسم کی کھجوروں کو کسی دوسری جنس مثلاً گندم، جو کے عوض بیچ ڈالو۔ یا ان کی نقد قیمت وصول کر لو۔ اور پھر اُس سے اعلیٰ درجے کی کھجوریں خریدو۔ یہ حید جائز ہے۔

اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں بھی ملتی ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کسی معمولی بات پر ناراض ہو گئے۔ تو قسم کھائی۔ کہ تندرست ہو گیا۔ تو بیوی کو سولا گھٹیاں یا کوڑے ماروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تمہاری بیوی نیک خاتون ہے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ بلکہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے تو چھڑیوں کا ایک گھٹلے لو۔ اور ایک ہی دفعہ بیوی کو ضرب لگا دو یہ کافی ہے۔ گویا سو کٹھنوں کی سزا سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حید سازی بتلائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی حیلہ سازی کا ذکر آتا ہے۔ کہ آپ نے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس ملک کے قازن کے مطابق وہ انہیں نہیں روک سکتے تھے۔ اُدھر اسرائیلی قانون کے مطابق جو شخص چوری کا ارتکاب کرے اُسے سال بھر غلامی کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائی کو روکنے کے لیے اسرائیلی قانون کا سہارا لیا۔ اور اس کے لیے حیلہ یہ بنایا کہ اس کے سامان سے پیانا برآمد کر لیا۔ اسی حیلہ سازی کو قرآن پاک نے اس طرح بیان فرمایا: كَذَلِكَ كَدْنَا لِيُوسُفَ اٰهَمًا نے یوسف علیہ السلام کو ایسا کرنے کی تہنیت بھائی کی۔ البتہ ناجائز حیلہ سازی بہر حال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے زیور بیوی کے نام ہبہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا۔ تو بیوی نے خاوند کے نام ہبہ کر دیا۔ گویا نہ کسی کے ہاں زیور پورا سال گزرے اور نہ اس کی زکوٰۃ دینی پڑے۔ یہ حیلہ سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرعن، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرے گا تو مجرم محکم ہے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی شکل میں اخصاص طہ پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔ مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

محققین فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کرے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گھر کر حیوانیت کے درجے پر آگیا۔ اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے انسان بندے زیادہ مشابہ ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل و صورت کے علاوہ بندہ جس اور شعبہ میں

بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نفع جانور ہے۔ جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھ لے اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے اُن نافرمانوں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل کیا جو اُن سے زیادہ مشابہ ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں: کہ جب اکیلا آدمی کسی ضابطے کی پابندی کرتا ہے۔ تو اسے اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس کوئی معاملہ طے کرتے ہیں۔ تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون کی ادنیٰ ترین صورت یاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضابطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا۔ تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاملہ یا (AGREEMENT)

ہوتا ہے۔ جسکی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چلی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ جانور کی سطح پر آجائے گی۔ جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں۔ اسی طرح مرد اگر اپنی منکوحہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر پڑے دیکھتا ہے۔ تو وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

اب نکاح کی بھی شرائط ہیں۔ نکاح ایسے مرد اور عورت کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جو آپس میں محرمات میں سے نہ ہوں۔ اگر محرم ہوں گے۔ تو نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اگر ایسا کریں گے تو قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ امیر شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: کہ ان تمام شرائط کے ساتھ جو کام ہوگا وہ درست ہوگا۔ ورنہ قانون شکنی کی زد میں آجائے گا۔ اسی طرح مباشرت کے لیے بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ جب مرد اور عورت آپس میں ملیں گے۔ وہ بھی فطری طریقے سے غیر فطری راستے سے استماع بھی خلاف قانون ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں۔

قانون شکنی پر خنزیر اور بندر کی سزا اللہ تعالیٰ نے اس واسطے دی ہے کہ یہ دونوں جانور اخلاقی طور پر دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گرے ہوئے ہیں۔ خنزیر ایک ایسا جانور ہے کہ اس کی دہ کے ساتھ کئی کئی نریک وقت جھنجھکتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔

اور بندر کی ایک بہت بڑی خصلت یہ ہے کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قضائے شہوت کرتا ہے۔ خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت سمجھتے ہیں۔ انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں بے غیرتی کا وہ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں۔ جو خود قانون شکن ہے۔

نماز کا ایک اہم قانون ہے کہ مقتدی اہم سے آگے نہ نکلے۔ رکوع، سجود، قنوت، تہنہ، ہر مقام پر اہم کی اقتدار میں ہے۔ اور اگر کوئی نمازی اہم سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گدھے کے ساتھ دی گئی ہے۔ جو کہ بڑا بوقوت جانور ہے۔ گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے۔ وہ گدھے کی مانند ہے۔ یہ تو اس کی بطنی صورت ہے۔ فرمایا اہم سے آگے نہ نکلے۔ ایسا نہ ہو یَجْعَلُ اللَّهُ صُورَتَهُ صُورَةً حَمَارٍ کہ اللہ تعالیٰ اس کی شکل گدھے کی نہ بنائے یعنی کہیں غلامی طور پر بھی قانون شکن گدھا ہی نہ بن جائے قانون شکنی پر سخت وعید آئی ہے۔

فرمایا بنی اسرائیل! تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی کی اور حکم بجا نہ لائے۔ بلکہ جلد سازی سے اس کی عورت کو توڑا۔ تو ہم نے انہیں کہا۔ کہ ذیل و خوار بندر بن جاؤ۔ پھر جب وہ بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گئے۔ تو باقی دنیا کے لیے وہ نشان عبرت بن گئے۔ فَجَعَلْنَاهَا نَكَارَةً لِّمَنْ يَّرْتَدُّ عَنْهَا وَمَا حَسِبْنَاهُمْ أَن يَكُونُوا نَكَارَةً لِّمَنْ يَّرْتَدُّ عَنْهَا اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنادیا۔ لوگوں کی زبانوں پر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔ کہ فلاں قوم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیر اور بندر

بنادیا۔ یہ اس لیے کہ اس واقعہ کو یاد کر کے آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔
 فرمایا تبدل اشکال محض عبرت کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ بھی
 بنادیا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے اس واقعہ میں نصیحت ہے۔ کہ اگر آئندہ بھی
 کسی نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا۔ تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ
 نے متقیوں کے لیے اس واقعہ کو نصیحت بنادیا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً
قَالُوا اتَّخَذْنَا هُزُوءًا قَالِ اعْمُدْ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿١٦﴾

ترجمہ: اور جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیا
ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا تو بتاتا ہے ہم کو ٹھٹھاکا ہوا موسیٰ
علیہ السلام نے کہا۔ پناہ بخدا۔ اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں ﴿۱۶﴾

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی جیلہ سازی کا تذکرہ بیان فرمایا تھا۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ
کے قانون کو کس طرح توڑتے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں ان کی شکلوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ اور بالآخر وہ
ہلاک ہو گئے۔ آیت زیر در اس میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اس
قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو مان چاہا۔ انہ اس ضمن میں طرح طرح
کے سوال کئے۔ گویا بال کی کھال اتار رہے ہیں۔ من حیث القوم یہ خرابی بھی بنی اسرائیل میں موجود تھی۔
اس آیت میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔

در اصل گائے ذبح کرنے کا حکم ایک خاص مقصد کے تحت دیا گیا تھا۔ جس کا ذکر اگلے رکوع
کی پہلی آیت میں ہے: وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأَتْكُمْ فِيهَا جَسْمًا مِّنْ نَّفْسِكُمْ
شخص کو قتل کر ڈالا۔ اور الزام ایک دوسرے کے سر نہونے لگے وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ
تَكْتُمُونَ۔ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرے والا ہے۔ جس کو تم چھپاتے ہو۔ قتل تو ہو گیا۔ مگر قاتل
کا پتا نہیں چلتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کا ایک ٹکڑا
مقتول کے جسم پر مارو، تو وہ زندہ ہو کر خود بتا دے گا کہ اس کا قاتل کون ہے، چنانچہ قاتل
کا پتا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کا تذکرہ آیت زیر در
میں ہو رہا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مقصد کی خاطر گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس کو تو بعد میں بیان کیا ہے۔ مگر اس حکم کا تذکرہ پہلے کر دیا گیا ہے۔ گویا واقعات کے تقدم و تاخر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کے متعلق مغتفرین کرام بیان کرتے ہیں: کہ قرآن پاک کا اسلوب بیان یہ ہے کہ جو چیز زیادہ ضروری ہوتی ہے اُسے پہلے بیان کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے دو اجزاء ہیں۔ ایک اصل قتل جس میں مقتول کا حق ضائع ہوا۔ اور دوسرا جزو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذُبُّوْا بِنَفْسِكُمْ ۖ اَلَا تَرَآیَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی حکم دیتا ہے کہ گھٹے ذبح کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم بندوں کے حق پر مقدم ہے اس لیے گائے ذبح کرنے کے واقعہ کو مقدم رکھا اور اصل وقوعہ قتل کو مؤخر کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں بعض دوسری مثالیں بھی ملتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے حق کو بندوں پر مقدم رکھا گیا ہے مثلاً وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلٰہًاۤ اِثٰرًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۚ تِیْرَی رُبِّی فِیْ صَدِّکَ دِیَا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا حق پہلے بیان کیا اور والدین یعنی بندوں کا بعد میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ لقمان میں آتہ ہے: وَ اِنْ جَاہَدَكَ عَلٰی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِہٖ عِلْمٌ فَا تَطَعْہُمْ ۗ کہ ماں باپ اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع کرنا چاہیں یعنی تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو ان کی اطاعت مت کرو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا اس واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذبح گائے کو مقدم رکھا۔ کہ یہ اس کا اپنا حق ہے اور مقتول کے حق یعنی دیت یا قصاص وغیرہ کو مؤخر کر دیا۔

اس واقعہ سے حیات بعد الممات کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے: کَذٰلِکَ یُحٰی اللّٰہُ الْمَوْتٰی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اُس مردہ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ اور پھر حساب کتاب اور جزا و سزا کے تمام واقعات پیش آئیں گے۔

درج قتل

ملا علی قارئ دسویں صدی کے بڑے پائے کے محدث گندہ رے میں آپ کا اصل وطن ہرات تھا۔ مگر مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربی میں مرقات کے نام سے مشکوٰۃ شریف کی جلد ہدایہ شرح لکھی ہے۔ اپنی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا دولت مند

شخص تھا جس کی ایک بیٹی غمی کسی نے اُسے نکاح کا پیغام بھیجا مگر اس شخص نے قبول کیا جسکی وجہ سے اُسے قتل کر دیا گیا۔

علم طور پر مفسرین کرام وجہ قتل یہ بیان کرتے ہیں کہ عیسیٰ نامی ایک دولت مند شخص تھا جو کہ لادولہ تھا۔ اُس کے بھائی کے لڑکے اس کی جائیداد کے وارث تھے۔ چنانچہ اس کے بھتیجے اس تاک میں تھے کہ یہ مرے تو اس کی جائیداد پر قبضہ کریں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اُس شخص کے بھتیجے مناسب موقع کی تلاش میں ہے۔ آخر ایک دن اُسے کسی کام کے بہانے کہیں دوسری جگہ سے گئے اور دیرانے میں جا کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی دنیا پیٹنا شروع کر دیا۔ کہ کسی نے اُن کے چچا کو قتل کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ قریبی بستی والوں پر قتل کا الزام لگایا۔ اور اُن سے دیت بھی طلب کی۔ مگر بستی والوں نے اس قتل میں موت ہونے کی نفی کی اور کہا کہ ہم اس معاملہ میں بالکل بے گناہ ہیں؛ فَادْرَا تَسْوِيْهُمَا میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ قتل کا الزام ایک دوسرے پر لگا ہے تھے۔

قانون قسامت یہ ہے کہ اگر کسی مقتول کے قاتل کا پتا نہ چلتا ہو۔ تو وقوعہ قتل سے قریب ترین بستی کے لوگوں سے قتل کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اگر وہ انکار کریں تو ان میں سے چھ یا انہی میں سے کسی قسم دلائی جائے گی۔ کہ نہ انہوں نے خود قتل کیا ہے۔ اور نہ وہ قاتل کو جانتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ لوگ قتل کے الزام سے تو بری ہو جائیں گے۔ تاہم انہیں مقتول کے ورثہ کو دیت یعنی خون بہا دینا پڑے گا۔ اس واقعہ کے متعلق مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ قتل کے اس واقعہ کے وقت بنی اسرائیل میں قسامت کا قانون رائج تھا۔ جس کا ذکر توراۃ میں بھی موجود ہے۔ اور یہ ہماری شریعت میں بھی موجود ہے۔ بنی اسرائیل کا قانون قسامت یہ تھا کہ قاتل نامعلوم ہونے کی صورت میں وقوعہ کی قریبی بستی سے معبرین کو نکالا جائے گا۔ اور وہ لوگ بھیجا (کہے) لیں جس نے نہ صل چلایا ہو۔ بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اور بے عیب ہو۔ وہ لوگ بھیجا کو پاس بٹنے والی ندی پر پہنچا کر

اس کی گردن توڑ دیں۔ اور پھر لادھی خاندان کے کابن اس پر کچھ پڑھیں پڑھائیں۔ یہ لوگ اس ندی پر اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ اے پروردگار ہم اس خون سے بری ہیں۔ نہ ہم کو ملے ہے کہ یہ خون کس نے کیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پر حکومت بھی موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو فرمایا کہ بھائی! ایک گائے ذبح کرو تو تھائے مسئلہ کا حل نکل آئے گا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت بیت دلیل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات بن جاتی۔ مگر ان کی طبیعتوں میں تعمق تھا۔ وہ بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں سوال کرتے گئے۔ توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بیچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گزر گیا۔ اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر عمل نہ کیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تعمق اچھا نہیں ہر بات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پر عمل کرو۔ جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔ اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔ اور آخر مجبور ہو جاؤ گے۔

قاتل کی تلاش کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ایک مبارک راستہ اختیار کیا۔ کہ اس طرح گائے ذبح کرو اور پھر اس کے جسم کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر اور توروہ خود اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ انہیں بذریعہ وحی بھی قاتل کی خبر مل سکتی تھی اور وہ ان کو بتا سکتے تھے۔ اس کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اسرائیلیوں کے دماغوں میں تعمق بھرا ہوا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام براہ راست قاتل کی نشاندہی کر دیتے تو قوم بگڑ جاتی۔ حسرت موسیٰ علیہ السلام ان کی عادات کو خوب سمجھتے تھے۔ جب وہ توراۃ لے کر آئے تھے۔ تو اس وقت بھی اسرائیلیوں

کثرت سوال
سے بچو

نے سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے عہد و پیمان کو بھی توڑا۔ اور جب ان پر جبر کیا گیا کہ وہ طور ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا۔ پھر وہ راہِ راست پر آئے۔ اور تورات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

اہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی بیئیاں نبی کے علم و عمل سے عیسائی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اور بنی سے تعلق تین وجوہ سے ہوتی ہے۔ اول بے خبری یعنی امتی کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ بنی کا عمل اور عقیدہ کیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ طبیعتوں میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ امتی اصل راستے سے ہٹ جاتی تو بھی بنی سے تعلق خراب پڑ جاتا ہے۔

تیسری وجہ ماحول کا اثر ہے۔ جب لوگ معاشرے کے دیگر لوگوں سے متاثر ہو کر ان کا طریق اختیار کر لیں۔ تو پھر بھی اپنے بنی سے قطع تعلق پیدا ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں یہ یمنوں بیماریاں موجود تھیں جن کی وجہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات بات میں تھار کرتے تھے۔ حجت باذن اور حیلہ بازی کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بیماریاں آج امت محمدیہ میں بھی موجود ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَتَبْعَنَّ شَنْ مَنْ كَانَ قَبْلُكَو یعنی سے میری امت! ایک وقت آئے گا۔ جب تم بھی پہلی قوموں کی طرح ہی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے محفوظ رکھے۔ اور بنی علیہ السلام کی صحیح اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

ارشاد ہوتا ہے وَذَقَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَعْرَةً۔ اس واقعہ کو یاد کر جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ کائے ذبح کرو۔ بقرہ کا لفظ عربی زبان میں عام طور پر گائے پر بولا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اسم جنس کے طور پر بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی نر اور مادہ یا گائے اور بیل دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ گائے نہیں بلکہ بیل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے قوم کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیکر تمہارے مسئلہ کا حل فرمایا ہے۔ تم حکم کے مطابق گائے یا بیل ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگاؤ۔ تو یہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ مگر وہ ظالم قوم تعمیل حکم کی بجائے کہنے لگی۔ اے موسیٰ علیہ السلام قَالُوا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا (مذاق) کرتے ہیں۔ بھلا ایسا بھی کہی ہوا ہے کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو جائے اور اپنے قاتل کی نشاندہی کرے۔ یہ تو آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔

هٰذَا مَصَدَرٌ مِّنْ مَّفْعُولٍ بِهٖ غَطْلٰی مَعْنٰی یَرٰہُ کہ کیا تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہوا بتاتا ہے۔ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا عظیم اور صاحب کتاب نبی ہے۔ مگر قوم اس قدر بھٹی ہوئی ہے کہ معجزہ کا انکار کر رہی ہے۔ حالانکہ تھوڑا عرصہ قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر کئی ایک معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔ یہ چالیس سال تک صحرا میں سرگرداں پھرتے رہے۔ من و سلویٰ کھاتے رہے۔ پانی کے لیے بارہ چٹے جاری ہوئے۔ اس کے باوجود مزاج فاسد ہیں۔ صاف کہہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات پر سخت غصہ آیا قَالَ فَرَغْتُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰہِلِیْنَ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ اے نادانوں! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں خدا تعالیٰ کا نبی ہو کر خدا تعالیٰ کا حکم سن رہا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ مخول کر رہا ہوں۔ یہ تو جاہلوں کا کام ہے۔ اسی لیے ہماری شریعت میں ٹھٹھا حرام ہے۔ سورۃ حجرات میں آتا ہے لَا یُخْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ کوئی قوم کسی قوم سے ٹھٹھا نہ کرے۔ یہ منہی مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر ہوتی ہو۔ سمحت منع ہے۔ ہاں ایسا مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر کا پہلو نہ نکلتا ہو جائز ہے۔ تاہم اس کی زیادتی بھی مناسب نہیں۔

خوش طبعی
جائز ہے

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہو کر خوش طبعی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میں خوش طبعی کرتا ہوں۔ مگر میری خوش طبعی اور عام لوگوں کی خوش طبعی میں بنیادی طور پر فرق ہے۔ اَنْ لَا اَقُوْلَ اِلَّا حَقًّا میں حق کے بغیر کچھ نہیں کہتا۔ خواہ خوش طبعی ہی ہو۔ حدیث شریف میں موجود ہے

کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا: حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاس سواری نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کر دیں گے۔ اُس نے سمجھا کہ شاید حضور اونٹ کا کوئی چھوٹا بچہ عنایت فرمائیں گے۔ کسے لگا مگر میں اس پر سواری کیا کروں گا۔ اُس کی تو مخالفت کہہ نہ پڑے گی: نا معلوم کتنے سال بعد وہ بچہ سواری کے قابل ہو گا۔ اُس کی یہ بات سن کر حضور علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا کہ تم نے اونٹ کے بچے کو بالکل چھوٹا بچہ کیوں سمجھ لیا۔ بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں اونٹ کا وہ بچہ دوں گا۔ جو سواری کے قابل ہو گا۔

اسی طرح ایک بڑھیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ کے نبی! میرے لیے جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے ام فلاں! کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ بیچارہ پریشان ہو گئی۔ جب وہ روتی ہوئی جانے لگی۔ تو حضور علیہ السلام نے اُسے واپس بولایا اور فرمایا کہ میں نے یہ صحیح بات کی ہے۔ جنت میں بڑھی عورت نہیں جائیگی۔ بلکہ جو بھی جائے گی۔ جوانی کے عالم میں جائے گی۔ جنتی مرد اور عورتیں سب تیس پینتیس سال کے پیمانے میں ہوں گے۔ جب وہ جنت میں جائیں گے۔

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا پناہ بخدا کہ میں ٹھٹھا کر کے جاہل بن جاؤں یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ اس کا حکم سنا رہا ہوں اور تم اے ٹھٹھے پر محمول کر رہے ہو۔ اب وہ سمجھے کہ یہ تو سنجیدہ بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

الْعَمَّ

درس کی وید

البقرة

آیت ۶۸ تا ۷۳

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فافعلوا مَا تَأْمُرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفَرَاءُ فَاقِعٌ لَوثُهَا تَكُرُّ النَّظِيرَيْنِ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُكَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا لَنَنجُوَنَّ بِالْحَقِّ فَعَذَابُكُمْ مَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَلَاقِلْتُمُ نَفْسًا فَاذْرَتْكُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمُؤْتَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

۸

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے دعا کر، ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ عمر خوردہ (بڑھی) اور نہ بچیا (نوعمر) ہو۔ بلکہ اس کے درمیان میں ہو۔ پس کہ ڈالو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۸﴾ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی گائے ہے، اس کا رنگ گہرا ہے۔ جو دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ﴿۶۹﴾ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے۔ بیشک وہ نے ہم پر

مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے ﴿۵۰﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایسی کائنات ہے جو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو جوتی دیکھاؤتی ہو زمین کو اور نہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو۔ صحیح سلامت ہو۔ اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ اب آپ ٹھیک بات لائے ہیں۔ پس انہوں نے اس کائنات کو ذبح کیا۔ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے ﴿۵۱﴾ اور (اے بنی اسرائیل) اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ۔ جب تم نے ایک جان کو قتل کر ڈالا۔ اس میں تم بھڑک اٹھنے لگے۔ (ایک دوسٹر کے سر پر دھرنے لگے) اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے ﴿۵۲﴾ پس ہم نے کہا کہ مارو اس مردہ کو گلے کے بعض حصے کے ساتھ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔ اور اسی طرح وہ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔ تاکہ تم سمجھو اور غور و فکر کرو ﴿۵۳﴾

گزشتہ درس میں بنی اسرائیل کی جلد سازی کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے احکام الہی جیلے بدن سے مننے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے تعمق اختیار کیا۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ پھر جوں جوں سوالات کرتے گئے۔ تو ان کی سختیاں بڑھتی گئیں۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر گائے کو ذبح کیا۔ اور اس کا ایک ٹکڑا مردہ کے جسم کے ساتھ لگایا۔ تو وہ زندہ ہو گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ اُسے اس کے بھتیجوں نے دولت پر قبضہ کرنے کے لیے قتل کیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی مخفی بات کو ظاہر کر دیا۔

قاتل کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ مقتول چچا کی لڑکی کو حاصل کر لے گا۔ کیونکہ اس کی جائیداد کی وارث تو وہی تھی۔ نیز وہ اس لالچ میں تھا کہ مقتول کی لاش کو جس علاقے میں پھینکا گیا ہے۔ اس کی قریبی بستی کے لوگوں سے مقتول کی میت بھی وصول کر لے گا۔ یہ تمام باطل خیالات اس کے دل میں جاگزیں تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس چیز کو تم چھپاتے ہو۔ اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ چنانچہ ان کی ساری تہ بیز کام ہو گئی۔ جب وہ قتل کا یہی وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے کر گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ کھائے ذبح کرو۔ یہ سن کر پہلے تو وہ بھڑک گئے۔ کہ اے موسیٰ علیہ السلام کیا آپ ہم سے نہھا کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بنی نے کہا کہ میں ٹھٹھا نہیں کرتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جو تمہیں پسپا رہا ہوں بٹھٹھا کرنا تو

جاہوں ۵۵ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بات کو بخیرگی سے لیا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر نبی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے حکم کی فوراً تعمیل کر دیتے اور کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے، تو ان کا مکمل حل ہو جاتا۔ مگر ان کے مزاج میں فساد چھپا ہوا تھا۔ وہ سیت و صل کرنے لگے۔ چنانچہ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ خود ہی بدبندیوں میں جکڑے گئے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے رب کی بات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تلاش میں ہائی وقت لگا دیا۔ تاہم اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت یہ تھی کہ اس طریقہ سے ایک غریب آدمی کی پرورش مقصود تھی۔ روایات میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک پرہیزگار آدمی ذبیحہ ہوا اور اسے بیچ دیا۔ ایک بچہ اور ایک بچہ بچھوڑ گیا۔ اس کے مددہ اس کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ مرنے سے قبل اس شخص نے دعا کی تھی کہ مرنے کے بعد میرے بچے کے لئے اس بچھڑے میں برکت ڈال دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔

اس بچے کی نیک نیتی اور سعادت مندی کے متعلق دو روایات آتی ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ اس کا باپ سویر ہوا تھا۔ نشتے میں باہر سے کوئی آجڑا آیا۔ ہیرا فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بچے کو اتنی ہزار میں ہیرا فروخت کرنے کی پیشکش کی۔ مگر بچے نے جواب دیا کہ میں اپنے باپ کی اجازت کے بغیر تم سے سو دینیں کر سکتا۔ جب وہ اٹھ گیا تو بات کریں گے۔ تاہم بچے نے کہا کہ باپ کو جبکہ وہ میں کم قیمت پر بھی ہیرا بیچ دوں گا۔ مگر لڑکا باپ کے آرام میں مغل ہونے پر رضا مند نہ ہوا۔ تاہم کم سے کم قیمت لینے پر بھی تیار ہوا۔ مگر لڑکے نے کہا کہ میں سنی ہزار کی بجائے ایک لاکھ روپیہ دینا پسند کروں گا۔ مگر باپ کو بے آرام نہیں کر دینا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس لڑکے کی نیش کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اسے برکت سے نوازا۔

بعثت دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ان فی شعل میں سے بچے کے پاس

۱۔ تفسیر درمنثور ج ۱، تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱، ۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱

۴۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱، ۶۔ معالم التنزیل ص ۲۲

آیا اور پھر اس کی قیمت دریافت کی۔ اور پھر دو دینار کی پیش کش بھی کر دی۔ لڑکے نے کہا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھنے بغیر قیمت طے نہیں کروں گا۔ جب والدہ سے دریافت کیا تو وہ اتنی قیمت پر رضا مند نہ ہوئی۔ فرشتے نے زیادہ قیمت لگا دی۔ پتہ نہ پھر کیا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ مگر والدہ نے پھر انسہ کر دیا۔ مائیں! فرشتہ قیمت بڑھا کر بارہ اور لڑکا بارہ والدہ سے مشورہ کرتا رہا۔ مگر والدہ کسی قیمت پر کبھی کچھ ایسا کہنے پر راضی نہ ہوئی۔ لہذا بچے نے باب کو صفا جواب دیدیا۔ اب فرشتے نے کہا کہ تم بڑے سواد مند بیٹے ہو جو اپنی والدہ کی بات کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔ تو سنو! میں نیکوئی کو عزیز نہ رکھتا ہوں۔ اس لئے تمہارے پاس لوگ آئیں گے جو تمہاری قیمت پر کچھ اضافہ دہشت نہ کرنا یہ تمہیں مالدار کر دے گا۔

ادھر بنی اسرائیل کو ایسے پھڑکے کی تلاش ہوئی جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ نشانوں پر پورا تھے پھرتے پھرتے انہیں بنی کچھرا مل گیا جس میں بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ جب انہوں نے قیمت چٹانا چاہی۔ نو سو درہم بن سہ۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آکر بتایا کہ غلو بہ کچھرا قبول کیا ہے۔ مگر اس کا ملک من سب قیمت پر نیتنے کو تیار نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کو بد بھیجا۔ اور پھر انہیں نے دھرم دریافت کی۔ اس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ ہی بتائیں۔ جب کہ میں اس کا ملک ہوں کیا میں اپنی مرضی کے مطابق اس کو تصرف میں لے لے گا مجاز نہیں ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بیشک تجھے اپنی مرضی کے مطابق تصرف کی اجازت ہے۔ تو اس نے کہا کہ میں اس پھڑکے کے بہتے اس کا ہم وزن سونا لوں گا۔ اس سے کم قیمت پر رضی نہیں ہوتا۔ بعض دوسری روایتوں میں آتے ہیں کہ اس نے پھڑکے کی عہد قیمت سے دس گنا زیادہ قیمت طلب کی۔ تاہم ہم وزن سونے والی روایت زیادہ مشہور ہے چنانچہ بنی اسرائیل نے وہ پھڑکا اس کے وزن کے برابر سونا دے کر حاصل کیا۔ اور پھر اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وزن کیا۔

الغرض! بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فوری طور پر کوئی ہاتھ نہ بچھا لے کر ہاتھ کی نشانیں

ذبح نہ کیا۔ بلکہ اس کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سوال و جواب کی تفصیل بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ تو کہنے لگے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں تفصیل سے بتائے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ کیسی ہو۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے۔ إِنَّهَا بَقَرَةٌ كَذَّابِرَةٌ وَذَاتِ بُكْرَةٍ وہ گائے نہ تو بڑھئی ہے۔ اور نہ نوجوان عوانِ بکینِ ذلک دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ فَاعْمَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ پس کر ڈالو جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ بمقتضیٰ یہ تھا کہ اب بھی زیادہ سوال و جواب کے چکر میں نہ پڑو۔ بلکہ درمیانِ عمر کی کوئی گھنٹے کر ذبح کر دو یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی فوری تعمیل ہونی چاہیے۔ مگر وہ بد بخت قوم پھر بھی تعمیل حکم پر آمادہ نہ ہوئی۔ بلکہ دوسرا سوال کر دیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یعنی اے موسیٰ علیہ السلام ہمیں اپنے رب سے یہ پوچھ دیں يُبَيِّنْ لَنَا وہ ہمیں واضح طور پر بتائے مَا كُونَتْ کہ اس گائے کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے انہیں بتایا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ كُونَهَا وہ گائے زرد رنگ کی صفت ہے۔ کہ وہ زرد بھی ہو اور گہرا بھی ہو۔ یہ رنگوں کے مختلف نام ہیں۔ اور پھر آگے ان کی صفات ہیں۔ سفید رنگ کو بیض اور سرخ کو احمر کہتے ہیں تو اس گائے کے رنگ کے متعلق فرمایا کہ وہ گہرا زرد ہو۔ تَكُونُ النُّظُرُ جو لوگوں کو دل بھانے والا ہو۔ جسے دیکھ کر لوگ خوش ہو جائیں۔

بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں تعمق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے قیصر سوال کر دیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کریں يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ إِنَّ الْبَقَرَ كُتِبَ عَلَيْهِ بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے۔ یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نشانیاں نہیں جان سکے۔ اگر ہمیں اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے وَأَنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ تو بے شک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم راہِ راست پائیں گے۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے مطالبہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا گویا یہ آخری بات تھی جو انہوں نے دریافت کی۔ عام قانون بھی ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَا

فغول رسومات میں کیا ہو : ہے۔ جوں جوں لوگ بُدی رکھیں اپنے اُپر عاید کہے ہیں۔ ان میں جڑے جا ہے ہیں۔ نہ غذا راضی اور نہ اُس کا رسول راضی اور نہ خود ہی راضی رہ سکتے ہیں۔ یہی جمیز کی رقم کو لے لیں۔ اس نے کس حد تک طول پڑا ہے۔ فلاں چیز چاہیے۔ فلاں چیز چاہیے۔ لڑکے والے خود مطالبہ کرتے ہیں۔ کبھی ٹیوٹن کی ذہن نشی کبھی یفریجیٹر چاہتے۔ کبھی کوٹھی اور کار کا مطالبہ۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ ایک ایک کر کے اشیاء میں اضافہ ہوا گیا۔ حتیٰ کہ ایک آدمی کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ یہ سب اپنی ہی عام کردہ پابندیوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مہنو دیکھے۔

واقول

فَمَا وَادَّ قَتَلْتُمْ فَفَنَّا فَاذَرْتُمْ فَمَا جَبْتُمْ لَكُمْ قَتْلَ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَوَافَاةً ذَنْبِكُمْ كَمَا كُنْتُمْ تَقْتُلُونَ
یہ واقعہ بھی میں نے عرض کر دیا ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے ایک دو تئمند علیل نامی آدمی کو اس کے جیتوں نے مال و دولت اور اس کی مٹی کے حصول کی خاطر قتل کر دیا۔ اور پھر خوردیت وصول کرنے کے لیے قریبی سب کے لوگوں پر قاتل مت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمام ظاہر اور مخفی چیزوں کو جانتا ہے۔ اُس پروردگار نے ان کا زندقہ آش کر دیا اور یہ طریقہ بتایا کہ گائے ذبح کر کے اس کے جسم کا ایک حصہ غصتوں کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کو زندہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسی چیز کو بیان فرما رہے ہیں۔ کہ تم تو حقیقت کو چھپاتے تھے۔
وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ مگر اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ اس چیز کو جو تم چھپاتے ہو۔

مگر زندان اور زمین کی بظلمہ دستہ اور قتل و غارت ہر زمانے میں معموں رہا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ مگر یہ چیز ہر خوشہ نشین و زباز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کہ وہ کسی کو کس طرح معاف کرتا ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی عقلوں والے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی سمیع اٹھاتے ہیں مگر یہ تم حق آدمی زور و جبر سے کمیل رہا ہوتا ہے۔ یہ تو منشاء یزدنی ہے کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔

اجبتہ موتی
بطور مجاہد

الغرض! قاتل کا پتا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا

فَقُلْتُ ضَرْبُؤُذُ بَعْضِهَا یعنی گائے کے گوشت کا ایک حصہ جس مسئلہ کی روش پر مردہ اسہ
قیمتہ۔ ہوم گڈلٹ دُجی لکھ نعتی اس طریق سے اللہ تعالیٰ اُس مُدے کو زندہ کرے گا۔
اور وہ قیدیں بنائے گا کہ اُس کے قتل کون ہیں۔ چنانچہ یہاں ہی ہوا۔ اور مردہ زندہ ہو گیا۔

اس چیز میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ گائے کا کون سا حصہ تھا جو مردہ بنا گیا۔ بعض روایات

میں ذمہ آتے۔ بعض میں قلب اور بعض میں زبان بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا حکم
تھا۔ اور مجراۃ طور پر یہاں ہوا تھا۔ گائے کے گوشت میں ایسی کوئی تاثیر نہیں تھی جس سے مردہ زندہ ہو
جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو قصاب ہزاروں جانوروں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ وہ تو قدامت سے زندہ کر لیں۔

اصل میں وہ تو خدا تعالیٰ کا حکم تھا کہ اس طریق سے مردہ زندہ ہو کر ان کی پوشیدہ بات کو ظاہر کرے گا۔

ایمانے موتی بالکل اسی طرح کا معجزہ تھا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تہ ہوا فَقُلْتُ

اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ۔ اور اس تہ پر پانی لڑھی مار دو تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ لایا

ہمارے پاس بھی ہیں۔ اور پتھر جی بے شمار ہیں۔ مگر پانی نہیں نکلتا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے

پانی میں مارنے کا حکم دیا۔ تو بارہ راستے بن گئے۔ یہ سب قیامت تھے۔

بہر حال گائے کا ایک حصہ مُدے کو جانے سے معجزہ ہو گا۔ مردہ زندہ ہو کر میچو گیا۔ اس سے

پوچھا کہ تمہیں کس نے قتل کیا تھا۔ تو اس نے صاف بتا دیا کہ اُس کے قتل اُس کے بھتیجے ہیں اور

یہ راز مجمع عام میں کھلا۔ لوگوں کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مردہ پھر اپنی مردہ حالت میں

تبدیل ہو گیا۔ اس واقعوں پر کسبتی پیدا ہوتا ہے کہ جو ایک ملک اپنے حمہ سے ایک مردہ کو زندہ کر

سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز تمام مردوں کو قبروں سے زندہ نکالتے پر جی قدر ہے اور اس قسم

کے واقعات کا مشاہدہ اس لیے کر دیا جاتا ہے۔ وَبَرِئْتُكُمْ اَيْتَادُ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں

اپنی نشانیاں دکھائے جس سے تم عبرت حاصل کرو۔ لَعَنَكُمْ لَقَعْلُوْنَ کہ تم غور و فکر کر سکو۔

اللہ تعالیٰ کی ان آیات کے پیش نظر اپنے امانت کی راہ متعین کر سکو۔

قتل شد
سے پہلے

مجتہدوں نے چچا کو اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ اس کی وراثت میں اس کا مال حاصل کرنا چاہتے

تھے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قاتل نہ صرف وراثت سے محروم ہو گئے۔ بلکہ انہیں مقتول کی ویت ادا کرنا پڑی۔

ہماری شریعت میں بھی قاتل وراثت سے محروم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
الْقَاتِلُ لَا يَرِثُ قَاتِلُ وَرَثَتِ كَاخْتَارَ نَفْسٍ بَوَاتَا۔ اُس نے جرم ہی ایسا بڑا کیا ہے کہ وہ اپنے
 جائز حصے سے بھی محروم ہو گیا۔ اہم مالک کا مسلک یہ ہے کہ اگر قاتل عمدہ کیا ہو تو قاتل مقتول کی وراثت
 سے محروم ہو گا۔ اور اگر خطا قتل ہوا ہے۔ تو وراثت کا حقدار ہے۔ باقی ائمہ اس بات کے قائل
 ہیں کہ قاتل خواہ عمدہ ہو یا غلطی سے۔ ہر حالت میں قاتل اپنے مقتول وراثت کی حالت سے محروم ہو
 جائے گا۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلم کا اور غیر مسلم مسلمان کا وراثت نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
 فرمان ہے۔ لَا يَرِثُ الْمُصْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُصْلِمَ شَرًّا أَوْ بَرًّا۔ اگر مٹا مرزائی ہو
 جائے۔ تو وہ مسلمان باپ کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر باپ مذہب تبدیل کر
 لے۔ تو وہ بیٹے کی وراثت سے حصہ نہیں پائے گا۔

ثُمَّ قَتَ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فِي الْخَارَةِ أَوْ أَشَدُّ
قَسْوَةً فَإِنَّ مِنَ الْخَارَةِ لَمَّا تَنْفَجَرُ مِنْهُ إِلَّا نَهْرٌ وَإِنَّ مِنْهَا
لَمَّا يَشْقُوقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَنْهِيكَ مِنْ
خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے
بھی زیادہ سخت ہیں اور بیشک بعض پتھروں میں سے بہتہ وہ ہیں کہ جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بیشک
ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے، ان سے پانی نکلتا ہے اور بیشک ان پتھروں میں
سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان

کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو ﴿۷۴﴾

بنی اسرائیل کی بہت سی برائیوں کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا ہے۔ اور بعض کا ذکر آگے
بھی آئے گا۔ آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام تر برائیوں کا نتیجہ بیان فرمایا ہے بنی اسرائیل
کی طرف سے کتمان حق، کچھڑے کی پرستش، قانون کی خلاف ورزی، قتل انبیاء علیہم السلام وغیرہ
یہ تمام ایسی بیماریاں تھیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے۔ سورۃ مائدہ میں
بنی اسرائیل کی قنوت قبیحہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ
لَعَنَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُعْنِي بَنِي إِسْرَءِيلَ كَالْعَصَدِ وَبَيَانِ تَوَلُّوهُ كَالْوَجْهِ
سے ہم نے ان پر لعنت بھیجی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس
قسم کے کام کرتے تھے کہ یُحْدِثُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوْصِعَةٍ اللہ تعالیٰ کے کلام کو
اپنے مقام سے تبدیل کر دیتے۔ گویا آسمانی کتاب میں تحریر کے مرتب ہوتے تھے جس کی وجہ
سے قنوت قبیحہ لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بلکہ ان کے فہم بھی اکٹھا گئے۔ ان میں ضعف ہمت
کی بیماری بھی پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ جہاد کے لیے بھی آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ کہنے لگے کہ

الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ فَهُوَ سَاجِدٌ یعنی جن حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ ان میں حالت سجدہ سب سے اولیٰ ہے، اس حالت میں جس قدر عجز و انکاری ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، اسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی اتصال کی بدولت انسان کی حالت درست رہ سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جو شخص پتھروں جیسے اوصاف کا حامل بھی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو اس سے مخلوق کو عام فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ وہ شخص محدود پیمانہ پر مفید ہے۔ اور نہ ہی اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہے۔ تو پھر ایسا انسان بلاشبہ بد بخت لاشعری ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انہیں قدرتِ خداوندی کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ بلکہ جو ان کے ساتھ چلنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس نعمت کے محروم نہیں رہتے اور پھر ان کی وجہ سے بڑی بڑی باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

ہمارے بعض ایسے اکابر قریبی زمانہ میں ہوئے ہیں جو یقیناً مقربینِ الہی میں سے ہیں یہ خلیفہ بریلویؒ سادات کے خاندان میں سے حسنی تھے۔ وطن مالوٹ کجریلی تھا۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی اور علم حاصل کیا۔ شاہ صاحبؒ نے مزید تربیت کے لیے اپنے برادر بخورد شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے تین سال تک سید احمد شہید بریلویؒ کی تربیت کی۔ یہ وہی شاہ عبدالقادرؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ صاحب کشف بزرگ تھے ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی عیسق نظروں نے جانچ لیا کہ سید احمد شہید بریلویؒ عظیم صلاحیت کے مالک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے بہت اہم کام لیتا ہے۔ چنانچہ تین سالہ تربیت مکمل کر لیتے کے بعد شاہ صاحبؒ نے سید احمد شہید کو لونگ جاکر فوجی تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا۔ لہذا آپ نے چھ سال تک فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ گویا سید احمد شہیدؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ اور ان کے مجاز تھے۔

خود شاہ عبدالعزیزؒ برصغیر میں اپنے باپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپ محدث اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کے داماد مولانا عبدالحیؒ بھی بڑے پائے

بعض اکابر
دین

کے بزرگ تھے۔ آپ سید صاحب سے زیادہ عالم تھے۔

شاہ اسماعیل شہید، شاہ عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے تھے قرآن پاک کے علاوہ تفسیر و تراجم حدیث زبانِ یاد تھیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے اور سورج نکلنے تک ختم کر لیتے۔ ادھر عصر کے بعد شروع کرتے تو مغرب کی اذان کے ساتھ ختم کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر انعام فرمایا تھا۔

ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں شیخ عبدالغنی محدث کا وہ سالہ آگیا جس میں نماز کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کے مطابق ہی نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ رات کے وقت دو رکعت ایسی نماز پڑھنے کی توفیق میسر آجائے جس کے دوران کوئی دوسرا نہ آئے، ایسی کوشش میں رات بھر میں سو رکعت نماز ادا کی، مگر مقصد حاصل نہ ہوا۔ اس بات کا ذکر آپ نے سید احمد شہید بریلوی سے کیا کہ شیخ عبدالغنی محدث کے رسالہ میں مذکور طریقے سے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ محض کتاب میں طریقہ پڑھ کر مقصد حاصل نہیں ہوگا، آؤ میرے ساتھ دو رکعت نماز ادا کر لو۔ چنانچہ جب سید صاحب کی اقتدار میں نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور قلب عطا کیا، اور مطلوبہ کیفیت حاصل ہو گئی، اس واقعہ کا ذکر آپ نے حضرت مولانا عبدالحی کے پاس بھی کیا کہ حضور قلب کے لیے انہوں نے کتنی کوشش کی مگر یہ چیز سید احمد شہید کے ساتھ نماز پڑھنے سے حاصل ہوئی، یہ سن کر مولانا عبدالحیؒ کو بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ سید صاحب سے عرض کیا تو انہوں نے انہیں بھی اپنے پیچھے نماز پڑھائی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی وہی کیفیت عطا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں صاحبان یعنی شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحیؒ ہمیشہ سید احمد بریلوی کے ہمراہ رہے۔ شاہ اسماعیلؒ کو تو اللہ تعالیٰ نے شہادت کا مرتبہ عطا کیا، مگر مولانا عبدالحیؒ کی سفر کے دوران سرحد کے علاقہ پنج تار میں جا کر بیمار ہوئے اور وہیں پر اعلیٰ بل بیکٹا ہاؤس کی تاریکی میں شاہ اسماعیل شہید فوج کے ساتھ تھے اور مولانا عبدالحیؒ سید احمد شہید کے لشکر میں عہدہ قضا پر فائز تھے، اس اسلامی فوج کے امیر سید احمد شہید بریلویؒ تھے، سرحد میں ان کی قائم کردہ اسلامی حکومت تین سال تک چلی، اس کے بعد مسلمانوں کی تالافتی کی وجہ سے آگے نہ چل سکی، اسی دوران مولانا عبدالحیؒ بیمار ہوئے جب ان کی زندگی کی ٹیمہ باقی نہ رہی تو سید صاحب

نے پوچھا کوئی خواہش ہو تو بتائیں کہنے لگے خواہش تو شہادت کی موت کی تھی۔ جو پورنی نہیں ہوئی۔ اب چاہتا ہوں کہ اس آخری وقت میں آپ کا قدم میرے سینے پر ہو۔ یہ صاحب نے ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اور آپ نے اس کے بعد اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

مسلمانوں کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کی اپنی نڈرتی ہے۔ یہ خدایٰ ابن عقیلی کے دور کے بعد ساتویں صدی میں شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ اور مسلمان مدبر زوال ہی میں پھر یہ اپنے قدموں پر بہہ نہ سکے۔

تو بہر حال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا اتصال نصیب ہوتا ہے۔ جتنا معزوں میں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں پتھروں والی تین سخت جہی نہیں پائی جاتی وہ بہ بخت اور شرفی ہوتے ہیں۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت بنی اسرائیل کی مثال واضح ہے۔ یہ پتھروں سے بھی گئے گئے ہیں۔ ان کا وجود غیر مخفیہ مگر بنو انسان کے لیے مفید ہے گویا یہ سارے اسرائیلیوں کی خرابیوں کا ذکر ہے۔

فَرَمَا وَصَّا اللّٰهُ بِفِذْ عَمَّا قَعْمَلُوْنَ يَا دُرْ كُھُو اللّٰہ تعالیٰ تمہارے کسی فعل غافل نہیں ہے۔ تمہاری تمام برتوتیں اس کی ناکام ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے۔ جب اللہ جل شانہ تمہارے اعمال کا انجام تمہارے سامنے رکھ دے گا۔ یہ سارا بنی اسرائیل کو خطا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہ راست پر آ جاؤ۔ تو اچھے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ ورنہ تم اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

فَقَطَّعُوا نَافِثَةً يَوْمَئِذٍ وَقَدْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ۖ
 كَذَّبَ الَّذِينَ تَلَاؤُهُمْ مِنْ بَيْنِ مَا عَقِلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ
 ⑤ وَرَدَّ لَوْحًا لَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِعَضُدٍ إِلَى
 بَعْضٍ قَالُوا اتَّخَذُوا آلَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ
 عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ⑥ أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
 مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ⑦ وَمِنْهُمْ أَقْسَامٌ لَا يَعْلَمُونَ
 الْكِتَابَ إِلَّا مَا فِيهِ مِنْهُمْ لَا يُحِيطُونَ ⑧ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ
 الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشَارَكُوا
 بِهِ ثَمَّ قَلِيلٌ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ
 وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْبُتُونَ ⑨

ترجمہ: (اے اہل ایمان کیا تم توقع رکھتے ہو کہ (اہل کتاب) ایمان لائیں گے تمہاری
 بات پر حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سننے سے بچتا تھا۔ پھر اس کو
 بدل ڈالتے تھے۔ بعد اس کے کہ انہوں نے اسے سمجھ لیا تھا۔ اور وہ جانتے بھی ہیں
 ⑤ اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب
 انہیں ہوتے ہیں، ان میں سے بعض، بعض کے پاس، تو کہتے ہیں، کیا تم ان (مکملوں)
 کے پاس ایسی چیزیں بیان کرتے ہو۔ جو اللہ نے تم پر ظاہر کی ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے
 تمہارے ساتھ تمہارے رب کے ہاں تمہارا کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ ⑥ کیا یہ
 لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو یہ چھپاتے ہیں
 اور جس کو ظاہر کرتے ہیں ⑦ اور ان میں سے بعض ان پر عمل نہیں کرتے جو انہیں جانتے
 کتاب کو سچا نہیں مانتے اور انہیں میں وہ مٹا دیا کرتے ⑧ پس ہلاکت

ایسے لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں کہ کتاب کو اپنے ہاتھوں سے پھر کتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تاکہ خریدیں اس کے ذریعے عظیم قیمت۔ پس ہلاکت ہے ان کے لیے جو سمجھتے ہیں۔ ان

کے ہاتھوں نے۔ اور ہلاکت ہے ان کے لیے جو کہتا ہے۔ انہوں نے ﴿۹۹﴾

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی بہت سی باتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہت سی نشانیاں دیکھنے کے بعد بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ منہ دیا بعض پتھر بھی مضمیہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ قوم تو ان پتھروں سے بھی بدتر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے غافل ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ ان کے سب کام اس کے علم میں ہیں۔ آیات زیر درس میں بھی یہودیوں کی بعض دوسری خرابیوں کا ذکر ہے۔ مگر یہاں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔

ربط آیات

ارشاد ہوتا ہے اَفْطَمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ یعنی اے اہل ایمان! کیا تم توقع

یہود کی طرف سے
نا اُمیدی

کرتے ہو کہ یہود منہ سے کہنے پر ایمان سے آئیں گے فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ بڑی بد بخت قوم ہے۔ یہ تمہاری بات کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے۔ یہ لوگ دین اسلام کو قبول کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ بات سمجھادی کہ گمان مت کرو یہ تمہارے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ کیونکہ شرکت دو وجوہ کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یا تو کوئی شخص دوسرے کا معتاد بن کر ساتھ چلے یا اس کا تابع ہو جائے۔ جب تک ان دونوں سے کوئی ایک چیز شامل نہ ہو۔ بل کر چنا محال ہوتا ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہودیوں میں نہ معتاد بننے کی اہلیت ہے اور نہ تابع بننے کی صلاحیت یہ لوگ معتاد اس لیے نہیں بن سکتے کہ ان کی فحوا خراب ہو چکی ہے ذہنیت بگڑ چکی ہے۔ ان کا دین تبدیل ہو چکا ہے اسی طرح تابع وہ شخص ہو سکتا ہے جو منصف مزاج اور بے لوث ہو۔ مگر یہودی ان تمام ملاصحتوں سے محروم ہیں۔ اس لیے ان کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اے ایمان والو! تم ان کے پیچھے نہ پڑو۔ بلکہ ان کو وہ راست پر لانے کی اگر کوئی امید تمہارے دل میں ابھی تک موجود ہے۔ تو اسے منقطع کر دو۔ یہ لوگ انتہائی درجے کے متعصب، ضدی اور غندی ہیں۔ جیلہ ساز اور فریب دہندہ لوگ ہیں۔ دنیا کی خاطر دین کو بھٹو دینا ان کا کام مشغلہ ہے۔ لہذا ان سے کسی بھی عہدنی کی توقع نہ رکھو۔

ایہاں میں تحریر

فرمایا ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ اُنْ
میں سے بعض لوگ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ ثُمَّ يُخَرِّفُونَهُ مِنۡ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ
پھر اُسے سمجھنے کے باوجود بدل دیتے تھے۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرتوت
کر رہے ہیں۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں بیان بوجھ کر تحریف کرتے تھے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر تحریف سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مراد
ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سرآرمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے تھے۔
تاکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیں۔ کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا
کی۔ مگر ان لوگوں نے تحریف یہ کی کہ کسا بیشک یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ مگر اس کے
حکام پر سختی سے عمل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ کسا ہے کہ جب قدر آسانی سے عمل ہو سکے کرینا۔ باقی
کو چھوڑ دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سرآرمیوں کو بجلی کے ذریعے خاکستر کر دیا تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام
کی دعا سے انہیں پھر زندگی عطا کی۔ مقصد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں نے دیدہ و دانستہ تحریف
کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کے اہل کتاب خصوصاً یہودی کی تحریف کی بھی
واضح مثالیں موجود ہیں۔ آگے آئے گا کہ یہودی کا دھیرہ یہ تھا کہ لَعَلَّ الْخَلْقَ دَہ جانتے
تھے کہ نبی آخر الزمان کا دین سچا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو پیشین گوئیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے متعلق توراۃ میں بیان کی ہیں۔ وہ سب کی سب آپ پر پورا اترتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگوں
کو صحیح بات بتانے کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کردہ
نشانیوں کو چھپاتے تھے۔ اور لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر آپ پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔
سورۃ مائدہ میں آئے گا کہ ان لوگوں نے توراۃ کے احکام میں بھی تحریف کی۔ توراۃ میں
رجم کا حکم موجود تھا کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے۔ مگر یہودیوں نے یہ حکم چھپایا۔ توراۃ میں
حضور علیہ السلام کا علیہ مبارکہ موجود تھا کہ آپ خوش شکل ہوں گے۔ آپ کے بال گھنجدی لے اور

آنکھیں سیاہ ہوں گی۔ قدرِ میانہ اور رنگِ گندمی ہو گا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے۔ اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرما دیا۔ تو یہودیوں نے توراۃ میں آپ کے بیان کردہ عیسے کو بدل دیا۔ اور لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ بنی آخر الزمان (علیہ السلام) نبی قلمی ہوں گے آپ کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور بالِ سیدھے ہوں گے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کو آپ پر ایمان لانے سے روکنے کی کوشش کی۔

یہودی بددھرمی

الغرض! اہل ایمان کو کھجایا جا رہا ہے کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔ یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ راہِ راست سے دور ہی رہیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں۔ اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کر لیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ سب ایمان لے آئیں گے۔ مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے حضور علیہ السلام کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ آپ ارشاد ہے کہ نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ جتنی کہ جب مسیح علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں، تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔

یہود کے ساتھ
موافقت اور
ان کی مخالفت

ابتداءً زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ساتھ موافقت کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ انہیں ترغیب ہو۔ اور یہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس قسم کے احکام ملتے ہیں آگے دیکھیں بارے میں قرآن پاک میں بھی آئے ہیں کہ بیت المقدس کی طرف منکر کے نماز پڑھنے کا حکم یہودیوں کی ترغیب کے لیے ہی تھا۔ خود حضور علیہ السلام نے سر کے بالوں کے بنانے میں اہل کتاب کا طریقہ اختیار کیا۔ اُس زمانے میں منکر کین سر میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ مگر یہود مانگ نہیں نکالتے تھے۔ بلکہ ویسے ہی بالوں کو پیچھے کی طرف ڈال دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے موافقت کی خاطر ان کا طریقہ اپنایا۔ لہذا آپ مانگ نہیں نکالا کرتے تھے۔

یہودی سخت متعصب تھے۔ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لہذا بعد میں آپ نے ماہگ نہان شروع کر دیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ کسی طرح راہِ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے بعد آپ نے دوسرے طریقے اختیار فرمایا۔ اور انشاء اللہ میں اہل کتاب کی مخالفت شروع کر دی۔ چنانچہ ایسے کسی ایک مسئلے میں جن میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی مخالفت کا حکم ہے۔ یہود محرم الخام کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ان کی مخالفت کرو اور دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھا کرو۔ اسی طرح یہود حیض والی عورت کو گھر میں نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ علیحدہ کر دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا تم عورت کو ہر حالت میں اپنے گھر میں رکھو۔ فرمایا حیض والی عورت گھر کے سامنے کام انجام دے سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ مباشرت جائز نہیں۔ میاں بیوی اکٹھے لیٹ سکتے ہیں ایک برتن میں کھانا کھا سکتے ہیں تاہم مباشرت نہیں کر سکتے۔

اہل کتاب بالوں کو زخا ناجائز سمجھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے اس کام کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ ان سے مخالفت کی بنا پر تھا۔ اسی طرح یہود تہ بند نہیں باندھتے تھے۔ آپ نے شلوار پہننے اور تہ باندھنے کا حکم دیا۔ مقصد یہ کہ شروع شروع میں مدینہ کے یہودیوں کی خاطر ان کی موافقت میں بعض امور انجام دیے۔ مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بڑے منہدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ تو آپ نے ان کے بعض امور کی مخالفت کا حکم دیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اسی بات کو بیان فرماتے ہیں۔ کہ اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے کسی موافقت کی امید نہ رکھو۔ بلکہ تو سخت عناد ہی لوگ ہیں۔ یہ کبھی تمہاری بات ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کا و طیرہ تو یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد اس پر عمل نہ کیا۔ بلکہ اس میں تحریف شروع کر دی۔

اہل کتاب میں سے تو ایک گروہ ایسا تھا۔ جو علامہ زہریؒ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ رکھتا تھا۔ منصفین کی چالاکیاں اور آپ کی مخالفت کرتا تھا۔ البتہ ایک مختصر گروہ ایسا بھی تھا۔ جو بظاہر تو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر پردہ پر وہ ان کی ہمہ دیاں یہودیوں کے ساتھ تھیں۔ غرض آیت میں ایسے ہی لوگوں کی دوہلی

کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَإِذْ الْقَوَّالُ الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِمَعْنَى
لوگ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاپکے ہیں وَإِذَا خَلَا بِبَعْضِهِمْ غُرَابًا
بَعْضُ اور جب یہ الگ ہوتے ہیں اہل ایمان کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ تو قَالُوا
أَتُخَدِّثُكُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ کہتے ہیں کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بتاتے ہو۔ جو
 اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ لِيُخَاجِبُكُمْ بِذِكْرِ آلِ إِبْرَاهِيمَ
 اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات میں تمہارے ساتھ مجھ کو داکریں گے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو
 تورات کے احکام سے کیوں الگ کرتے ہو۔ جن میں محابہ کہ نبی آخر الزمان کی یہ نشانیاں ہیں۔ اور
 یہ کہ تورات قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسی باتیں اہل ایمان کو نہ بتاؤ۔ یہ آخرت
 میں اسی سے تمہارے خلاف دلیل قائم کریں گے۔ کہتے تھے کہ یہ ایسی گہری بات ہے۔ جو
 ہم سے خلاف جاتی ہے أَفَلَا تَعْقِلُونَ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی تمہیں اس نکتہ کی کیوں سمجھ نہیں
 آتی کہ یہ چیزیں ہمارے حق میں نہیں ہیں۔

اہل کتاب کی ان تمام تر چالاکیوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے کہ ان کی ہوشیاری کسی کام
 نہیں آئے گی۔ أُولَٰئِكَ يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُكَرِّهُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ کیا یہ نہیں جانتے
 کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہر اس بات کو جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے
 تھے کہ منافقت کا یہ چکر چلا کر وہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے ساتھ تعلقات برقرار
 رکھ سکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ جو بے ایمانی کر رہے
 ہیں۔ احکام کی غلط تائیدیں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ان کی کوئی چال کامیاب
 نہیں ہوگی۔

یہودیوں کی
 موبوم آرزوئیں

فرمایا تمہاری فکر اور منافقت۔ تو عام لوگوں کی بیماریاں تھیں۔ یعنی یہ خصائل ان لوگوں کے
 تھے۔ جو حق پرست علم رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے وَمِنْهُمْ أَقْسَىٰ
لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ جو بالکل ان پر صحت نہیں کتاب کا بالکل علم نہیں تھا۔ فرمایا ایسے
 لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے اَلَا مَعَالِي سَوَآءٍ چند خود ساختہ آرزوؤں کے جن کا
 ذکر آئے بیٹا یعنی پرستش صرف یہودیوں کے لئے وقف ہے۔ یا یہ کہ سخت براہیم علیہ السلام

دوزخ کے دروازے پر پھرتے ہوں گے، اور قیامت کے دن کسی یودنی کو جس نے ختنہ کی ہوگی اس میں نہیں گرنے دیں گے۔ یا اگر بنی اسرائیل دوزخ میں پہلے جی گئے تو محمدؐ سے سنتِ اِیْم کے لیے جتنے دن ان کے آباؤ اجداد نے پچھڑے کی پوجا کی تھی، اس کے بعد پھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے جابل اور ان پر اس قسم کی آزمائشیں لیے بیٹے تھے، بعد ان کا عقیدہ یہاں تک تھا کہ عربوں کا دل منجمد کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ سود کو بدل کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کئے تھے شریعت کو جائز قرار دیتے تھے وَأَن فَعَمَّ الزَّالِظُونَ اور زمین پر گروہ کا حق کرتے۔

تورہ میں
تحریریت

تحریریت فی الکتاب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس جرم کی بنا پر فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ هُوَ بَلَاكٌ لَهُمْ۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب یعنی تورہ چھپاتے ہیں ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ گویا اپنی تحریر کو اللہ تعالیٰ کی تحریر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس قدر ظالم لوگ ہیں۔ اور یہ تحریر اس لیے کرتے ہیں لِيَشْهَدُوا بِهِ لَمَّا قِيلَ مَا كَرِهْتُمْ اس کے ذریعے حقیر سامعاً و صاعداً کہیں۔ مثلاً جب کسی زانی کو رجم کی سزا دی جائے، مقتود ہو تو کہہ دیتے تھے کہ تورہ کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کا منہ کالا کرو اور گودے پر سوار کر کے شہر بھر دو یا زیادہ سے زیادہ کوئی جہاز نہ کر دو۔ اس طرح زانی کی جان بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی بے شمار من گھڑت مسائل تھے جنہیں تورہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ تحریریت کی دونوں صورتیں ان میں پائی جاتی تھیں۔ یا تو الفاظ ہی بدل دیتے تھے جیسا کہ بیان ہوا۔ یا پھر الفاظ تو نہیں بدلتے تھے۔ بلکہ ان کی تاویل غلط کر کے اپنا مقصد پورا کر لیتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی یہ قباحت بھی بیان کر دی کہ وہ کتاب الہی میں تحریریت جیسی قبیح حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔

تحریریت کا دائرہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں انصاف کی نظر سے دیکھیں گے۔ تو پتا چلے گا کہ اکثریت کے عقیدے خراب ہو چکے ہیں۔ کتنے خود ساختہ اور جھوٹے عقیدے ہیں جنہیں آج کل کے نام نہاد علماء قرآن و سنت کی حجت منسوب کرتے ہیں۔ یہ تحریریت فی الکتاب و سنت نہیں تو اور کیا ہے آج کے داعیِ قبر پرستی، رسوماتِ نارہ و دگر

ہمات سے متعلق کتنی بناوٹی حدیثیں لوگوں کو سناتے ہیں۔ یہ بالکل بیوریوں کا طریقہ ہے۔ جو سمجھانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ اس دور میں نیکی کا دو معیار کہاں رو گیا ہے۔ جو کتاب اللہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اقوال صحابہ کا تھا۔ اصل دین کہاں چلا گیا۔ دور حاضر میں دین چند رسومات اور چھوٹے سختہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن و سنت کی طرف کون رجوع کرتا ہے۔ نئے نئے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور نہ عمل کرنے کی، شرک و بدعت پر دین کا دار و مدار ہے۔ اس کی تبلیغ کرنے والے دو لوگ ہیں۔ جو چھوٹے قصے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہی چیزیں لغتوں میں ہیں اور غزلوں میں ہیں اور انہیں پر عمل پورہ ہے۔ بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آج چند رسوم کو دین کا نام لے دیا گیا ہے۔ اور لوگ حقیقت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ دین کو سمجھنے والے لوگ بالکل قلیل تعداد میں ہیں۔ آج کتنے لوگ ہیں جو مفسرین، فقہاء، اور ائمہ دین کی طرف پر ریسرچ کا بیڑا اٹھائیں۔ اور دین کو اس کا صحیح مقام و دائرہ جھوٹا سلام کا ارشاد دے رہے ہیں۔ قرب قیامت میں فتنوں کا دور آئے گا۔ اُس وقت دین کو ہاتھ میں پکڑنا اس قدر مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جلتے ہوئے کوٹوں کو پکڑنا۔ آج آپ کسی بقیعہ دھرم کی تردید کر کے دیکھیں، ساری برادری اور خاندان ناراض ہو جائے گا۔ شادی بیاہ کی رسمیں دیکھ لیں۔ یہ انش اور فقیہ کی رسوم کی طرف نگاہ ڈالیں۔ میلوں اور عرسوں کی طرف دیکھیں کیا کچھ پورہ ہے۔ قبروں پر چادریں چڑھانی جا رہی ہیں۔ میلے لگائے جاتے ہیں۔ قواہاں پورہ ہیں۔ خواجہ نظام الدین دینار کی قبر پر دو ہزار روپے کی چادر لے کر ایک آدمی گیا، یہ کون سا دین ہے؟ مٹر خاج کی قبر پر بیش قیمت گنبد کی تعمیر کون سی شریعت ہے؟ ہر جگہ عرسوں کی بھرمار ہے۔ قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے۔ یہ کس شریعت کی باتیں ہیں؟ کیا یہ زود کا طریقہ نہیں ہے؟

دین کی بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں بدلنے کے لیے لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں اور پھر دین فروش بن جاتے ہیں۔ ان کی اس خواہش کو تحریک کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نکاح و طلاق کے مسائل کی مثال واضح ہے۔ جلد بازی میں طلاق دے دیتے ہیں جب اپنے کیے پر ندامت ہوتی ہے تو اس کے لیے راستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ طلاق کے کتنے ہی ایسے معاملات ہیں جن میں لوگ غلط فہمی حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ طلاق جیسی اہم اور دوہیں چیز کو عائد کرنے سے پہلے اس پر

اچھی طرح غور کیا جاتا، کسی صاحبِ لائے عامہ سے مشورہ کیا جاتا۔ طلاق دینے اور پھر اس کے اثرات کے متعلق پوچھا جاتا۔ مگر ہائے معاشرہ کا اصول یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اس کے اثرات کے لیے فتویٰ حاصل کرنے آتے ہیں کہ جب غلطی ہوگئی ہے لڑکے نے غصے میں آکر طلاق دے دی ہے۔ اب اس کا کوئی حل بتائیں۔ ہم چوبیس سال سے یہی کچھ دیکھ رہے ہیں اتنے عرصے میں صرف ایک آدمی نے طلاق دینے سے پہلے مشورہ کیا ہے۔ کہ میرا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے بعد ہی کوکشتش کے باوجود نباہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ ہمیں طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتائیں۔ اور نہ باقی سب طلاق دینے کے بعد ہی آئے ہیں۔ کہ اب کسی طرح حلال کر دو۔ یہ دین میں تحریف نہیں اور کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تحریف کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيهِمْ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے کچھ یعنی خود کچھ کر اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور تحریف کے مرتکب ہوئے وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُوْنَ اور ہلاکت ہے ان کے لیے جو انہوں نے کیا ہے یعنی غلط فتویٰ دیے اور تحریف کر کے جو دنیا انہوں نے کمائی وہ ان کے لیے باعثِ ہلاکت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حلال کی بجائے حرام کہا ہے۔ اور حرام کہا ہے تو اس کی قیمت میں تاہی ہی آئے گی اسی بات کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الَّذِيْنَ هَبْنٰ لِيْكَوْنُ مُّوَاْدِّىْنَ یا بآطل، یعنی کہتے ہی پیراۓ عالم ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھا جاتے ہیں۔ یہ باطل طریقے ہی ہیں۔ جو شرکیہ اور بدعتیہ رسوم کو اپنا کر اختیار کئے جاتے ہیں۔ جھوٹی کہانیاں سنا کر اور باطل عقیدے پھیل کر لوگوں کا دل مضمحل کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ایمان ضائع کئے جاتے ہیں۔ تو فرمایا اس قسم کی کمائی پر بھی لعنت۔ تاہی اور بربادی ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے باطل عقائد کی تفصیل آرہی ہے۔ اور قانونِ نجات کا دوبارہ ذکر ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَنَّا النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَخَذْتُ عَهْدَ
 اللَّهُ بِهَذَا أَفَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا
 تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ
 فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ
 فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۲﴾

تفسیر

مفسر

ترجمہ اور (یہودی) کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں چھوٹے گی ہم کو (دوزخ کی) آگ
 مگر چند دن کے لیے۔ (اے پیغمبر) آپ فرمادیجئے کیا تم نے پڑھا ہے اللہ تعالیٰ کے
 پاس کوئی عہد پس ہرگز نہیں خلاف کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا — بلکہ تم اللہ تعالیٰ
 پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ﴿۸۰﴾ کیوں نہیں جس شخص نے بُرائی کائی اور گھیر لیا
 اس کو اس کے گناہوں نے، وہی لوگ دوزخ واسے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے
 ﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ وہی لوگ جنت واسے

ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۸۲﴾

یہودیوں کے
 باطل عقائد

اس رکوع میں اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ
 نے کافروں سے امید قطع کرنے کا حکم دیا۔ کہ یہ بڑے متعصب لوگ ہیں۔ آپ ان سے
 ایمان لانے کی امید نہ رکھیں۔ اس کے بعد ان کے دو طبقوں یعنی اہل علم اور ان پڑھ
 لوگوں کا ذکر ہوا۔ کہ ان جاہل لوگوں سے پاس دین نہیں۔ بلکہ چند جھوٹی آرزوئیں ہیں مثال کے طور
 پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی ایک جھوٹی آرزو یہ ہے کہ وَقَالُوا لَنْ تَمَنَّا النَّارَ
 وہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً مگر چند دن کے لیے
 جنت تو ہمارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ دوسری جگہ ان کی بات کو یوں بیان فرمایا لَنْ يَدْخُلَ

فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ اور اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی وعدہ تم سے نہیں کر رکھا ہے۔ اَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ البتہ ایمانداروں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر رکھا ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں سکھایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کہا کرو: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعٰهَدُ اِلَيْكَ فِیْ هَذِهِ الْحَیْوةِ الدُّنْیَا مَعْنٰی اے اللہ! میں تیرے سامنے اس دنیا کی زندگی میں عہد کرتا ہوں۔ بِاَنَّكَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ یہ کہ تو ایک ہے۔ اور تیرا کوئی شریک نہیں دَنْ مُحَمَّدًا عَبْدًا وَرَسُوْلًا اور بے شک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں وَالَّذِیْ رَاٰ ثِقُ الْاَبْرَحِمٰتِکَ اور مجھے صرف تیری رحمت پر ہی جبر و سب ہے۔ اِنْ تَکَلِّفْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ اِکْرَ تَوَجَّهْ مِیْرَے نفس کی طرف سوچ دے گا۔ تَقْبِرْ بِنِیْ مِنَ الشَّیْءِ تَوَجَّهْ شَرِّے قَرِیْبَ کَرِّے گا۔ وَتُبَاعِدْنِیْ مِنَ الْخَیْرِ اَوْ بِنِیْ اور جلدائی سے دور کر دے گا۔ فَاجْعَلْ فِیْ عِمْدَکَ عَهْدًا تُؤَفِّقُنِیْدَ یَوْمَ الْقِیَمَةِ پس تو میرے لیے عہد بنا دے کہ اس کو قیامت والے دن پورا کرے۔ اِنَّکَ لَا تَخْلِفُ اَعِیْضًا دَبَّے شک تو وعدے کو خلاف نہیں کرتا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا، جو شخص اس دعا کو دنیا میں پڑھے گا۔ تو اس کو قیامت والے دن اس کا بدلہ ملے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی عہد کرنا ہو تو وہ ایمان کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے ایمان کے بغیر کوئی عہد نہیں ہو سکتا۔ جو ان کے لیے دوزخ سے نجات کا ذریعہ بن سکے۔ مگر اے بنی اسرائیل تمہارے پاس تو ایمان موجود نہیں۔ لہذا تم یہ دعوتیں کیسے کر سکتے ہو کہ ہم اذل تو دوزخ میں جائیں گے نہیں۔ اور اگر گئے بھی تو چند روز سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ بلکہ جنت میں آجائیں گے۔ یہ تو تمہارا عقیدہ بالکل فاسد ہے

فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں بنی اسرائیل کے عقائد باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے جنت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات کا قانون تو آگے آرہا ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل

باطل عقائد
کی بنیاد

بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امت کا رشتہ علم و عمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزوئیں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا۔ ان کے تمام افعال نبی سے قطع تعلقی پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں بلکہ خواہشات کی بنا پر وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں دوزخ سے بچالیں گے۔

سناؤں کے
باعل عقائد

اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ ہی لے لیں۔ یہاں پر يَا شَافِعَ الْمُذْنِبِينَ کے نعرے ملتے جاتے ہیں۔ کہ ہم جو چاہنے کرتے پھرے۔ حضور علیہ السلام ہماری شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پر نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْضَىٰ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بھی سفارش نہیں کر سکا۔ تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ فلاں ضرور ہماری سفارش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے ضرور ہی قبول فرمائے گا۔ یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے محض میلاد منفعہ کر لینا، جلوس نکال لینا یا گیارہویں منالینا کا فی سمجھ رکھا ہے۔ بس شفاعت کے حقدار ہو گئے۔ شیعہ بھی یہی کہتے ہیں حضرت حسینؑ کا نام لے لو۔ ماتم برپا کرو۔ بس نخسے جاؤ گے کسی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب علم و عمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ اور ماری عمر لوگ اسی دھمول کو پیٹتے بستے ہیں۔ یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔ سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ خدا چاہے رضی ہو یا ناراض۔ نبی۔ ولی۔ جبری سفارش کریں گے۔ اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہی مٹھو کر کھائی۔ اور ہم بھی اُسی راستے پر چل نکلتے ہیں۔ ان میں اور ہم میں کیا فرق ہو گیا

قانون نجات

فرمایا ہے بنی اسرائیل! نجات کا قانون وہ نہیں ہے۔ جو تم نے بنا رکھا ہے۔ کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہود بننا کافی ہے۔ بکلی بلکہ قانون نجات یہ ہے کہ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ جس شخص نے بھی گناہ کیا۔ اور اس کے گناہوں نے اُسے گھیر لیا فَأُولَٰئِكَ مَتَّعْنَا الشَّارِئِينَ لوگ دوزخی ہیں۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ جو

ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا جو سب سے بڑا ہو گا۔ اور چاروں طرف چھایا ہو گا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ قرآن پاک میں آتا ہے: **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ**۔ سب سے بڑے ظالم کافر ہیں۔ نیز فرمایا: **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ**۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ**۔ شرک کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ **وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ**۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے معاف فرمائے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی کسی کو معاف فرمائے۔ وہ مالک ہے۔ مگر شرک اور کفر جیسے عظیم گناہوں کو معاف نہیں کریگا۔ یہ اُس کا اہل فیصلہ ہے۔ ہاں اگر سحرات موت طاری ہونے سے پہلے پستے اُس نے توبہ کر لی۔ تو وہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے۔ جب تک کسی پر موت کے آثار ظاہر نہ ہو جائیں۔ فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغْزِغْهُ انْشَاءُ**۔ انسان کی توبہ غرغره طاری ہونے سے پہلے مقبول ہے اس کے بعد نہیں۔

اسی لیے فرمایا: **وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَيْكَتِهِ وَكِتَابِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** جس شخص نے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا **فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا**۔ ایسا شخص گمراہ ہو کر دور جا پڑا۔ اور اب وہ جہنمی ہے اس کے لیے دوزخ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔

کافر و شرک
دہلی جہنمی ہیں

یہ ایسے شخص کی مثال ہے۔ جسے ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ کھلم کھلا کفر پر اڑا رہا۔ البتہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر اور دوسری چیزوں پر ایمان لائے۔ اور ساتھ ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتا جائے۔ یعنی اُس نے اپنے ایمان کو شکوک و شبہات سے مالا لیا ہے۔ اور اپنے ایمان کو خراب کر لیا ہے۔ قرآن پاک نے اس مضمون کو بڑی تاکید کے ساتھ

بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منادی کرتے تھے۔ اے لوگو! خوب اچھی طرح سن لو۔ اَعْبُدُوا اللّٰهَ رَبَّیْ وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ اللّٰهُ تَعَالٰی کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اپنی حاجتوں میں غیر اللہ کو مت پکارو، اور نہ ان کی ایسی تعظیم کرو جو اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے، ورنہ شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نجات سے محروم ہو جاؤ گے اِنَّهُ مَنۢ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَزَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے۔ وَمَاؤُمۡهُ لَنَّاۗؤُۡۤہ اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ لَا تَفۡتَحُ لَہُمۡۤ اَبۡوَابُ السَّمٰوٰتِ وَلَا یَدۡخُلُوۡنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یُکَلِّمَہُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ فِیۡ سَمۡۡۃٍ الْجَنّٰطِ نیاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناک کے گرد گھومتے نہ دھن سوئی کے ناک کے گرد گھومتے اور نہ کفار کے لیے جنت کے دروازے کھلیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جنت حرام کر دی ہے۔

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا اِنِّیْ اَزَعُمَالِیْ اَفْضَلُ جُزْءٍ اَکْرَمَ عَمَلٍ اَفْضَلُ تَرِیۡنَ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی لیے فرمایا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہُوَ رُکۡنُ اِیۡمَانٍ لَّہٗ وَتَعٰصَمُوا الصَّلٰتَ اور نیک اعمال کئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے، ان کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ہِیَ رُکۡنُ جَنَّتِ وَاٰتِیۡنَ جَنَّتِ کی چابی ان کے پاس ہے۔ اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہوگا، بلکہ ہُمْ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا قانونِ نجات ہمارے پاس ہے۔ تم کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ دنیا کی دیگر برائیوں میں ملوث ہوتے ہو۔ اس کے باوجود اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ یہ بالکل باطل خیال ہے۔

الْعَمَلِ

درس سی و پنج ۲۵

البقرة ۲

(آیت ۸۳)

وَلَا تَأْخُذْ بَعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَنَذَرَ الْوَٰلِدِينَ
 وَالْحَنَافَةَ وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۚ
 أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ
 وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عمل لیا کہ تم اللہ تعالیٰ
 کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ان باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور قرابت داروں
 کے ساتھ۔ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکین کے ساتھ۔ اور کمولوگوں کے لیے نیک بات
 اور نماز کو قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر پھر گئے تم (بنی اسرائیل) بہت تھوڑے

تم میں سے اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۸۳﴾

رابط آیت

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مختلف غزایاں بیان ہو رہی ہیں۔ پچھلے درس میں ان کے ان
 غلط عقائد کا رد تھا کہ یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا یہ اللہ تعالیٰ
 پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ البتہ خود اللہ تعالیٰ نے تورات میں جو عہد
 بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ اس کا ذکر ہے۔ اور وہ ایسا عہد تھا۔ جو کہ نہ صرف تورات میں تھا۔ بلکہ تمام نبی
 انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی موجود تھا اور اس کی تمام باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت
 میں بھی آگئی ہیں۔

توجہ کے
دو پہلو

اس آیت میں جس عہد کا ذکر آ رہا ہے۔ وہ عہد توحید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْخُذْ
بَعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عمل لیا تھا
 پختہ عمل کہتے ہیں۔ جو بڑا مضبوط اور پکا ہو۔ اور وہ عہد یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فتنہ تم اللہ تعالیٰ
 کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ لَا تَعْبُدُونَ کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ تم عبادت نہیں کرو گے
 اور یہ خبر کی صورت ہے۔ مگر حقیقت میں یہ حکم ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ۔ اللہ تعالیٰ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایسی بات کو خبر کی شکل میں ذکر کرنے کا مقصد اس میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو تو پہلے گزرتا چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس کی توحید کو تسلیم کرو۔ وحدانیت کا دوسرا پہلو منفی ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے۔ وہ تو واضح ہے۔ اور اس میں اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا کہ بھی اپنے رب کی عبادت کرو۔ مگر توحید کے دوسرے حصے میں جا کر اکثر گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ اور لوگ شرک یا مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب لوگ حقیقی رب کی عبادت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بائبل میں اگرچہ بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے مگر توحید کا مسئلہ آج بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر خدا کے غیر کی عبادت نہ کرو۔ بحدہ نہ کرو۔ صرف خداوند جو بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ اس کی عبادت کرو۔ مقصد یہ کہ توحید ایک مسئلہ ہے۔ جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائط میں قدر مشترک کے طور پر موجود رہا ہے۔ آیت زیر درس میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مختلف اوقات میں مختلف عہد لیے۔ بمجملہ ان کے تورات بنی اسرائیل کے میں یہ عہد تھا۔ جسے قرآن پاک نے بیان کیا وَلَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا دَرَجَاتِكُمُ الْغُرُورَ یعنی اے بنی اسرائیل اس بات کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ اور تم پر سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اور پھر یہ بھی کہا تھا وَادْكُرُوا مَا فِيهِ جَوْ كُفَّهِمْ جَمْعُ نَزَلِ اس کی یاد کرو تورات میں یہ عہد بھی لیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لوگوں کے سامنے ظاہر کرو گے چھپاؤ گے نہیں۔ یہ لوگ اصل احکام کو چھپا بیٹھے تھے۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ مسائل لوگوں کو بتاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم لَتُبَيِّنَنَّ لِلنَّاسِ لَا تَكْتُمُونَ فَذَرْنِي يَنْزِلْ عَلَيَّ نَزْلًا کہتے تھے۔

الغرض! اس مقام پر جس عہد کا ذکر ہے وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنا۔ عبادت کے لیے ضروری ہے۔

ہے کہ جسکی عبادت کرنا ہے۔ اس کی صحیح پہچان بھی ہو۔ اسی لیے سب سے پہلے رب تعالیٰ کی پہچان کرائی گئی ہے: **الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** (۱) **الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ** (۲) **مَلِكٌ يَوْمَ الدِّينِ** (۳) یہ سب اللہ تعالیٰ کی پہچان ہی تو ہے۔ یعنی رب وہ ہے جو ان صفات کا مالک ہے: **الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** وہی تمہارا بھی خالق ہے۔ اور تم سے پہلے آنے والے لوگوں کا بھی وہی مالک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے۔ اُسے ذرے ذرے کا علم ہے: **اِنَّهُ يَكُلُّ شَيْءٌ مَّحْصُطٌ** اُس صفت کی پہچان ہو گئی تو توحید سمجھ میں آجائے گی۔ اسی طرح قادر مطلق ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں سے ہے: **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اُس کا وجود اپنی ذات سے ہے۔ باقی تمام چیزوں کا وجود استعار ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے کسی چیز کا حکم دینا یا کسی چیز سے منع کرنا بھی اس کی صفت ہے۔

اس کے علاوہ ان چیزوں کی پہچان بھی ضروری ہے۔ جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ عاجزی اور جہالت سے پاک ہے۔ رافضیوں کا عقیدہ بالکل باطل ہے جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو بوجہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ کام کر لیتا ہے، بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یا جس طرح یہودیوں کا باطل عقیدہ ہے کہ بعض کام کر کے اللہ تعالیٰ نادم بھی ہوتا ہے۔ قرآن کے پہلے باب میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے خود ہچکچاتا۔ تو ایسی یہودہ باتوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو مین کا گورنر بنا کر بھیجا۔ تو دستہ بہا۔ بھائی! سب سے پہلے ان لوگوں کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا **فَاِذَا عَدُوْنَا اللّٰهَ تَرَجَعُوْا** جب وہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح سے پہچان لیں، تو پھر انہیں خدا تعالیٰ کے احکام یعنی **عَمَّا رَزَّوْا**

زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے احکام بتلانا کہ اُس خدا تعالیٰ نے تم پر یہ فرائض عائد کیے ہیں۔ انہیں انجام دینا لازم ہے۔

والدین سے
حسن سلوک

بہر حال عہد کا پہلا حصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اُس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔ عہد کا دوسرا حصہ فرمایا وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا صرف بنی اسرائیل کی شریعت میں ہی ضروری نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو شریعت محمدیہ کا بھی ایک لازمی جزو ہے۔ وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا یعنی خدا تعالیٰ کا یہ اہل فیصلہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر کیا۔ اور پھر ساری مخلوق میں والدین کو سب سے اول نمبر پر شمار کیا۔ یہ احکام تمام انبیاء علیہم السلام کے شراعی میں موجود رہے ہیں۔ توراۃ اور قرآن پاک میں بھی موجود ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسن سلوک کے سلسلے میں والدین کو کیوں مقدم رکھا ہے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خالق اور حقیقی مربی ہے اسی طرح والدین بھی اس مادی دنیا میں اولاد کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا حق مقدم رکھا ہے۔ والدین جو احسان اولاد کے ساتھ کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی پر مہربانی فرما کر اس سے معاوضہ طلب نہیں کرتا اسی طرح والدین کے اپنی اولاد پر بے مثال احسان ہوتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ماں اور باپ میں سے کون مقدم ہے۔ تو اس کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ آپ نے فرمایا اَهْلَكَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ، اس شخص کے تین بار کے سوال کے جواب میں آپ نے ماں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ چوتھی دفعہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا

اَبَاكَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ گویا خدمت کے سلسلے میں ماں کو باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں زیادہ تکالیف برداشت کرتی ہے۔ لہذا خدمت کی زیادہ حقہ ار بھی وہی ہے۔ قرآن پاک نے ماں کے متعلق فرمایا: **حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ** یعنی ماں نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر بچے کو پیٹ میں رکھا۔ اسی لیے محدثین عظام فرماتے ہیں کہ اگر ماں اور باپ دونوں کو بیاس مٹی ہوئی ہو۔ تو پہلے ماں کو پانی چلاؤ۔ کہ خدمت میں اس کا حق فائق ہے۔ مگر جہاں ادب و احترام معصود ہوگا تو وہاں باپ مقدم ہوگا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت ترکِ ایذا ہے۔ ماں باپ کو قول سے یا فعل سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ کیونکہ یہ احسان کے خلاف ہے۔ بلکہ اولاد کا فرض ہے کہ اپنے جسم اور مال کے ساتھ ماں باپ کی خدمت کرے۔ اگر والدین مالی طور پر ضرورہ مند ہیں۔ تو ان کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ورنہ جسمانی طور پر تو لازماً ان کو راحت پہنچائیں۔ مثلاً ان کی سچی چابی کریں۔ ان کو کھلائیں پلائیں۔ ان کو سنلائیں دھو لائیں وغیرہ وغیرہ۔

ماں باپ کی فریادگی کے بعد ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا بھی ان کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان کے لیے استغفار کرو۔ صدقہ و خیرات کرو۔ تاکہ ان کے لیے آخرت میں راحت کا سبب بنے۔

حضرت علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اگر ماں باپ نے کوئی وصیت کی ہے۔ تو اولاد کو چاہیے کہ اُسے پورا کریں۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سمجھا جائے گا۔

مسلم اور ترمذی شریفین کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بڑا بڑا۔ آپ نے اپنا گدھا اس بڑے کو دے دیا۔ آپ کے سر پر چڑھی تھی۔ وہ بھی بڑے کو سر پر رکھ دی۔ ساتھیوں نے عرض کیا۔ حضرت! آپ کے پاس یہی ایک گدھا تھا۔ جو سواری کے کام آتا تھا۔ مگر آپ نے اس دیہاتی کو دے دیا۔ دیہاتی لوگ

۱۔ کرب الدردی ص ۱۶۱ ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۱۳

۳۔ ابوداؤد ص ۳۴۴ ۴۔ ابن ماجہ ص ۲۶ ۵۔ مسلم ص ۳۱۶ ۶۔ مجمع الفوائد ص ۱۶۹ ۷۔ بحوالہ مسلم ترمذی۔ ابوداؤد

تو معمولی چیز پر بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی قیمتی سواری تک مٹے دی۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی! اس کا باپ میرے والد کا دوست تھا۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا باپ کے ساتھ نیکی میں شریک ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بعض حدود بھی متعین ہیں۔ سورۃ لقمان میں واضح ہے: **وَإِنْ جَاهَدَكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُكُمْ فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا**۔ اگر ماں باپ تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی البتہ دنیا میں ان سے اچھا سلوک کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر والدین ترکِ فرض پر مجبور کریں، تو ان کی بات نہیں ماننی چاہیے۔ مثلاً کسی پر حج فرض ہو گیا ہے۔ مگر ماں باپ روکتے ہیں۔ تو ان کی بات کی پروا نہیں کی جائے گی۔ قربانی واجب ہے۔ اگر والدین اس سے روکیں تو نہیں رکن۔ البتہ اگر سنتِ مؤکدہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالیں۔ تو ان کے کہنے پر ایک دو دفعہ مانا جاسکتا ہے تاہم سنتِ مؤکدہ کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ نفلی عبادت کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر ماں باپ روکتے ہیں، تو قطعی طور پر رک جاؤ۔ ماں باپ کی بات مانو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر نفل پڑھنا چاہتا ہے۔ اور والدین کہتے ہیں کہ ان کو تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔ لہذا نوافل کے لیے مسجد میں نہ جاؤ۔ تو ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔ کفر و شرک پر آمادگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ماں باپ بہ عات پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت نہیں کرنا ہوگی۔ مثلاً وہ کہیں کہ قبر پر بجدہ کرو۔ یا داتا صاحب بجا پھر ٹھاؤ۔ فلاں جگہ نیاز مٹے کر آؤ۔ تو ایسی باتوں کو نہیں ماننا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ تاہم ان تمام تر حدود و قیود کے باوجود والدین سے حسن سلوک ہر حالت میں لازم ہے۔ **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** کا یہی مطلب ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد فرمایا **وَذِي الْقُرْبَىٰ** یعنی قرابتداروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ قرابتداروں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم محرم قرابتداروں کی ہے۔ یعنی وہ درجہ دار۔

ذاتِ ان کے
مستحق

جو آپس میں محرم ہوں اور جس کو آپس میں نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً بھائی، بہن، چچا، بھتیجی، بھوچھی، بھتیجی وغیرہ۔ قرابتداروں کی دوسری قسم غیر محرموں کی جیسے ماموں زاد، خالہ زاد، چچا زاد وغیرہ۔ فرمایا ان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ رضاعی ماں کی خدمت کرو۔ دودھ والے رشتہ داروں کی مالی خدمت زیادہ موزوں ہے۔ ایک مالدار شخص اپنے محتاج عزیزوں کی خبر گیری نہ کرے گا۔ تو مجرم ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ فرمایا: **وَاتَّبِعُوا حَقَّ** قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ تو ان کی امداد کرو۔ یہ ان کا حق ہے۔ اس کے بعد فرمایا **وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ** یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے جس کے سرپر والدین کا سایہ نہ ہو۔ اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

یتیم، مسکین
اور فقیر

کہتے ہیں کہ جالوروں میں یتیم وہ سمجھا جاتا ہے جس کی ماں موجود نہ ہو۔ باقی چیزوں میں یتیم وہ چیز ہے جس کی نظیر نہ ہو۔ اور وہ نادار چیز ہو۔ جیسے در یتیم۔ نادار قسم کا غمدہ، ہیشال، موتی، مسکینوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خرچ اس کی آمدنی سے پورا نہ ہوتا ہو۔ بیچارہ، کثیر العیال، محنت، مشقت کرتا ہے۔ مگر جو کچھ کماتا ہے۔ اس میں گذر اوقات نہیں ہوتی۔ ایسا شخص بھی حسن سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ محتاجوں میں ایک قسم فقیر کی بھی ہے۔ اور فقیر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بالکل ہی ہلوار ہو، اور جس کے پاس در وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو۔ ایسا شخص بھی حقدار ہے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے بنی اسرائیل! اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ماں باپ کے حسن سلوک سے ہمیشہ آؤ۔ قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

الْعَمَّ

البقرة

درس ۱۲ شش

آیت ۱۳ بقرہ

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ قَدْ
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَقِيَمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ
إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿١٣﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ اور قرابتداروں

کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور کمولوگوں سے نیک بات

اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر پھر گئے تم بنی اسرائیل مگر بہت

بھڑے تم میں سے۔ اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۱۳﴾

ان آیات میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی جلد سازی
کے ذریعے احکام شریعت سے اعراض کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی مصلحت باتوں اور انبیاء علیہم السلام
کی ایذا رسانی کا ذکر بھی آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے آزادی حاصل کرنے کے بعد غرض شریعت کا مطالبہ کیا
تو اللہ تعالیٰ نے تورات عنایت فرمائی۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ
نے اُن سے عہد لیا تھا۔ جب انہوں نے عہد و پیمان کیا۔ تو اُن کے سروں پر کوہ طوبیٰ ملنے لگا کہ انہیں
ڈرایا گیا۔ اس عہد کی تفصیلات سورۃ اعراف میں آئی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ درس میں عرض کیا تھا۔ کہ یہ دوسرا عہد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تورات کے

ذریعے بنی اسرائیل سے لیا۔ اور وہ یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا

کبھی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ اقربتداروں یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک سے پیش

آنا۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: حضرت!

ثُمَّ اِنْ عَمَلٍ اَفْضَلُ زِيَادَةً مِّمَّا كُنْتَ تَعْمَلُ. تو آپ نے ارشاد فرمایا الْعَمَلُ لَوْ كُنْتُمْ يَعْنِي نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔ اس شخص نے دوبارہ عرض کیا۔ حضور! اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِسْمِ الْوَالِدَيْنِ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ کہ یہ بنیادی چیز ہے۔ اُس شخص نے سربارہ پوچھا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے، تو آپ نے فرمایا جہاد فی سبیل اللہ۔

تہذیب اخلاق

اصل بات یہ ہے کہ علم سے دو چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیبِ اخلاق اور اجتماعی حقوق تہذیبِ اخلاق میں آگے دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اصلاح عقیدہ اور اعمال صالحہ، جب تک عقیدے کی اصلاح نہیں ہوگی، کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہوگا۔ لہذا سب سے پہلے اصلاح عقیدہ ضروری ہے۔ اور اس میں بنیادی چیز توحید ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ لَا تَقْبُلُوا دُورًا إِلَّا اللَّهُ تَعَالَى کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو۔ جب عقیدہ درست ہو جائے تو پھر اعمال صالحہ بھی مقبول ہوں گے۔ تہذیبِ اخلاق کا دوسرا جزو اجتماعی حقوق ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور اس میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اولیت حاصل ہے۔ ماں باپ کو اپنے بچوں کی اچھی تربیت کا صلہ دینا چاہیے۔ اولاد کی پرورش کے لیے والدین کو بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کی کفایت یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ قرآن پاک کی بیشتر سورتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کے احکام موجود ہیں۔

اجتماعی حقوق میں قربتداروں کا حق بھی ہے۔ اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر کے ہوں، گلی محلے یا شہر یا ملک کے۔ سب کے سب اجتماعی حقوق میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ بھی انسان کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ اس لیے اجتماعی طور پر اس کا بدلہ دینا بھی ضروری ہے اس کو بدلہ کہتے ہیں۔ عدل اور احسان تقویٰ کے دو اجزاء ہیں لہذا یہ سب چیزیں تہذیبِ اخلاق میں آ جاتی ہیں۔ یہ ایک بنیادی تعلیم ہے۔ جو محض بنی اسرائیل کے لیے خاص نہیں ہے۔ بلکہ ہماری امت کے لیے بھی یکساں طور پر قابلِ عمل ہے۔

حسن کلام

الغرض! آیت ذیل میں کے پہلے حصے کی تشریح گزشتہ درس میں پیش کر دی تھی جس میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین، قربتداروں،

یقینوں اور یسینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ آج آیت کے دوسرے حصہ کا ذکر ہے۔ **وَقُولُوا**
لِلنَّاسِ حَسَنًا اور کو لوگوں کے لیے اچھی بات، مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ کوئی فرد واحد عام
 لوگوں کے ساتھ نہ بدنی نیکی کر سکتا ہے۔ اور نہ مالی نیکی کر سکتا ہے۔ ایسے افعال وہ محمد و لوگوں کے
 ساتھ ہی انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً والدین کی خدمت، ماں اور بدنی دونوں طریقوں سے کر سکتا ہے۔
 اس طرح قربتداروں اور دوستوں کی مالی اعانت کر سکتا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں علوم اناس کے
 لیے انجام دنیا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ اجتماعی نیکی حاصل کرنے کے لیے **قُولُوا لِلنَّاسِ حَسَنًا**
 کا حکم دیا۔ کہ اگر تم بدنی اور مالی خدمت نہیں کر سکتے۔ تو عام لوگوں کو اچھی بات ہی کہہ دو۔

اچھی بات کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: جب آپس میں
 ملو۔ تو ایک دوسرے کو سلام کرو۔ اور پھر اچھا کلمان دو ہے جو سلام کرنے میں پل کرتا ہے۔ **عَلَى**
مَنْ عَرَفْتُمْ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفُوا جس کو پہچانتے ہو اس کو بھی سلام کرو۔ اور جس کو نہیں پہچانتے
 اس کو بھی سلام کرو۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ سلام جو ہے۔ یہ **مِنْ**
خَيْرِ خِصَالٍ اَوْ يُمْكِنُ اَوْ قَالَ رَسَدًا جو ایمان کی بہترین خصلتوں میں سے ہے۔ یا فرمایا سلام
 کی بہترین خصلتوں میں سے۔ سلام کرنے کی حکمت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ ایسا
 کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں مقام عطا کرے گا
 جب کوئی سلام کرے تو اس کو اچھے طریقے سے جواب دو۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ **رُدُّوْهُ**
 سلام کا جواب ویسے ہی لوٹا دو یا اس سے بہتر لوٹاؤ۔ فرمایا **الرَّايِبُ شَخْسٌ تَمِيَسُ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ**
 کہتا ہے۔ تو تم سے بہتر لوٹاؤ اور کو **وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ** صرف
السَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنے والے کو دس نیکیاں ملیں گی اور **وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ**
وَبَرَكَاتُهُ کہنے والے کو تیس نیکیاں حاصل ہوں گی۔

کسی کی نیکی کی طرف راہنمائی کرنا اور برائی سے روکنا یہ بھی حسن کلام میں داخل ہے جب

۱۔ تفسیر غزالی فارسی ص ۲۱۶ پرہ ما ۲۔ ترمذی ص ۲۵۱ ابو داؤد ص ۲۵۱ منہ احمد ص ۱۶۸ بخاری ص ۹۲ مسلم ص ۳۸

۳۔ بخاری ص ۹۲ مسلم ص ۳۸ ۴۔ ترمذی ص ۳۸۵ ابو داؤد ص ۳۵۰

دُشمن آپس میں تو نرمی کے ساتھ نیکی کی دعوت دیں۔ آپس میں دوستی کا اظہار کریں۔ اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کریں۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو پکارے، تو اچھے لقب سے پکارے قرآن پاک میں موجود ہے: وَلَا تَنَادُوا بِأَلَاءِ لِقَابٍ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے مت پکارو۔ یہ سب باتیں قولوا للئناسِ حُسنًا میں داخل ہیں۔

اسی طرح فرمایا کسی غیر حاضر بھائی کا ذکر کرو تو اچھے طریقے سے کرو۔ اس کو برائی کیساتھ یاد نہ کرو۔ اگر کوئی مسلمان تم سے مشورہ طلب کرے۔ تو اس کو صحیح صحیح مشورہ دو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے: الْمُشْتَارُ مُؤْتَمَنٌ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اُسے امین سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ غلط مشورہ دے گا۔ تو خائن تصور ہو گا۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ نادانستہ طور پر سُنَّات میں پڑا ہوا ہے۔ تو اُسے حُسنِ اخلاق کے ساتھ روکنے کی کوشش کرو۔ مگر اس سلسلے میں سختی نہیں کرنی چاہیے۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ سختی اور نرمی دونوں پُنے پُنے مقام پر روا ہیں تبلیغ و تعلیم کہتے وقت ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا۔ تو فرمایا: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا اس سے نرم لہجے میں بات کرنا۔ لَعَلَّهُ يَذَّكَّرُ اور یحتمل شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے۔ خود حضور علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک نے بیان کیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لَنِتَّ لَهُنَّ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ نرم مزاج میں نہ لو گئیں فَقَدْ غَلِظَ الْقَلْبُ اگر آپ سخت مزاج ہوتے لَا لَفَضُوا مِنْ حَوْلِكُمْ تو لوگ آپ کے ارد گرد سے پھر جاتے۔ کیونکہ سخت مزاج شخص سے لوگ دور رہنا پسند کرتے ہیں مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو نرم مزاج بنایا۔ آپ کو حُسنِ کلام کی توفیق بخشی اور اس طرح لوگوں کو آپ کے گرد جمع کیا۔

جب کسی کے ساتھ بحث و تمیص کی نوبت آجائے۔ تو فرمایا: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ حَسَنٌ تو اچھے طریقے سے دُفاع کرو۔ مناظرے کے وقت بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑو۔ اخلاق سے گری

ہوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ نرمی کالی کھوج۔ نرم نوبت پہنچنی چاہیے۔ بلکہ نہایت احسن طریقے سے گفتگو ہونی چاہیے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد کرامی ہے مَا دَخَلَ الْبِرْفَنُ فِي شَيْءٍ إِلَّا ذَانَهُ
جس چیز میں نرمی آجائے گی۔ وہ اُسے زینت بننے لگی۔ اور جس چیز میں سختی آئے گی۔ وہ اُسے عیب دار
کر دیگی۔ (مَا دَخَلَ الْخَرَقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ)

فرمایا ہر جگہ نرمی ہی سے وہ نہیں چلے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر سختی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔
مثلاً تعزیر کے طور پر سزا مطلوب ہو یا جہاد میں کفار سے مقابلہ ہو تو وہاں پر سختی کرنا پڑے گی۔ اسی لیے
اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو حکم دیا **جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ** آپ کافروں کے
ساتھ جہاد کریں۔ **وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ** اور ان پر سختی کریں۔ کفار کے ساتھ جہاد تو اُسے ذریعہ ہوگا
اور منافقوں کے ساتھ زبانی طور پر۔ یعنی ان کے نفاق کو کھول کر بیان کریں تاکہ دوسرے مسلمان ان سے
بچ سکیں۔ یہ دونوں طریقے سختی کے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نرمی ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کی حدود کا بھی خیال رکھا
جائے۔ نرمی بھی اس وقت تک ہی گوارا ہے۔ جب تک شریعت کی حدود کے اندر ہو۔ اگر ایسی
نرمی برتنے سے شریعت کے اتباع میں فرق آتا ہو۔ تو ایسی نرمی جائز نہیں۔ اگر ایسا کرنے لگ
جائیں گے۔ تو شریعت کے احکام پر عمل ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی نرمی جس سے دین میں مہنت
پیدا ہوتی ہو تو وہ حرام ہے

امم محمد باقرؑ **قَالَ لَوْ أَنَّ النَّاسَ حُسْنًا** کا معنی یہ کرتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی اچھی
بات کہو، جو تمہیں خود بھی پسند ہے۔ جو خود پسند نہیں کرتے وہ بات دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ فرماتے
ہیں **لَا تَكُنْ أَحَدًا مِّنَ النَّاسِ يَدْعُوهُ إِلَى اللَّهِ وَيُحِبُّهُ إِلَّا كُنَ مِنْ أُمَّةٍ أَهْلَتْهُ** اور نبی عن المنکر شامل
ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد الہی ہے: **وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ
صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ** اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں
کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ طرز نیک عمل کرتا ہے اور زبان سے یوں کہتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ گویا یہ سب آپ کی بات ہے۔ اسی کو فرمایا: قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا
 جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں مجتہد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں
 دیا تو فرمایا: قَوْلَ اللّٰہِ لَآ اَنْ یُّفْسِدَی اللّٰہُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا حَتّٰی تَمُوتَ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَكَ
 حُمْرَ النَّعَمِ۔ یعنی اے علی! اگر تمہاری وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت نصیب ہو جائے۔
 تو یہ بات تمہارے لیے عمدہ قسم کے اونٹوں سے بہتر ہے۔ مقصد یہ کہ لڑائی اصل مقصود نہیں بلکہ
 اس کے ذریعے اسلام کے راستے میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ یعنی "وَقَتْلُوْهُمْ
 حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةً" کفار سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک تمام فتنے ختم نہ ہو جائیں
 گویا لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا بھی قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا میں داخل ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

بنی اسرائیل کے عہد کا اگلا حصہ یہ تھا: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی
 نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ نماز بہ بنی عبادت ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: کہ نماز اَقْرَبُ الْعِبَادَاتِ
 لِحَقْرِیْبَةِہے۔ یعنی جو عبادت انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی ہے۔ ان
 کی بنیاد اور جڑ نماز ہے۔ نماز کے ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے۔ انسان دن میں پانچ مرتبہ اپنا
 تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا: کہ نماز کو قائم کرو۔ اس میں کوتاہی نہیں لی جائے
 مالی عبادتوں میں زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پاکیزگی اور طہارت کا مضمون
 پایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ بخل کو دور کر کے غریب اور مساکین سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جو کہ
 تہذیب اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت قرآن پاک کی اس آیت
 سے واضح ہوتی ہے: لَکِنْ تَسْأَلُوْا الْیَتٰرَ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا حَبِطُوْنَ۔ یعنی تم اس
 وقت تک یتیم کو نہیں پہنچا سکتے۔ جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔ اور یہ مقصد زکوٰۃ سے
 بھی حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز روا
 رکھی جائے۔ اگر یہ تمیز اٹھ جائے۔ تو روحانیت کیسے آئے گی۔ ہمارے ملک میں سارا معاشی نظام
 سرمایہ دارانہ ہے۔ جس میں سود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سود کی موجودگی میں تقویٰ کیسے حاصل

ہوگا۔ اور پاکیزگی کیسے پیدا ہوگی۔

دوسری طرف کفر و الحاد ہے۔ جس کی بنیاد اللہ ضد پر ہے۔ ہر دو نظام ہائے معاش کا مقصد حصول دولت، عیاشی اور فحاشی ہے۔ سب کی سوچی دنیائیکہ محدود ہے۔ مسعت و حریت بائیں اور ٹیکنالوجی غرض مادی ترقی منستے معصود ہے۔ لہذا انہیں انسانیت کی ترقی کا کوئی علم نہیں کہ وہ کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جس پر آخرت اور دائمی زندگی کا دار و مدار ہے۔

بہر حال یہاں پر نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادات کا ذکر ہے۔ ایک جسمانی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت۔ قرآن پاک میں ان دونوں کا اکٹھا ذکر نہیں آتا ہے۔ بنی اسرائیل کو بھی تاکید تھی کہ ہر حالت میں نماز پڑھو اور اگر مال نصاب تک پہنچ جائے۔ تو اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرو۔ نماز کی اس قدر تاکید ہے کہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ **فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا** اور **كِبَالًا** پس اگر کسی قسم کا خوف ہو تو بھی نماز معاف نہیں ہے۔ تم پیدل ہو یا سواری پر ہو۔ نماز بہر حال پڑھنی پڑے گی۔ سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل سے یہی فرمایا **لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَهَرَدْتُمْ مَعَهُ** یعنی اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے۔ اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے۔ تو میری مہربانیاں تمہارے شامل حال رہیں گی مگر بنی اسرائیل نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی نہ کی۔ بلکہ **قُلْتُمْ لَوْ كُنْتُمْ مِثْلَ بَنِي إِسْرَءِیْلَ لَأَتَيْنَاكُمْ بِالْحَقِّ** تم پھر گئے **الْأَقْلَیَّةَ مِنْكُمْ** مگر تم میں سے بہت تھوڑے ایسے تھے جو اس عہد پر قائم رہے۔ **وَأَنْتُمْ مَعْصِرُونَ** اور تم اعراض کرنے والے ہو۔ تم نے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کیا۔ اور آج بھی ایسا ہی کر رہے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ اس کا نتیجہ کتنا برا نکلتے گا۔ اور تمہارا حشر کتنا عبرتناک ہوگا۔

سے بے خبر نہیں ہے۔ جو تم کرتے ہو (۸۵) یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ پس ان سے عذاب بٹکانیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی (۸۶)

بنی اسرائیل کی غمہ شکنیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے پیشتر اس عہد کا بیان ہو چکا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی حقوق اور انسانی حقوق سے متعلق بنی اسرائیل سے بذریعہ توراۃ لیا تھا۔ مگر انہوں نے اس عہد کو پورا بھی نہ کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر چند آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور تم قواعد احسن کرنے والے ہی ہو۔

خون ناحق اور جلا وطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔ ان دو باتوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا۔ کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے مَاذَا أَخَذْنَا مِنْهُ إِذْ كُنَّا جِبْ مِمَّنْ تَمَّ یعنی تم نے اپنے پختہ عہد یا لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے۔ یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے۔ جس طرح یہ حکم آج تک بائبل میں موجود ہے۔ یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ آگے سورۃ ناز سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ فرقان میں آئے گا۔ کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ۔ یہ قطعاً حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا وَلَا تَحْبِرْ جُؤَانَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ یعنی تم اپنے ہم ملک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا۔ فرمایا أَقْرَبْتُمْ یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو ایفاء کریں گے۔ اور توراۃ کے حکام کی پابندی کریں گے۔ وَأَنْتُمْ قَسَّيْتُمْ دُؤْدًا اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا۔ کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلا وطن کر دو گے۔

بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم ان تمام تردیدوں کے باوجود أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ یہ تمہیں ہی ہوا جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو۔

ناحق خون بہاتے ہو۔ وَتُخْرِجُونَ فِرْيَانًا مِّنْكُمْ مِّن دِيَارِهِمْ اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے بھی نکالتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ تم ان پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور تعدی کے ساتھ۔ کسی پر حملہ کرنا انہیں جانی اور مالی نقصان پہنچانا گناہ بھی ہے۔ اور مظلوموں کے ساتھ زیادتی بھی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے۔ اور خلق خدا کے حقوق مناع کر کے زیادتی کا ارتکاب کیا۔ یہ اُمم اللہ صمدان میں آتا ہے۔

فرمایا تمہاری عجیب ذہنیت ہے کہ جن لوگوں کو تم جلا وطن کرتے ہو وَإِن يَأْتُواكُمُ اسْتَوْىٰ جب یہی لوگ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تَفْدُوهُمْ تم انہیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو۔ پہلے خود ہی انہیں گھروں سے نکال کر اور پھر ان کا معاوضہ دیکر انہیں واپس لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ مُحَرَّرٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ان کا جلا وطن کرنا ہی تم پر حرام تھا تمہیں ایسا کام کرنا ہی نہ چاہیے تھا۔ جس کی وجہ سے تمہیں فدیہ کا مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔ دراصل بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے نہیں قیدیوں کی رہائی کی قطعیت کی تھی۔ اور یہ اچھی بات تھی مگر جہاں یہ لوگ اس حکم پر عمل کرتے تھے وہاں دوسرے در احکام یعنی قتل ناحق اور جلا وطنی کے معاملہ میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟

فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کہ جس حصے پر چاہا عمل کریں۔ اور جس کو چاہا چھوڑ دیں۔ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلْ ذَلِكَ مِثْلُهُم مِّنْكُمْ تم میں سے ایسا کرنے والوں کو جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ اِنَّا خِزْنِي فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دُنْيَا میں انکی جزا ذلت ہوگی۔ وَلَيُؤْخَذَ نَفْسُہٗ بِسَرْدُونٍ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ اور قیامت کے روز سخت عذاب کی طرف دھمکے جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہود۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور خیبر داسے سب ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہوئے۔ بنو قریظہ سخت سازشی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا شر بہت بُرا ہوا۔ بعض قتل ہوئے اور بعض کو جلا وطن کیا گیا۔ اسی طرح قبیلہ بنو قینقاع والوں نے بھی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھا۔ اس کا ذکر سورۃ حشر میں

تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تو ان کی زندگی میں عذاب ہوا۔ فرمایا آخرت کا عذاب تو سخت ترین ہو گا۔ اور یہ لوگ اس میں بھی مبتلا ہو گئے۔

یہودیوں کی
بہمی لڑائیاں

ان آیات میں یہودیوں کی جس بہمی جنگ و جدل اور جلا وطنی کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق حضرت شیخ المنہ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مدینہ کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج تھے۔ جو اکثر آپس میں دست گردیان بستے تھے۔ ان کی آبادی ہزاروں کی تعداد میں پہنچی تھی۔ جب مدینہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو انصار مدینہ کی اکثریت بھی انہیں درِ قبائل میں سے تھی۔ اب بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حامی تھے۔ اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے طرفدار تھے۔ گویا یہودی اس طریقے سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے ان میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ایک قبیلہ دوسرے پر غالب آتا، تو وہ مغلوب کو جلا وطن کر دیتا یا ان کو قتل کر دیتا اور ان کے مکانوں کو گرا دیتا۔ یہ سب ہم مذہب تھے۔ مگر دوسرے قبیلے کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پھر یہی لوگ جنہوں نے انہیں جلا وطن کیا تھا مال اکٹھا کرتے اور ان کا معاوضہ ادا کر کے انہیں قید سے رہائی دلاتے۔ یہ لوگ قیدی کو چھڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر کشت و خون اور جلا وطنی کے احکام کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مفسرین کرام مشرکین کی ایک دوسری لڑائی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ جسے حرب بعاث کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی میں بھی یہودی مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ ایک فریق جنگ کے ساتھ تھا۔ جب کہ دوسرا قبیلہ دوسرے کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں بھی یہودیوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اگر کوئی ہم مذہب بھی سامنے آگیا تو بھی مار ڈالتے تھے۔

امام ابن کثیرؒ نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان ایران کی طرف کسی جہاد میں مصروف تھے۔ اسلامی فوج میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی شامل تھے۔ جو ایک یہودی عالم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے مشرف کیا تھا۔ جب جہاد میں مسلمانوں

کو فسخ حاصل ہوئی۔ تو بہت سے قیدی بھی ہاتھ آئے۔ جن میں وہ یہودی بھی شامل تھے، جو کہ مجوسیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک یہودی عورت لونڈی بن کر آئی۔ جسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے فوراً درہم میں خرید لیا۔ جب آپ کو فریضہ واپس آئے۔ تو وہاں کے ایک مشہور و معروف یہودی، اس الجالوت سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے یہودی کو وہ لونڈی فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ وہ رضامند ہو گیا۔ اور قیمت دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اسے نو سو درہم میں خریدا ہے۔ مگر اب میں چار ہزار درہم سے کم پر نہیں دوں گا۔ پہلے تو اس الجالوت اتنی بڑی رقم مینے پر تیار نہ ہوا، پھر حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس کے کان میں قرآن کی وہی آیت پڑھی **وَإِنْ يَأْتِوكُمُ اسْرٰی تَفْدُوْهُمْ** یعنی جب تمہارا کوئی ہم مسلک قیدی بن کر آئے تو اسے چھڑالو۔ یہ سن کر یہودی مجبور ہو گیا۔ اور اس نے چار ہزار کے بدلے میں ہی خریدنا منظور کر لیا۔ مگر حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے دو ہزار درہم سے لے کر باقی دو ہزار واپس کر دیے۔ اور اس طرح لونڈی اس کے پاس فروخت کر دیں۔ معتصدہ کہ یہودی قیدیوں کو چھڑانے والے حکم پر سختی سے کاربند تھے۔ اگرچہ در سکرا احکام کی پروا نہیں کرتے تھے۔

مسلمانوں کی
حالتِ ذل

یہودیوں کے جزو دین ایمان کا جو نقشہ قرآن پاکؐ نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو آج کل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے کہ قرآن پاکؐ کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے تنہا بے مٹ جاتی ہے۔ دیکھیے کابل والوں کا کیا شہر ہو رہا ہے۔ افغان تان پر غیر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہی حال اس سے پہلے مکر قند اور بنجا کا راقا فلسطین میں کیا ہو رہا ہے جنگالیوں کو کون سی عزت نصیب ہو رہی ہے۔ یہ سب ذلت و رسوائی نہیں تو اور کیا ہے۔

دجہری ہے کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جو حکم ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و عداق کا سو یا سیا سی نوعیت کا ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ عدل احسان اور تقویٰ کو فراموش کر رہا ہے۔

محض نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا شرعی یودیوں سے مختلف نہیں ہے۔ جب انگریز نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا، تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا کہ تم اپنے ذاتی معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل کرنا چاہو گے؟ یہی مسلمان ہیں جنہوں نے لکھ کر دے دیا تھا کہ ہمیں شریعت کا قانون وراثت منظور نہیں ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے کہ ہرم قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں، مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، عبادت تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں، مگر تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لیے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے پرے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سیودی اور مسلمان برابر ہیں۔ نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے، اور نہ مسلمانوں کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دور بینی کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو گا۔

فرمایا وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اُس سے غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی ارادوں تک سے واقف ہے۔ اُس لیے وہ اسی کے مطابق جزائے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی۔ تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے ایسے لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ جب وہ عذاب میں جکڑے جائیں گے فَلَا يَخَفُّ عَنْهُمْ الْعَذَابُ تو پھر ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔

اللہ تعالیٰ
عالم الغیب ہے

آلہ
درستی و درشتی

البقرة

(آیت ۸۶، ۹۰)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ رَافِعِينَ مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا
عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ
رَسُولٌ بِمَا لَمْ تُهْتَوَى أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِقْنَا كَذِبُكُمْ
وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٤﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ
بِكُفْرِهِمْ فَهُمْ قَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٥﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ
كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْهِمُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ مَا جَاءَهُمْ مِنْ قُرْآنٍ
كَذِبًا أَبَدًا فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾ بِسْمَا أَشْرَوْا بِهِ
أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ
مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا وَبِعْضَابٍ عَلَى
غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٩٠﴾

ترجمہ: اور اب اسے تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور ہم نے ان کے
پیچھے بہت سے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بینات (دلائل اور کھلی باتیں)
دیں۔ اور ہم نے ان کی پاک روح کے ساتھ تائید کی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس رسول
کوئی ایسی چیز لے کر آیا، جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے، تو تم نے ٹکڑیاں پس
ایک ذریعہ کو تمہارے مٹلادیا، اور ایک کو قتل کر دیا ﴿۸۴﴾ اور انہوں نے کہا: ہمارے
دل غلافوں میں ہیں۔ ہمیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ ان کے کفر کی وجہ سے
پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۸۵﴾ اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ
کی کتاب آئی، اس چیز کی تصدیق کرنے والی، جو ان کے پاس ہے۔ اور اس سے
پہلے وہ کافروں پر فتح مانگتے تھے۔ اور جب ان کے پاس وہ چیز آئی، جسے

انہوں نے پہچان لیا، تو اس کے ساتھ کھڑا کیا، پس کھڑے کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے (۸۸) وہ بری چیز ہے جس کے لئے انہوں نے اپنے انہوں کو بیچا ہے۔ کہ کھڑے کرتے ہیں اس چیز پر جس کو اللہ نے تار ہے۔ سرکشی کرتے ہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارتا ہے۔

پس یہ لوگ غضب پر غضب سے کھڑے اور کافروں کے لئے ذلت ناک خدایہ (۸۹)

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے مختلف عہدوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جن کی پابندی کرنے کا کتاب اور رسول

سے یہ قوم قاصر رہی۔ اب بعض دوست انعامات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے کیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مہمندان انعامات کے ایک یہ بھی تھا کہ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ یعنی بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات عطا فرمائی تاکہ بنی اسرائیل اس کے ذریعے ہدایت اور رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور پھر یہ کہ صرف کتاب پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب میں مذکور احکام کی یاد دہانی کے لیے وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلے در پہلے رسول بھیجے۔ جو تورات کی تعلیم کو تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر کا مبعوث ہونا بنی نوع انسان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی اور شفقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام لوگوں کی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی رہنمائی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس قدر پیغمبر بھیجے ان میں سے بعض کا نام بھی قرآن پاک نے ذکر کیا ہے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام۔ یونس علیہ السلام۔ ذکر کیا علیہ السلام۔ بحجی علیہ السلام اور پھر سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اسی طرح تورات اور یہودیوں کی دھرم کتب میں بھی بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے۔ محض یہ کہ فرماتے ہیں کہ مجموعی طور پر لکھنا یہاں زیادہ پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
و معجزات

اللہ تعالیٰ نے سلسلہ بنی اسرائیل کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ صاحب کتاب و اللہ تعالیٰ کے عظیم المہربان رسول ہیں چنانچہ آپ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے

وَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَاتِ اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ اور ان سے مراد وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے۔ اور جو قرآن پاک میں مذکور ہیں مثلاً مڑوں کو زندہ کرنا۔ کوڑی کو تہہ بست کر دینا۔ اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا اور اُسے ہوا میں اڑا دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بیانات سے احکام اور دلائل بھی مراد لیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سنت عیسیٰ علیہ السلام کو احکام بھی دیے تھے اور دلائل بھی دیے تھے۔

عیسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ عیسیٰ۔ یسوع یا ایسوع کا معنی مبارک ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام مریم رضی اللہ عنہا تھا۔ آپ کی نانی نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اُسے بیٹا عطا کریگا۔ تو وہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیگی مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اُس نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی عطا کی ہے۔ ہم نے اُسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔ بیٹا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ حضرت مریم کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے : **يُصْرِّحُ** **إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ** یعنی اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوگا۔ عموماً عیسیٰ ابن مریم کا نام ہوگا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آئے گا کہ آپ کے حواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے نام سے جانتے تھے، اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں کرتے۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود خدا تصور کرتے تھے، بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود خدا، خدا کے بیٹے یا مینوں میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

روح القدس

فرمایا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عنایت کیں۔ اور اس کے ساتھ **وَآيٰتُنَا بِرُوحِ الْقُدُسِ** اس کی تائید ہم نے پاک روح سے کی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یعنی ہم نے جبرائیل کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ اس بات کی تائید قرآن پاک کے دو سکر مقام پر بھی ہوتی ہے۔

ذکر کرتا ہے۔ جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کے موافق نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک لوگ فحاشی خواہشات کی اتباع اور عذائی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے انہیں فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔

یہودیوں کا
زعم باطل

یہودیوں کو ایک اور غلط ذمہ تھا۔ کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعوے تھا **وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ** کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں، یہ ان کی خود ستائشی تھی۔ کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہذا وہ اپنے دین پر کچھ نہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اختیار کردہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا یہ نظریہ واقعی طے پایا تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کر سکتے۔ مگر حقیقت اس کے برخلاف تھی۔ وہ تو خود اپنا دین بگاڑ چکے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر اصرار کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات لے کر انہیں علیہم السلام آتے۔ وہ انہیں جھٹلاتے یا قتل کر دیتے۔

یہودیہ اللہ تعالیٰ
کی لعنت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ ان کے دل محفوظ ہیں۔ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے **بَلْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ حَقَّ لَعْنِهِمْ** ان کے گھر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور انہیں اپنا دین درست نہ رہا کر دیا ہے۔ ان کے قلب سبک ہو چکے ہیں۔ انہیں فہم الٹ گئے ہیں۔ یہ حق بات کو نہ سمجھ سکتے۔ یہی وجہ ہے **فَقِيلَ مَا يُوَسُّوْنَ** کہ ان کی بہت قلیل تعداد ایمان لائے۔ سورۃ مدینہ کی چیز کو فرمایا **وَأَنَّ أَكْثَرَهُمْ فَسِقُونَ** یعنی تم میں سے اکثر منافق ہیں۔ اگرچہ سب کے سامنے نافرمان نہیں تھے۔ بائیں اٹھیاں بڑھائیں نہیں ہوئیں۔ لیکن سوائے کثرت طعن ہی تھی۔ ایمان کی دولت چند لوگوں کے پاس تھی۔

یہود اور
نزدول قرآن

یہ تذکرہ تزیور کی اپنی کتاب تورات کا تھا کہ انہوں نے اس کے احکام کی اس نہ سمجھ پائی تھی
کی۔ اب اس بات کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے سارے لوگوں نے
کیا رویہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ جِبْتُمْ
کي طرف سے ان کے پاس وہ کتاب آگئی۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جَوَانِ کتাবوں کی تصدیق
کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے ماد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کتب
میں زبور، تورات، انجیل اور دیگر صحیفہ ساری ہیں۔ یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا۔ کفر و کفر و ابہلہ
تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ تاکہ قرآن پاک ان کے پاس موجود سابقہ کتাবوں کی تصدیق
کر رہا ہے۔

فَلَمَّا كَفَرُوا بِآيَاتِهِ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَكْفُرُوا
در بات کا ذکر ہے۔ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی
نزدول قرآن سے پہلے وہ کفار پر فتح مانگتے تھے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یَسْتَفْتِحُونَ کے در معنی
کیے ہیں۔ فتح کے معنی کھولنے کے ہوتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے نئی یہ ہے۔ بنی اسرائیل
کفار پر اس بات کو کھولتے تھے۔ یعنی بیان کرتے تھے کہ تمہاری ہی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب آنے
والی ہے۔ اُس پر بیان لانا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ الَّذِي يَجْذُوْنَكَ مَكْتُوبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْانْجِيلِ یعنی وہ اپنی کتাবوں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا
پاتے تھے۔ کہ اخضر بنی آئے دار ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے صحیفہ میں بھی بشارت ہے
کہ میں تمہارے میں امی بنی بھیجوں گا۔

يَسْتَفْتِحُونَ کا دوسرا معنی فتح یا کامیابی ہے مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ یہ
لوگ اللہ تعالیٰ سے کافروں کے مقابلے میں فتح و کامیابی طلب کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔
یا اللہ ہمیں اس آئے نبی کی برکت سے کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما۔
تاکہ جب وہ نبی آئے تو ہم اس کی اتباع کریں گے۔ گویا بنی آخر الزماں کے توسل سے مانگتے تھے

نظریہ توسل ہمارے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اُس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اس سے محبت ہے۔ لہذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے خدا تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے۔ ہاں شرک اس وقت ہوگا جب اس کے توسل کی بجائے خود اُسی سے مانگنے لگے یا اس کو مشرکوں کی طرح شمع سمجھے یا اس کو مختار مطلق سمجھے کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

بہر حال پہلے تو یہ لوگ اس قسم کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور وعدہ کرتے تھے کہ انہوں نے یہ ایمان لائیں گے۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْهُمْ رَأَوْا فِيهِ آيَاتٍ مِنْ رَبِّهِمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ الَّذِي كَفَرَ لَهُمْ فَهُمْ فِي شَكٍّ مِنْهُ لَمَّا كَفَرُوا۔ ان کی اس بیٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَعَنَ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ایسے منکرین پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

بنی آخر الزمان
صلی اللہ علیہ وسلم
سے نہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ظالموں نے ایسی بُری حرکات کر کے کیا کھایا۔ بِسْمَا اسْتَوُوا بِهِ اَنْفُسَهُمْ انہوں نے نہایت ہی بُری چیز کے بدلے اپنی جانوں کو بیچا وہ کون سی چیز ہے جو انہوں نے جان کے بدلے خریدی اَنْ يَكْفُرُوا بِمَا اَنْزَلَ اللَّهُ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور وحی کا انکار کر دیا۔ اور یہ شخص اس لیے بقیہ شرا کرتے ہوئے کہ بنی آخر الزمان دوسری قوم میں کیوں آگیا۔ وہ تو ہماری قوم بنی اسرائیل میں آنا چاہیے تھا۔ وہ بنو اسماعیل میں کیسے آگیا۔ چنانچہ قرآن پاک نے جگہ جگہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہاں کہ ہے کہ آخری نبی ضرور بنی اسرائیل میں آئے گا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے اَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ اتنا دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی بھیجے۔ مگر بنی آخر الزمان کی بعثت بنی اسماعیل میں مقدر ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ وہیں تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے آخری نبی کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا۔ اب جب کہ آخری نبی آگئے ہیں۔ تو بنی اسرائیل کا

فرمن تھا کہ وہ اسے پیٹنے سے باز نہ رہے۔ اس پر ایمان لائے اور ان کا اتباع کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے خاندانی تفوق کا دم بھرنے لگے، جو ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

بنی اسرائیل کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَبَاءُ وَبِعْضُبٍ عَلٰی غَضِبٍ وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔ ان کا پہلا غضب تو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ بادشاہ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ منہ پر تھوکا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ دجال کہا۔ انہیں ایذا پہنچائی۔ کتب کا دیہ میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اور حیلے بانوں سے خدائی احکام کو مٹا دیا۔ اور پھر اس غضب پر دوسرا غضب یہ تھا کہ جب بنی آخر الزمان علیہ السلام تشریف لائے اور آخری کتاب نازل ہوئی تو ان کا انکار کر دیا۔ یہ گویا غضب پر غضب ہو گیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلَيْهُمُودُ مَعْضُوبٌ وَالتَّصْنٰی صَدَالٌ یعنی یہود معضوب علیہ ہیں اور نہ ماری گمراہ۔

معضوب اُسے کہتے ہیں جو دیدہ دانستہ احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آج کا مسلمان بھی جانتا ہے کہ شریعت برحق ہے۔ مگر اس پر عمل نہیں کرتا۔ یہی خرابی بنی اسرائیل میں بھی پائی جاتی تھی۔ وہ پہچانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور یہ آخری نبی اللہ تعالیٰ کا ہے۔ مگر ایمان نہیں لائے۔ علاوہ ازیں ضلال وہ ہے۔ جس کے فہم میں خرابی آجائے۔ اور وہ بھٹک جائے۔ نصاریٰ ضلال ہیں۔ یہ غلطی کرنے والے ہیں۔ فرمایا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ یاد رکھو! انکار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دردناک عذاب تیار ہے اگر اس عذاب سے بچنا ہے تو آج بھی راہِ راست پر آجاؤ۔ ورنہ تو تمہارے متہد میں ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کے حالات منکشف کر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر رہے ہیں کہ تم بھی یہودیوں کی روش اختیار نہ کر لینا۔ بلکہ ان کی خرابیوں کا ذکر سن کر اپنی اصلاح کر لینا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أُنزِلَ اللَّهُ قَالَُوا نُوْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَبِكُفْرُوْنَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قَدْ فِيمَ تَقْتُلُوْنَ ۚ أَنْبِيََاءُ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اخْتَلَفْتُمْ إِلَهُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٩٢﴾ وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۚ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِسْمَايَا مُرْكُكُمْ بِهِ ۖ اِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيٰوةٍ ۖ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ أَنْ يُقَرَّرَ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُرْضِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ لِّمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

مع
ہند
المنافقین
ہیں

ترجمہ: اور جب ان (اہل کتاب) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ (یعنی قرآن) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی۔ (یعنی تورات) اور اس کے سوا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ برحق ہے۔ اور تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرمادیجئے پس تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ تعالیٰ

کے انبیاء کو اس سے پہلے اگر تم ایمان دے ہو ۹۱) البتہ تحقیق تمہارے پاس
 موسیٰ (علیہ السلام) کبھی نشانیاں لاتے۔ پھر اس کے بعد تم نے کچھ ٹرے کو معبود بنالیا۔
 اور تم ظلم کرنے والے تھے ۹۲) اور جب ہم نے تم سے پختہ عمل لیا۔ اور ہم نے
 تمہارے اوپر کوہ طور کو اٹھایا۔ خرد جو ہم نے دیا ہے تم کو مضبوطی کے ساتھ اور سنو۔
 انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اور ان کے دوزخ میں کچھ ٹرے کی محبت پڑادی
 گئی ان کے کھڑکی درجے۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ بڑی بات ہے جس کے لیے تمہارا
 ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔ اگر تم ایمان دے ہو ۹۳) آپ فرم دیجئے کہ اگر اللہ
 کے نزدیک نہ ت کہ کھرد دوسرے لوگوں کے سوا صرف تمہارے لیے خالص ہے
 پس تم موت میں نہ رہو، اگر تم چتے ہو ۹۴) اور وہ اس موت کی ہرگز متا نہیں
 نہیں تھے کبھی بھی۔ اس درجے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ
 تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ۹۵) اور البتہ تم ان لوگوں کو زندگی پر
 زیادہ عرصے پڑ گئے لوگوں سے بھی اور ان سے بھی زیادہ عرصے جنہوں نے شرک
 کیا ان میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اسے ہزار سال عمر دے دی جائے۔ حالانکہ
 عمر اسے مذکے عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے اگر اس کو اتنی عمر دے
 دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، جو کچھ یہ کام کرتے ہیں ۹۶)

یہودیوں کی قباحتیں اور ان کی سزائیں بیان ہو رہی ہیں۔ اس کے پہلی آیات میں
 یہودیوں کی بڑائیوں اور ان کے کفر پر اصرار کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ظلم البینین علیہ السلام
 کی آمد سے پہلے یہودی اُن کے منتظر تھے کہ جب وہ نبی آخر الزمان آئے گا۔ تو اس کا ساتھ دیں
 گے۔ یہودی لوگ آپ کی برکت سے مشرکین پر غلبہ حاصل کرنے کی تمنا بھی کرتے تھے۔ اور اس کے
 لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ مگر جب وہ رسول آگیا جس کا انتظار تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی آفتی نہ آ
 بھی آگئی اور اُن لوگوں نے پہچان بھی لیا، تو پھر انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے دوبرے غضب
 میں مبتلا ہونے۔

ان آیات میں بھی یہودیوں کی مہٹ دھرمی کا ذکر ہے۔ البتہ بیان ان کو قرآن پاک دعوت ایمان

اور ایمان کی دعوت دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ
 جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک
 کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ کتاب تسلیم کر لو۔ قَالُوا نُوْثِرُ مِنْ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا ان کا جواب یہ
 ہوتا ہے کہ ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ یعنی توراہ۔ کہتے ہیں کہ ہم
 تو صرف توراہ کو مانتے ہیں وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَ ذَلِكَ اور اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کرتے ہیں۔
 حالانکہ وہ الحق قرآن پاک برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور مُصَدِّقًا لِّمَا
مَعَهُمْ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ یعنی توراہ۔ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا
 توراہ پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی جھوٹا ہے۔ اگر ان بدبختوں کا توراہ پر ایمان ہوتا تو یہ حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے مگر ایسا نہیں ہے۔ لہذا
 یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب تک کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تمام کتابوں
 پر ایمان نہیں لائے گی اور مومن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تمام کتب سماویہ کی بنیادی تعلیم تو ایک ہی ہے
 یعنی ایمانیات اور عبادت کے معاملہ میں تمام کتابیں مساوی ہیں شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ
مَا وَصَّي بِهِ نُوحًا یعنی تمہارے لیے بھی وہی دین مقرر کیا گیا ہے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام
 اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ مختلف زمان و مکان کے
 لحاظ سے شریعت میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔ جیسے فرمایا: بِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ
شِرْعَةً وَ مِنْهَا حَا

قتل انبیاء
 علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے جھوٹے ہونے کی ایک اور دلیل بیان فرمائی ہے۔
 ان سے پوچھے کہ اگر توراہ پر تمہارا ایمان ہے قُلْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ انہیاء اللہ من
قَبْلُ ان گنت مومنین تو تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا
 ہے۔ قبل انبیاء علیہم السلام تمہاری کون سی کتاب جائز قرار دیتی ہے۔ یہ تو نہ بھی کھڑے
 نطق کی بات یہ ہے کہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل قاتلان انبیاء اپنے اباؤ اجداد پر فخر
 کرتے تھے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اپنے نبیوں کے

جرم میں تم بھی شریک ہو۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت یہودی بھی اپنے
 اباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے تھے۔
 اس سلسلہ میں مدینہ کے یہودیوں نے کتنی سازشیں کیں جتنی کہ حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا گیا۔ اسی
 لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے تمہارا دعویٰ ہے کہ تورہ پر تمہارا ایمان ہے۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ قتل
 انبیاء علیہم السلام تورہ میں کس طرح ہے۔ تمہارا دعویٰ ایمان باطل ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو
 تو قتل انبیاء علیہم السلام میں کیوں ملوث ہوتے ہیں۔

فرمایا تمہارا یہ دعویٰ درست نہیں کہ تم تورہ پر ایمان رکھتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ وَلَقَدْ
 جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ جب موسیٰ علیہ السلام واضح نشانیاں یعنی معجزات لے کر آئے
 تو تم نے ان پر ایمان لانے کی بجائے۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ
 پکھڑے کو معبود بنایا۔ یہ مصریٰ شرک تھا جو تمام آسمانی کتابوں کے مطابق گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے
 وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ اور تم یا تمہارے اباؤ اجداد ظلم کرنے والے تھے۔

دیکھو! تم نے بار بار وعدہ پیمان کو توڑا۔ از خود شریعت کا مطالبہ کیا اور پھر جب قانون تمہارے پاس آگیا۔ تو جیسے مانتے سہجے
 ماننا پڑا اور کر دیا کہ اس پر عمل ممکن نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلَئِنْ أَخَذْتُمُ مِيثَاقَكُمْ
 اور جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ کیا۔ وَرَضْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور تمہارے سروں پر کوہ طور
 کو معلق کر دیا۔ اور حکم دیا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَأَسْمِعُوا جو کچھ ہم عطا کر رہے ہیں
 اُسے مضبوطی سے ختم لو اور سنو۔ یعنی اس پر کما حقہ عمل کرو۔ مگر تم نے اُنٹا ہی جواب دیا فَالْوَا
 سِمَعْنَا وَعَصَيْنَا بظاہر تو عمل کا وعدہ کیا۔ مگر باطن میں کہا کہ ہم نے سُن لیا مگر ہم نے
 اُسے تسلیم نہیں کیا۔ یعنی زبان سے اقرار تو کرتے ہیں۔ مگر ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اسی
 وجہ یہ بھی وَأَشْرِكُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ان کے دلوں میں پکھڑے کی
 محبت گھر کر چلی تھی۔ یہ ان کے کفر کی وجہ تھا کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا انکا
 یہ دعوے کہ تورہ کو مانتے ہیں۔ غلط ہے۔

فرمایا قُلْ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیے بِسْمَايَا مُرْكُمُ بِهِ
 يُصَانُكُمْ وہ بہت ہی بُری چیز ہے۔ جس کے لیے تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور تم کو سالہ پرستی بھی کرتے ہو۔ یہ تو بہت ہی
 بری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص ایمان کبھی قتلِ انبیاء علیہم السلام کا حکم نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی
 پچھڑے کی پرستش پر آمادہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ توراۃ پر مبنی ایمان ہی نہیں ہے۔ ورنہ
 اس قسم کی بری حرکات کے مرتکب نہ ہوتے۔

موت کی آرزو

پہلے آیت گزشتہ ہے۔ اور آگے بھی آئی۔ یہود و نصاریٰ دونوں اس زعمِ باطل میں مبتلا
 تھے کہ جنت صرف انہیں کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ کوئی دوسری قوم اس میں داخل نہیں
 ہوگی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا
 اَوْ نَصْرٰیؕ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ
 الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دِفْنِ النَّاسِ اے بنی علیہ السلام! آپ ان کو فرمادیں کہ اگر
 اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا ٹھکانہ محض تمہارے ہی لیے ہے۔ تمہارا یہ یقین ہے۔ کہ تم
 ضرور جنت میں جاؤ گے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ تو پھر ذرا موت
 کی تمنا تو کرو۔ تمہاری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ ظاہر ہے جسے آخرت میں اپنی کامیابی کا یقین
 ہوگا۔ وہ تو چاہے گا کہ کب موت آئے اور کب وہ دائمی آرام و راحت سے مستغنیہ ہو۔ البتہ
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب ان کے زبانی دعوے ہیں۔ کہ ہم جنتی ہیں۔ جنت میں پہنچنے کے
 لیے جس ذریعہ یعنی موت کی ضرورت ہے۔ اس کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔ وَلٰكِنْ يَتَمَنَّوُا
 اَبَدًا لِّكَوْنِمْ وَهَیْهَاتَ ہیں کہ یہاں پر وہ کس قسم کی کرتوتیں کر رہے ہیں بِمَا قَدْ مَتَّ
 اٰیْدِیْہُمْ اَنْ كَیْہُمْ ان کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا ہے۔ اگر اپنی کامیابی پر انہیں یقین ہوتا تو
 ضرور موت کی تمنا کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ اللہ تعالیٰ
 ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ کہ یہ کیا ظاہر کر رہے ہیں۔ اور ان کے باطن میں کیا پوشیدہ ہے۔
 حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن پاک کا چمچ قبول
 کر کے مھوٹ مھوٹ بھی موت کی تمنا کر میٹھے تو ہلاک ہو جاتے۔ اس لیے انہوں نے ایسا نہیں

کیا۔ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو یہ بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ یہودیوں نے قرآن پاک کا چیلنج قبول نہ کیا۔ وہ لوگ تو موت سے سنت خوفزدہ تھے۔ وہ اس کی تمنا کیسے کر سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ یہودیوں کا ایک گروہ بھی مباہلے کے لیے آیا تھا۔ اگر وہ بھی مقابلے میں آجاء اور باہر کر بیٹھا، تو وہ خود اور ان کے گھر بار سب ملک ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کی تمنا بھی نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ طویل العمری کے خواہشمند ہیں۔ وَلَيَجْعَلَنَّ لَهُمْ آخِرَ عَمَلِهِمْ نَافِلَةً عَلَى حَيَاةٍ أَلَمْ يَسْأَلْكُمْ أَنْتُمْ لَدُنِّي عَمَّا أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ (طویل العمری کی خواہش پر لوگوں سے زیادہ حرص پائیں گے) فَمِنْ الَّذِينَ أَشْرَكُوا فَأَنَّ لَكُمْ لُغُومًا مِمَّا عَمِلْتُمْ (جو مشرک ہیں۔ مشرک کے لیے اس آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ لہذا ان کا زندگی پر حرص کرنا تو واضح ہے۔ مگر یہ یہودی آخرت کو ملتے ہوئے بھی دنیوی زندگی کی خواہش کرتے ہیں۔ اور موت سے ڈرتے ہیں۔ عار نہ ہو لوگ صاحب ایمان میں وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ کسی بکرہ کے حالات بہانے ملتے ہیں۔ وہ تو موت کو ابدی راحتوں کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور ہر وقت موت کے انتظار میں رہتے تھے۔ کہ کب اس پل کو عبور کر کے جنت کی داریوں میں پہنچ جائیں۔ انہیں مدینہ منورہ میں موت میں مبتلا ہونے کو کتنے تھے۔ جَلَدٌ حَبِيبٌ عَنِ فَنَافِلَةٍ (ضرورت اور حاجت کے وقت آنے والی چیز یعنی موت آگوار ہے۔ لَا أَفْلَحُ لِسُوءِ مَوْلَانِ نَدَّوْا نَجْوَاهُمْ هُوَا۔ اُنھے کبھی فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ گویا ہم موت سے ڈرتے نہیں مگر اس سے محبت کرتے ہیں۔ کہ یہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر خداوند سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔

جنت مضمین میں حضرت علیؑ چٹخ پسنے ہوئے تھے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت حسنؑ نے کہا کہ اے باجان! یہ لباس جو آپ نے پہن رکھا ہے۔ یہ جنتی لباس تو نہیں ہے۔ زمانے کے تاج بیٹے! مجھے اس چیز کا خوف نہیں ہے۔ کہ موت مجھ پر گرتی یا میں موت

پوگروں۔ ہمیں تو شہادت کی تمنا ہے۔ موت ہمیں خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ حضرت عکرمہؓ بھی ایسا ہی کہتے تھے عَذَا نَلْقَى الْأَحَبَّةَ مُحَصَّدًا وَحِزْبَةً كُلِّ يَتِيمًا هَمُّهُمْ لِقَاءُ رُسُلِهِمْ مِنْهُمْ لَمْ يَمُوتُوا بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَّ كَلِمَةَ الْغُرُوبِ مِنْهُمْ لَمْ يَمُوتُوا بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ ہمیں موت کا ڈر نہیں۔
 ظاہری طور پر موت بڑی خوفناک چیز ہے۔ مگر مومن اپنے ایمان اور عقل سے سمجھتا ہے کہ یہ یقینی ہے۔ ڈر والی شے نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ابدی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ تو اسے معلوم ہو گا کہ دنیا کی زندگی کتنی حقیر چیز ہے۔

دست و حیات
 کی طلب

ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر دنیا میں کوئی تکلیف پیش آجائے تو اس سے دل برداشتہ ہو کر موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ لِصَبْرٍ نَزَلَ بِهِ كَوْنُ شَخْصٍ مُحَضَّرٍ تَكْلِيفٍ كِي وَجْهِ سَيَمُوتُ كَمَا طَابَ مِنْهُ۔ بلکہ یوں دعا کرے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتْ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّيْ اَللّٰهُمَّ اَجِبْ تَمَنِّيْ مِثْلَ مِثْلِيْ لِيْ بَهْرَتِيْ فِيْ الْمَوْتِ خَيْرًا لِّيْ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو۔ تو وہ دے دے۔

فرمایا يَوَدُّ أَحَدُهُمْ أَنْ لَوْ رُكِبَتْ أَرْبَعُ مِائَةِ سَنَةٍ لَمْ يَمُوتْ لِيَمُوتَ يَوْمَ تَكُونُ السَّاعَةُ۔ کہ ان میں سے ہر ایک تمنا کرتا ہے۔ کہ اگر چار سو سال کی عمر ہو جائے۔ فرمایا اگر ان کی یہ تمنا پوری ہو جائے۔ یعنی انہیں ہزار سالہ زندگی میسر آجائے۔ اس کے باوجود وَمَا هُوَ بِمُزَجَّزٍ مِنْ الْعَذَابِ أَنْ يُقَمَّرَ اتنی لمبی عمر بھی انہیں عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ کیونکہ یہ ضدی اور عنادی لوگ ہیں۔ یہ لوگ کفر میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے قباحتیں اور شرور اکٹھے کر رکھے ہیں۔ اور اپنی روحانیت تباہ کر لی ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا يَفْعَلُونَ بِكُمْ عَلِيمٌ۔ یہ لوگ کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ وہ ان کے عقائد اور اعمال اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ لوگ کسی طرف بھی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ
 اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ
 ۹۷ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ
 فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ۹۸ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ كَبِيرَتٍ ۙ
 وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۹۹ أَوَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ
 فَرَّقَ بَيْنَهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۱۰۰ وَلَمَّا جَاءَهُمْ
 رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَانَهُمْ
 لَا يَعْلَمُونَ ۱۰۱

ترجمہ: آپ کہ دیجئے جو شخص جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے۔ پس بے شک یہ
 (قرآن پاک) اُسی نے آپ کے دل پر نازل کیا، اللہ کے حکم سے۔ یہ تصدیق کرنے
 والا ہے ان کتابوں کی۔ جو اس سے پہلے ہیں۔ اور یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت
 اور خوشخبری ہے ۹۷ جو شخص دشمن ہو، اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے
 رسولوں کا اور جبرائیل کا اور میکائیل کا۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ
 دشمنی رکھنے والا ہے ۹۸ اور البتہ تحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل
 کیں۔ اور اس کے ساتھ نہیں کفر کرتے مگر منافقان لوگ ۹۹ کیا جب بھی انہوں نے
 کوئی عہد کیا۔ اس کو ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ بلکہ ان میں سے اکثر
 ایمان نہیں لائے ۱۰۰ اور جب ان کی طرف اللہ کی طرف سے رسول آیا۔ جو
 تصدیق کرتا ہے۔ اُس چیز کی جو ان کے پاس ہے۔ تو کتاب یافتہ لوگوں میں سے
 ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ۱۰۱

یہودیوں کی خرابیوں کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ آیات زیر درجہ کے شان نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت بنی علیہ السلام کی ہجرت مدینہ کے وقت مدینہ کے گرد و نواح میں بہت سے یہودی آباد تھے۔ یہودی علماء میں سے صرف ایک عالم حضرت عبد اللہ بن سلام ایمان لائے باقی سب محروم ہی رہے۔ ان میں سے ابن صوریہ ایک چشم تھا۔ وہ بعض دوسرے یہودیوں کے ہمراہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آیا۔ اور آپ سے مختلف سوال کیے۔ اُس نے کہا کہ آخری نبی کے خواب سے متعلق ہماری کتابوں میں بعض نشانیاں موجود ہیں۔ آپ اپنے خواب کی کیفیت بیان فرمائیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي یعنی میری آنکھیں تو بیشک سوتی ہیں۔ مگر دل کبھی نہیں سوتا۔ اس کی اُس نے تصدیق کی کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ہماری کتابوں میں بھی نبی آخر الزمان کی یہی نشانی بتائی گئی ہے۔

اس شخص نے دوسرے سوال کیا کہ رحمہ در میں جنس کی تفریق کیسے ہوتی ہے۔ یعنی بچے اور بچی کی پیدائش میں کون سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد کا مادہ مؤنر سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اور عورت کے رحم کی رطوبت زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ فرمایا با شریعت کی بات جس مادہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بچے کی شکل و صورت اس کے موافق ہوتی ہے۔ باقی یہی بات کہ غلبے سے کیا مراد ہے مقدار میں غلبہ ہوتا ہے۔ یا خردن میں سبقت ہوتی ہے۔ یا کسی صفت میں غلبہ ہوتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بتایا کہ مرد اور عورت میں سے جس کے مادہ میں غلبہ ہوتا ہے۔ وہ مشابہت میں بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ بھی آپ نے درست جواب دیا۔ ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ان یہودیوں سے فرمایا کہ جب تم میرے جوابات سے مطمئن ہو تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کہنے لگے ہم ایک اور سوال پوچھیں گے۔ حضرت! یہ فرمائیے۔

کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔ انہیں سب سے پہلے کوئی خوراک پیش کی جائیگی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جہنموں کی اولین خوراک مچھلی کے جگر کا زائد حصہ ہوگا۔ اور پھر دوسرے منبر پر ان کو بیل کا گوشت پیش کیا جائے گا۔ جو جنت کے اطراف میں چرتا ہے یہودیوں نے کہا: کہ یہ بھی آپ نے درست فرمایا ہے۔

اب حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ جب تم نے آخری نبی کی تمام علامتیں پہچان لی ہیں۔ تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ایک بات اور بتائیے۔ کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے، آپ نے فرمایا، مجھ پر جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں۔ وہ کہنے لگے جبرائیل تو ہمارا دشمن ہے۔ اگر وہ وحی لاتا ہے تو ہم اس کو نہیں مانتے۔ ہاں اگر میکائیل وحی لاتا تو ہم مان لیتے۔ کہنے لگے جبرائیل کو دو وجوہات کی بنا پر ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اول یہ کہ یہ قومیں یہ عذاب لاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے ہمارے دشمن بخت نصر کی حمایت کی تھی۔ اس کی تائید انہوں نے یوں بیان کی کہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں بتایا تھا کہ بخت نصر نامی بادشاہ ہمیں تباہ و برباد کرے گا۔ لہذا اُسے پھینک دیں اور دنیا پر غیروں نے اس کی نشانیاں بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ وہ اُن عمر میں فلاں جگہ پر پڑے گا۔ اور فلاں کام کرتا ہوگا۔ چنانچہ ہمارے سرور رب نے بخت نصر کی تلاش میں چاروں طرف آدمی بھیج دیے۔ اور انہوں نے شہر بابل میں انہی نشانوں کے ساتھ بخت نصر کو تلاش کر لیا۔ جب اُسے ہلاک کرنے لگے تو جبرائیل علیہ السلام سامنے آکھڑے ہوئے اور کہنے لگے تم اس کو کیوں مانتے ہو۔ ہم نے کہا کہ یہ ہمارا قاتل ہے۔ اور ہماری تباہی کا باعث بنے گا۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ واقعی قاتل ہے۔ تو تم اُسے ہلاک نہیں کر سکو گے۔ اور اگر یہ تمہارا قاتل نہیں ہے۔ تو خواہ مخواہ خون ناحق کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس طرح جبرائیل علیہ السلام نے بخت نصر کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ وہی بخت نصر جب بڑا ہوا۔ تو اُس نے شام اور فلسطین کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی۔ اور بیت المقدس کو گرا دیا۔ توراہ کو جلا یا یہودیوں کو قتل کیا اور ان کو غلام اور لونڈیاں بنایا۔ چنانچہ یہ لوگ سو سال تک غلامی میں مبتلا رہے اور بڑی ذلت و رسوائی اٹھائی۔

یہودیوں نے کہا کہ جبرائیل علیہ السلام پر ہمارا اور اعتراض یہ ہے کہ یہ آپ کے

ہاں ہماری چغیاں کھاتے ہیں۔ ہماری ساری باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔ لہذا اس کے ذریعے نازل ہونے والی وحی کو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور ان کی گندمی ذہنیت کا رد فرمایا۔ اور بتایا کہ جبرائیل علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ لہذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا کفر کے مترادف ہے۔

جبرائیل، سرف ان تینوں لفظوں کا معنی عبد، بندہ یا مردِ خدا ہے۔ اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ گویا دونوں لفظ مل کر عبد اللہ کا معنی دیتے ہیں۔ اس طرح جبرائیل میکائیل اور اسرافیل کا معنی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوا۔ ان میں عزرائیل کا نام شامل نہیں ہے۔ بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ عزرائیل ملک الموت کا لقب ہے۔

الغرض! جب یہودیوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ كَمَا یَحْكُمُ جِبْرِیْلُ عَلٰی قُلُوبِ الْبَشَرِ فَیَنْزِلُ عَلٰی قُلُوبِ الْبَشَرِ بِرُوحِیِّهِمْ فَیَكْفُرُ بِمَا كَانُوا یَعْمَلُونَ۔ فَیَنْزِلُ عَلٰی قُلُوبِ الْبَشَرِ بِرُوحِیِّهِمْ فَیَكْفُرُ بِمَا كَانُوا یَعْمَلُونَ۔ مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کی دشمنی کا کیا جواز ہے۔

نمودل وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام صورت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ٹیلیفون کا کنکشن مل جاتا ہے یہ خاص قسم کی رو ہوتی ہے جس کے ذریعے پیغمبر علیہ السلام اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ اور اُسے خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ خواب بتا دی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا۔ اور کلام الہی پیش کرتا تھا۔ تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔

نمودل وحی کی
مختلف صورتیں

ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا: کہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا مَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ تَعْلَمُ تَوْسُفُ آپ کے رکے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ ہم حاضر ہوجاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ کو بتایا کہ اب کی دفعہ میں اللہ تعالیٰ کے بہت ہی قریب پہنچ گیا۔ آپ نے دریافت کیا کہ جبرائیل یہ تو بتاؤ کہ تم اللہ تعالیٰ کے کس قدر قریب پہنچ گئے عرصہ کیا۔ کہ میرے اور اللہ کے درمیان صرف ستر ہزار پردوں کا حجاب رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب پہنچ گیا۔ اسی لیے ان کو اللہ تعالیٰ کے مقربین فرشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کو ہر روز اجازت ہوتی ہے کہ جنت کی سرکونڈ میں غوطہ لگائیں۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام ہر روز ایسا ہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے غیر محدود روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے مختلف القاب میں ناموس عظیم، روح عظیم، روح القدس اور روح الامین وغیرہ شامل ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب فرشتے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام یہی حق حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے ہی آتی رہی ہے۔

میکائیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو ستر تکوینی امور کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جیسے بنی نوع انسان کی روزی رسانی اور بارش کا نزول وغیرہ اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام عالم کے فناء کے لیے بھل بجانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور عزرائیل علیہ السلام جن کا لقب ملک الموت ہے وہ جانداروں کی روح قبض کرنے پر ہموار ہیں قُلْ يَتُوفِّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ اُسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

۱۔ بخاری ص ۶۹۱، ۲۔ زجاجة المصابیح ص ۲۰۹، مشکوٰۃ ص ۲۵۹ تفسیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹

۳۔ تفسیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹، ص ۲۵۹ مجموعہ رسائل حضرت شاہ رفیع الدین ص ۳

حریث میں جن چار مائیں عرش فرشتوں کا ذکر ہے۔ وہ یہی فرشتے ہیں۔ قیامت کے دن عرش الہی کو
تھلنے والے آٹھ فرشتے ہوں گے۔ ان چار کے ساتھ چار اور معاون ہو جائیں گے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام
سے دشمنی

الغرض فرمایا۔ سَبَّ عَلَىٰ اسْرَائِيلَ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تمہاری دشمنی جاوہ ہے
قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِیْلَ آپ فرمائیے۔ جو جبرائیل کا دشمن ہے۔ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ
عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ اُس نے تو پر کلام الہی مقابے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل
کیا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتا ہے۔ خواہ وہ پیڑ تمہاری موافقت میں جائے یا مخالفت
میں جائے۔ اور پھر یہ کلام بھی ایسا ہے۔ جو قطعاً تمہاری مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو مصدقاً
لِعَابِیْنِ سَیْدِیْہِ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ سابقہ
کتاب کی تعلیمات کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ دوسرے مقام پر مُصْهِمِناً کا لفظ آتا ہے۔
قرآن پاک سابقہ کتب کا مفسر ہے۔ ان کا پتہ اس آخری کتاب میں آگیا ہے۔ اسی طرح
پہلی کتابوں میں جو مروت ہو چکی ہے۔ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لہذا ایسی پاک کتاب کا اکار
اور اس کے نئے دے سے دشمنی رکھنا کیسے جائز ہے۔ بلکہ یہ تو نہایت ہی فہیم فعل ہے۔
یہ تو ایسی عظیم الشان کتاب لانا ہے۔ جس کے لیے نوع انسان ہمیشہ دعا گو رہی ہے۔ کہ
اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اے اللہ! ہم کو راہِ راست دکھا دے اور اس پر چلا دے
فرمایا یہ کلام ایسا ہے۔ جو کہ وَهْدَىٰ وَبَشَّرَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ہے اس کے ذریعے
اللہ نوع انسان کو ہدایت بخشتا ہے۔ اور پھر اس ہدایت کی روشنی میں جو لوگ ایمان قبول کر
لیتے ہیں۔ ان کے لیے دائمی کامیابی کی بشارت بھی سناتا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے
بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ اہل ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والوں
کو خوشخبری دے دیں۔ کہ کن کن نعمتوں کی خوشخبری اس کا ذکر قرآن پاک نے بار بار کیا ہے۔ کہیں
فرمایا اِنَّ لَهُمْ جَنَّتِمْ جَزَّیْہِ مِنْ جَنَّتِہِمْ الْاٰخِرَہِ ان کے لیے باغات ہیں جن
کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی۔ کہیں فرمایا فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ
مُّقَرَّرٍ وہ اللہ رب العزت کی بیٹھک یعنی اس کے حضور میں بیٹھے ہوں گے، دوسری
جگہ بشارت اس طرح ہے فَاِنْ تَطِيعُوْا اَوْتِیْکُمْ اللّٰہُ اَجْرًا حَسَنًا اگر اطاعت

اہل ایمان کے
لیے بشارت

کر دے، تو اللہ تعالیٰ بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔ بہر حال اس ایمان کو اصلاح اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اب بتاؤ ایسا پاک کلام لانے والے جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی کا کیا معنی ہے۔

فرمایا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں جبرائیل، میکائیل وغیرہ سے دشمنی رکھنا تو خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ گویا یہ لوگ فرشتوں کے دشمن نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے دشمن ہیں۔ فرمایا اگر ایسی بات ہے۔ ترجمہ میں لو کہ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ اللہ تعالیٰ بھی کافروں کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام تو عالم بالا یعنی خلیفۃ القدس کے ترجمان ہیں۔ ان کے ساتھ دشمنی بڑی منجی پڑے گی۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ سے دشمنی کے مترادف ہے۔ لفظ ملائکہ ملوکہ یا لو کہ سے مشتق ہے۔ اور ملوک عربی میں پیغام کو کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت عرب کے قدیم شاعر عدی بن زید عبادی کے کلام سے ملتا ہے۔ اُسے نعمان شاہ عراق نے کسی بات پر خفا ہو کر قید میں ڈال دیا۔ بادشاہ اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ بہر حال اس نے اپنے شعروں میں نعمان کو پیغام بھیجا تھا۔

۱۔ أَبْلِغِ النُّعْمَانَ عَنِّي مَا لَمْ يَكُنْ يَنْتَفِعُ بِرِيٍّ

نعمان کو میرا پیغام پہنچا دو۔ اس نے مجھ کو قید میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کے حکم کا منتظر ہوں۔ کہ کب رہائی ملتی ہے۔ یہ کافی لمبا قصیدہ ہے۔

عرب کے ایک شاعر کے کلام میں بھی ایسا ہی ملتا ہے۔ عربوں میں بہت مشہور تھا۔ اور اُسے عربوں کا ہمارا کہا جاتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا شعر بہت شہرت حاصل کرتا تھا۔ اور پورے عرب میں فورا پھیل جاتا تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام کا زمانہ پرایا ہے۔ وہ شخص ایمان لانے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا تھا۔ کہنے لگا، میں نے مدینہ کے ذریعے اُسے راستے میں ہی روک لیا۔ وہ اپنے گاؤں میں بھی واپس نہ پہنچ سکا۔ بلکہ دورانِ سفر ہی اونٹ سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ وہ بھی کتا ہے۔

۲۔ أَبْلِغِ يُزَيْدَ بَنِي شَيْبَانَ مَا لَمْ يَكُنْ يَنْتَفِعُ بِرِيٍّ

فرشتوں سے
دشمنی اللہ تعالیٰ
سے دشمنی ہے

کتاب اللہ
سہ سو و تری

فرمایا ان کعبتوں کی فطرت یہ بن چکی ہے کہ اَوْ كَلَّمَآ اٰهَمْدُ وَاَعْمَدُ ان میں سے جب بھی کسی نے کوئی عمدہ کیا تَبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک فریق نے اس عمدہ کو توڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ان کی اکثریت ایمان لانے سے قاصر رہی ہے۔ جتنی کہ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ جب ان کے پاس رسول عظیم، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جو اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی زبور، توراہ، انجیل۔ دیگر تمام صحف سماویہ۔ شرائع الیہ وغیرہ۔ تو پھر یہ ہوا کہ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اٰتَوْا الْکِتٰبَ اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ کِتٰبَ اللّٰهِ الَّذِیْ کِتٰبُ کُرْاٰنِ ظٰہِرٍ ہم پس پشت یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراہ سے روگردانی اختیار کر لی۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کتے اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا یا الفاظ کے معنی الٹ دے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کیا کَاٰنَہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ گروہ جاننے ہی نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا پیش گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری رسول علیہ السلام کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا تو وہ دونوں چیزوں کو بلا شک و شبہ پہچان لیتے۔ اس کے بعد یہودیوں کے بحر وغیرہ کا ذکر آئے گا۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ مُّسْلَمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ
وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَائِكَةِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ
يَقُولَا إِنَّمَا فَتْنَةٌ فَنَسَخْنَاهَا فَلَا تَكْفُرُ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ
بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ
عَلَّمُوا الصِّمْنَ أَشْرَهُ مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَدَقٍ نُّسٍ وَلَبِئْسَ
مَا كَسَبَتْ رَايَهُ أَنفُسُهُمْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِبُّوا أَنْ يُعَلَّمُوا ۖ وَلَوِ أَنَّهُمْ
فَعَلُوا لَمِثْلَ مَا عَمِلُوا خَيْرٌ لَّكَ اللَّهُ خَيْرٌ لَّكَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ۱۰۲

فستمہ دینا اور انہوں نے اُس چیز کا اتباع کیا جو شیاطین سیمان (عمرہ السلام) کی بادشاہی میں پڑھتے تھے۔ اور سیمان (عمرہ السلام) نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین کفر کرتے تھے۔ اور لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ چیز جو اتاری گئی تھی بابل کے مقام پر دو فرشتوں (ماروت اور ماروت) پر۔ اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں کہتے تھے: بیشک ہم تو آزمائش ہیں۔ پس تم کفر نہ کرنا۔ پس لوگ ان دونوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے جس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان مہائی ڈالتے تھے۔ اور وہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر اللہ کے حکم سے۔ اور وہ ان سے ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ورفاء وہیں پہنچاتی رہے البتہ تحقیق انہوں نے جان لیا اس شخص کو جس نے اس (سحر) کو خریدا ہے۔ اُس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور وہ بُری چیز ہے جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ اگر ان کو سمجھ ہوتی (۱۰۲) اگر یہ لوگ ایمان لاتے

اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب اور بہتر اجر تھا۔ اگر

بکھتے (۱۰۳)

شیطان کا
اتباع

ان آیات میں بنی اسرائیل کی انتہائی پستی اور ان کے انحطاط کا ذکر ہو رہا ہے۔ گذشتہ آیت میں یہ بات بیان کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طور پر پشت ڈال دیا کہ اُس سے بالکل لا تعلق ہو گئے۔ مگر کیا کہ وہ جانتے ہی نہیں کتاب اللہ کی تلاوت اور اس پر عمل درآمد کی بجائے وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی سطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنوں اور انسانوں کا اختلاط ہوتا تھا۔ کیونکہ جن بھی آپ کے ماتحت تھے۔ لہذا اس دور میں جو کلام یا دیگر چیزیں جن پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان کا اتباع کیا اس طرح کھریا جادو ان اذہن تک پہنچ گیا۔ اسی بات کو اس آیت میں یوں بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل شیاطین جنوں کی تلاوت کی۔ وہ چیزوں کی پیروی کرنے لگے۔ مگر جادو میں ملوث ہو گئے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
یہ جادوگر جو نبی الام

جادو کو شیطانی کھیل جان کر کھیلے بستے تو اور بات تھی مگر بنی اسرائیل نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اس جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا صریح کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا وَمَا كَفَرُ سُلَيْمٰنَ سُلَيْمٰنَ عَلَیْہِ السَّلَامُ نے کفر نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے یہ جادو وغیرہ تمہیں نہیں سکھایا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِیْنَ كَفَرُوْا بلکہ یہ ترشیطانوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ جنہوں نے لوگوں کو جادو سکھایا ہے۔

سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا بنی اسرائیل کو قبیح فعل ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی اور صاحب شریعت رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جن اور شیاطین کو آپ کے مطیع کر دیا تھا۔ اور ہوا کو آپ کے لیے سحر کر دیا تھا۔ فَسَحَرْنَا اَیْنَہُمْ اَیْنَہُمْ آپ ان چیزوں سے حسب مشاکم لیتے تھے۔ وہ کیسے جادو سکھا سکتے تھے۔ اور بن جریر نے ایک روایت

لے تفسیر طبری ص ۵۱۴

بیان کی ہے۔ قَالَ بَعْضُ أَحْبَارِ الْيَهُودِ يَهُودِيَّوْنَ كَمَا لَا تَعْبُدُونَ مِنْ مُحَمَّدٍ لَوْ كُنَّا نَحْمَدُ مُحَمَّدًا لَكُنَّا نَحْمَدُ اللَّهَ الَّذِي أَنْزَلَ دَاوُدَ كَانَتْ نَبِيًّا جَوِيًّا كَتَبَتْ لَهُ كِتَابًا فِيهِ كِتَابُ الْإِسْلَامِ (سیدنا علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ حالانکہ مَا كَانَ إِلَّا سَاحِرًا وَهَجًا جَادًا (جادوگر تھے)۔ گویا یہودیوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ اعتقاد تھا۔ اس لیے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ جو کہ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ الْيَحْرِفَ لُغَةً (لوگوں کا جادو کا علم سکھاتے تھے)۔ اس بات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا صریح کفر ہے۔

مفسرین کرم فرماتے ہیں کہ جادو دُرُودِ نَعَس سے دنیا میں آیا۔ اس کا پسلا ذریعہ توجنات ہیں۔ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو شیاطین سے انسانوں میں رائج ہوا۔ جادو کا دوسرا ذریعہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آذمائش کے لیے دنیا پر بھیجا۔ اسی کے متعلق فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ۔ عام مفسرین نے یہی سمجھا ہے کہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آذمائش کے لیے بابل کے مقام پر اتارا۔ یہ بابل شہر ہی ہے۔ جو کلدانیوں کا دارالسلطنت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں سے ہجرت کر کے آپ شام اور فلسطین پہنچے۔ اور پھر حجاز میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ بہر حال لفظ مَلَائِكَةٍ سے مراد دو فرشتے ہی ہیں کیونکہ مَلَائِكَةُ فرشتے کو کہتے ہیں۔

جادو کے
ذرائع

ہاروت اور
ماروت کون تھے

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام یا کسی اور نبی کے زمانہ میں دنیا پر معصیت عام تھی۔ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے، تو آسمان پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور شہادت کی کہ مولا کریم! تو نے یہ کیسی مخلوق پیدا کی ہے جو اس قدر گناہ میں ملوث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انسان میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں جیسے قوت شنوائی، قوت بصریہ اور قوت غضبیہ وغیرہ وغیرہ اور ان کے ساتھ ساتھ نیکی کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے اس لیے

تم دیکھتے ہو کہ کچھ لوگ اگر گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کچھ نیکی کار بھی ہیں۔ کیونکہ ان کے اندساری قوتیں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے فرشتوں کو میں نے قوت ملکوتی سے نوازا ہے۔ اگر تم تجربہ کرنا چاہتے ہو تو میں تم کو زمین پر بھیجتا ہوں۔ تم اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کرو۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح گناہ سے بچتے ہیں۔ انغرض فرشتوں نے اس آزمائش کے لیے ہاروت اور ماروت کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں قوت شہوانیہ بھی رکھ دی۔ اور پھر انہیں بابل کے مقام پر اتار دیا۔ انہیں خاص طور پر نصیحت کی گئی کہ بُرائی سے باز رہنا۔ زنا اور دیگر معصیت سے اجتناب کرنا اور عدل و انصاف سے وقت گزارنا۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک خوبصورت عورت ایک چھکڑے پر سوار جا رہی تھی۔ اُس نے کسی ضرورت کے تحت منہ سے کپڑا ہٹایا۔ تو اُسے دیکھ کر فرشتے بے قابو ہو گئے۔ یہ ان کی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ انہوں نے اُس عورت سے فرصت میں ملاقات کی خواہش کی۔ جسے اُس نے منظور کر لیا۔ بوقت ملاقات فرشتوں نے اُس سے نفسانی خواہش کی تکمیل کی درخواست کی۔ اُس عورت نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مجھے وہ اسمِ عظیم سکھا دو جسے پڑھ کر تم آسمانوں پر چلے جاتے ہو اور پھر واپس آ جاتے ہو۔ فرشتوں نے اسمِ عظیم اُس عورت کو سکھا دیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے ساتھ یہ لڑکا ہے۔ اس کو قتل کر دو۔ ورنہ یہ ہمارا زنا فاش کر دے گا۔ فرشتوں نے ایسا کرنے سے معذرت کی۔ عورت نے کہا۔ اچھا یہ شراب ہی پی لو۔ یہ بڑی لذیذ چیز ہے۔ فرشتوں نے شراب پی لی۔ پھر نٹے میں آکر انہوں نے لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور زنا کے مرتکب بھی ہوئے۔ گویا سارے معاصی میں مبتلا ہو گئے۔ عورت تو اسمِ عظیم پڑھ کر اُپر چلی گئی کتے ہیں کہ زہر دتا ہے میں جا کر باود ہو گئی اور فرشتے سزا میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ان گناہوں کی سزا دنیا میں بھگتنا چاہتے ہو یا آخرت میں انہوں نے دنیا کی سزا کو پسند کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں کسی تاریک اور عمیق کنوئیں میں ڈال ڈالا۔ آج تک وہ اُسی میں لٹکے ہوئے ہیں ان کے بچے سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اور وہ سخت اذیت پہنچ رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی۔ تو اس وقت وہ اس عذاب سے نجات پائیں گے۔ دیگر اسرائیلی رواتوں کی طرح یہ بھی ایک اسرائیلی روایت ہے

تاجم اس کی سچائی پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہاروت اور روت
کی معنی شناسی

امام ابن منذرؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ ایک موقع پر ایک بوڑھا آدمی عبدالملک بن مردانی کے ساتھ مکے پر بیٹھا تھا۔ نووار دنے تعجب کیا۔ کہ یہ کون آدمی ہے۔ جو خلیفہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے بتایا۔ کہ یہ آدمی ہاروت اور روت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ لہذا اس کی عبرت افزائی کی گئی ہے۔ اُس شخص نے آگے بڑھ کر بزرگ آدمی کو سلام کیا اور عرض کیا حضرت ہاروت اور روت سے ملاقات کا کچھ حال مجھے بھی سناؤ۔ اس پر اس شخص کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اُس نے واقعہ یوں سُنا شروع کیا۔ کہ بھائی! میں ابھی بچہ تھا۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ جسے میں فراضالی سے خرچ کرتا۔ جب باپ فوت ہو گیا۔ تو ماں سے دولت حاصل کرتا اور خوب اُڑاتا۔ ایک دن میں نے ماں سے دریافت کیا۔ کہ ماں یہ تو بتائیں کہ ہمارے پاس یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا۔ جو اتنا خرچ کرنے سے بھی کم نہیں ہوتا۔ ماں نے کہا: بیٹا تم جتنی چاہو دولت لٹاؤ یہ ختم ہونے والی نہیں ہے۔ پھر اُس نے مجھے دولت سے بھرے ہوئے کمرے دکھائے۔ لڑکے میں شعور پیدا ہو چکا تھا۔ اُس نے دوسرا سوال کیا۔ کہ میرے باپ نے یہ مال کس طریقے سے کما لیا تھا۔ ماں نے بتایا کہ تیرا باپ ساحر تھا اور اس نے یہ ساری دولت سحر کی وجہ سے کما لی۔ لڑکے کو خیال آیا کیوں نہ میں بھی وہی چیز لکھ لوں جس کی وجہ سے میرے باپ نے اتنا مال پیدا کیا۔ اُس نے سوچا کہ سحر کا علم اس کے باپ نے اپنے کسی شاگرد کو بھی سکھایا تھا۔ اس کا پتہ کر کے اُس سے یہ علم سیکھنا چاہیے۔ چنانچہ تلاش کرنے پر اُسے ایک شخص مل گیا۔ جو اُس کے باپ کا شاگرد تھا۔ لڑکے نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ کہنے لگا: یہ بڑا خطرناک علم ہے۔ اسے نہ ہی سیکھو تو بہتر ہے لڑکے نے اصرار کیا تو اُس نے کہا کہ اچھا اگر تم ضرور ہی یہ علم سیکھنا چاہتے ہو۔ تو میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ مگر یاد رکھو۔ جہاں ہم جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر خدا کا نام نہ لینا۔

لڑکا بیان کرتا ہے۔ کہ میں اپنے باپ کے شاگرد کے پیچھے ہوا۔ حتیٰ کہ ہم ایک غار پر پہنچے اور اس میں اتر گئے۔ ہم تین سو سیڑھیاں نیچے اترے تو وہاں ایک کنواں نظر آیا۔

کنوئیں کے اندر دو شخص نظر آئے۔ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے ٹک ہے تھے، ان کی شکلیں عجیب
 غریب تھیں، ان کی آنکھیں ڈھال کی طرح بڑی بڑی اور بڑنی چمکدار تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل
 میں خوف پیدا ہوا اور میری زبان سے بے ساختہ کلمہ **لا الہ الا اللہ** نکل گیا۔ یہ کلمہ سن کر وہ شخص
 اور زیادہ مضطرب ہوئے۔ میں پھر گھبرایا اور میرے منہ سے پھر وہی کلمہ نکلا۔ دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا
 تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر میں نے ان سے
 پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور اس حال میں کس وجہ سے ہو؟ _____ اس پر
 انہوں نے بتایا کہ ہم ہر دوت اور مار دوت ہیں۔ اور یہاں سزا بھگت ہے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا
 کہ تم کس امت میں ہو۔ تو میں نے بتایا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہوں۔
 انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آخری نبی کا ظہور ہو گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔
 انہوں نے کچھ علامتیں بھی دریافت کیں۔ جو میں نے ان کو بتائیں۔ وہ دونوں بعض علامات
 پر خوش ہوئے۔ اور بعض پر ناراض ہوئے۔ میں نے س کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ ہم ان
 علامات پر خوش ہوئے ہیں، جو قرب قیامت سے متعلق ہیں کیونکہ قیامت برپا ہونے پر
 ہم اس عذاب سے رہائی پالیں گے۔

الغرض! وہ لڑکا اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی وجہ سے سحر سے تو محروم ہو گیا، تاہم
 اسے حقیقت معلوم ہو گئی۔ اور وہ ہر دوت اور دوت کا عینی شاہد بن گیا۔

ہر دوت اور دوت
 کے دوقوعے ٹکڑے

بعض مفسرین کرم فرماتے ہیں: **وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ
 وَصَارُوتَ** میں لفظ **ہا** فیہ ہے یعنی بابل کے مقام پر ہر دوت اور دوت پر کوئی چیز نہیں
 اتاری گئی۔ یہ سب جھوٹے قصے ہیں جو بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ان مفسرین کی ذاتی تخیل ہے
 بعض اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر دوت اور دوت کا سارا قصہ کہانی محض ہے چنانچہ
 بشرا بن برد شاعر سے کسی نے پوچھا کیا آپ نے ال سیمان سادات خاندان کے متعلق بھی
 کوئی قصیدہ لکھا ہے؟ یہ اپنے رعبے کا شاعر تھا۔ کہنے لگا۔ اُس خاندان کے متعلق کچھ زیادہ

ترنیں لکھا۔ عرف یہ دو شعر کہے ہیں:

وَيْتَارُ الْسَّيْمَانَ وَدِرْهُمْهُمْ
لَا يُرْجِيَانِ وَلَا يُرْجَى لَوْ الْهَمَامَا
کَبَا بَلَّتَيْنِ حَفَا بِالْعَفَارِ يَت
کَمَا سَمِعْتَ بِهَارُوتَ وَمَارُوتَ
آل سیمان بڑے کنجوس لوگ ہیں۔ ان کے درہم و دینار الے ہیں۔ جیسے دو بابیوں کے ارد گرد
بہت سے محبت جمع ہوں۔ اور وہ کسی کو نظر بھی نہ آئیں۔ اس طرح آل سیمان کامل و دولت
بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔ نہ ان سے کسی عیٹے کی توقع ہے۔ اور نہ ان کے درہم و دینار کو دیکھنے
کی امید۔ ان کی دولت ایسے ہی ہے جیسے تم نے ہاروت ماروت کا نام تو سن رکھا ہے۔
مگر ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ غرضیکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو ہاروت ماروت کے قصے کو
افسانے زیادہ حیثیت نہیں دیتے

سحر کی ہے

آہم اکثر مفسرین کہتے ہیں۔ کہ ہاروت ماروت فرشتے تھے۔ اگرچہ ذہرہ والا واقعہ
مصدقہ نہیں ہے۔ مگر ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے سحر کا علم دیکر نازل کیا تھا۔ تاکہ سحر اور
معجزے میں فرق قائم کیا جاسکے۔ لغوی اعتبار سے سحر کا معنی لطیف، باریک یا مخفی شئی ہے۔
سحر میں چونکہ کوئی چیز ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اُسے سحر کہتے ہیں۔

سحر کا دوسرا معنی خذل ہے۔ جب انسان کوئی بھی غذا کھاتا ہے تو ہضم ہو کر باریک باریک
رگوں کے ذریعے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتی ہے۔ یہ لطیف بھی ہوتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ گویا
اس میں افکار اور پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ایک مشور شاعر امر القیس کا کتبہ ہے
اُرَانَا مُوَضِّعِينَ لَا مَرِ عَيْنُیْ وَنَحْصُرُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں مگر کسی ایسی منزل کی طرف۔ جس کا ہمیں علم
نہیں۔ یعنی پردہ غیب میں ہے اور اُدھر ہم پر کھانے پینے کے ذریعے سحر کیا جاتا ہے۔ یعنی
خوراک کھا کر ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جسم میں تیز رفتاری سے سواریاں دوڑا رہے ہیں۔
جسم کی شینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہے گویا ہزاروں میل کی رفتار سے چلنے والے ہوئی جہاز

سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے۔ لیکن یہ سب کچھ پردہ غیب میں ہے۔

اسی طرح ایک شخص یوں کہتا ہے۔

لے فَإِنْ تَنَلَيْتَنَا فَيَمْنَعُ غَنُّ قَانَا عَصَافِيٍّ مِنْ هَذَا الزَّانِمِ الْمُسَحَّرِ

اگر تو ہم سے پرچھے کہ ہم کس حال میں ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ ہم تو سحر زدہ مخلوق میں سے چڑیوں کی مانند ہیں۔ جو کھانے پینے کے ذریعے اڑتے پھرتے رہتے ہیں۔

عربی زبان میں سحر کا ایک معنی پھیپھڑا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی مخفی ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ لہذا اس لحاظ سے بھی سحر میں اخفا کا معنی پایا جاتا ہے۔

کیا ہاروت ماروت
انسان تھے؟

بعض فرماتے ہیں کہ ہاروت ماروت فرشتے نہیں۔ بلکہ انسان تھے اور نیک آدمی تھے ان کے متعلق رَجُلَيْنِ صَالِحَيْنِ کے لفظ آتے ہیں۔ وہ بابل میں رہتے تھے۔ اور سحر کا علم جانتے تھے تاہم جب وہ لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے۔ تو انہیں خبر دیا بھی کرتے تھے کہ یہ علم اچھا نہیں ہے۔ اس سے بچ جاؤ تو ستر ہے۔ ورنہ ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ کیونکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا کفر میں داخل ہے۔ تاہم اس علم کے نزول میں کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ یہ ایک علم ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہاروت ماروت مَلَکَيْنِ (فرشتے) نہیں۔ بلکہ مَلَکَيْنِ یعنی بادشاہ تھے۔ اور بڑی سلطنت کے مالک تھے۔ ان کے پاس یہ علم تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مَلَک کا اطلاق فرشتوں کے علاوہ نیک آدمیوں پر بھی ہوتا ہے جیسے سیدہ یوسف میں مَلَک کا لفظ یوسف علیہ السلام کے لیے بھی بولا گیا ہے اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ وہ انسان نہیں بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

امام ابو منصور ماتریدیؒ اور ابوالحسن اشعریؒ تیسری چوتھی صدی کے بلند پایہ اہم گزشتے ہیں۔ یہ اہم عظیم گزشتے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ آپ بڑے حکم ہیں اور علم کلام میں آپ کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ سحر کو مطلقاً کفر کنا دست نہیں۔ کیونکہ اسکی

بعض قسمیں کفر ہیں۔ بعض فسق اور بعض بدعت۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بھی اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ سحر اُسی صورت میں کفر ہے جب کہ اس میں کفریہ یا شرکیہ کلمات پائے جائیں مثلاً استعانت باشیاطین ہو یا مافوق الاسباب ذرائع سے مدد طلب کی جائے۔ تو ایسا سحر کفر ہوگا۔ کیونکہ غائبہ استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے روا ہے۔ کسی دوسرے سے طلب نہیں کی جاسکتی۔ اِیَّاكَ فَكْبَدُوْا اِیَّاكَ تَسْتَعِيْنُ کا یہی مطلب ہے کہ مافوق الاسباب استعانت اُسی ذاتِ خداوندی سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسی استعانت خواہ شیاطین سے ہو۔ کوکب سے ہو۔ اَصْنَام یا بتوں سے مطلوب ہو۔ سب مشرک میں داخل ہے۔ ارواحِ نجسہ کی تعظیم غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا۔ یہ بھی کفر و شرک میں داخل ہے۔ اگر ایسا کرے گا، تو یقیناً کفر کا مرتکب ہوگا۔

اگر سحر میں پڑھے جانے والے کلمات شرکیہ نہ ہوں بلکہ مباح یا جائز کلام ہو۔ تو پھر اس کی حیثیت مختلف ہوگی۔ اگر اُس سحر کے ذریعے کوئی خلافِ شرع کام مطلوب ہے۔ کسی کی ایذا رسانی مقصود ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ سحر فسق اور معصیت ہوگا۔ اور اگر سحر کے کلمات بھی مباح ہیں۔ شرکیہ نہیں ہیں۔ اور اس سے غرض بھی فاسد نہیں ہے۔ خلافِ شرع نہیں ہے۔ تو اس صورت میں سحر تو بہر حال ناجائز ہوگا۔ مگر اسے زیادہ سے زیادہ بدعت کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اُسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم یہ کفر و شرک کے زمرہ میں نہیں آئے گا اور اگر کلمات مباح ہیں۔ ایذا رسانی بھی مقصود نہیں اور مطلوب کام بھی جائز ہے تو اس کو سحر نہیں کہیں گے۔ بلکہ اس کو عام اصطلاح میں عملیات اور عزیمت کہتے ہیں۔ جھاڑ پھونک، گنڈا تعویذ وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں۔

فقہاء اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اگر جادو کے نتیجے میں کسی کی جان ضائع ہو جائے تو اس کے بدلے میں ساحر کو قتل کر دینا چاہیئے۔ اگر سحر کی وجہ سے جان بچ گئی ہے۔ کوئی دوسرا نقصان ہو رہا ہے۔ تو نقصان کی مناسبت سے ساحر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

جادوگر کی سزا

ساحر کو پکڑنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب تک مکمل ثبوت نہ ہو کسی پر جادو کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم اگر ایسا ممکن ہو یا ساحر خود اقرار کر لے تو پھر مذکورہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ بشرطیکہ ثبوت بھی اسلامی ہو۔

امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اگر ساحرہ عورت ہو تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مردہ عورت کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی۔ بلکہ اُسے قید میں رکھا جاتا ہے اسی طرح ساحرہ کو بھی قید کر دیا جائے گا۔ البتہ بعض ائمہ عورت کو بھی قتل کرنے کے حق میں ہیں۔ اگر ان فی جان کے تحت سے کم تر نقصان ہوا ہے۔ یعنی محض ایذا رسانی کا ارتکاب ہوا ہے۔ تو ساحر کو وہی سزا دی جائے گی۔ جو ذکیمتی کے مقدمہ میں دی جاتی ہے۔ قرآن پاک نے ڈاکو کے لیے چار قسم کی سزائیں مقرر کی ہیں۔ یعنی سولی پر لٹکانا، قتل کرنا، اٹلے سیدھے ہاتھ اور پاؤں کاٹنا، اور جس معنی قید میں ڈال دینا۔ لہذا ساحر کو بھی اُس کے جرم کے مطابق اسی قسم کی سزا دی جائے گی۔

میاں بیوی
میں جہائی

بہر حال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا يَعْلَمَنَّ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا
إِنَّمَا غَنُ فِتْنَةً فَلَا تَكْفُرُ وہ دونوں جہاد و فتنہ کا علم رکھتے ہیں۔ تم یہ کھڑ نہ کرو۔ اگر ایسا
کرو گے تو ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ مگر اس کے باوجود لوگ اُن سے جادو کا علم سیکھتے تھے۔
جن میں اہل کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا اور وہ ان فرشتوں
سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے مَا يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْمُرِّ وَالْحَلْوِ وَكَوْجِبَهُ جن کے
ذریعے وہ میاں بیوی میں جہائی ڈال دیتے تھے۔ یہ ایسا برا عمل ہے۔ جس پر شیطان بہت زیادہ
خوش ہوتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ تاہم کچھ بھی ایک فن ہے۔ جس طرح
دیگر فنون میں جیسے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ وغیرہ وغیرہ۔

نافع اور
ضار علم

فرمایا اگر جادو ایذا رسانی کا ذریعہ ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔ کہ وَمَا
هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ایسا عمل کرنے والے ساحر

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر از خود کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم جادو کرنا، اس پر یقین رکھنا، چونکہ قیامت سے خالی نہیں۔ یہ معجزہ ہے۔ مفید نہیں۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَلَمٍ لَا یَنْفَعُ اِنَّ اللّٰهَ اَمْرٌ یُّنْفَعُ بِہِ الْعَالَمِیْنَ۔ جو نفع مند ہو۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ عَلَمٌ یُّنْفَعُ عَنِیْ اِنَّ اللّٰهَ اَمْرٌ یُّنْفَعُ بِہِ الْعَالَمِیْنَ۔ جو نفع بخش ہو۔ دنیا میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آخرت میں بھی فائدہ مند ہو۔ اسی بات کو فرمایا وَیَعْلَمُوْنَ مَا یُضِرُّہُمْ وَلَا یَنْفَعُہُمْ یہ لوگ ایسا ہی علم دیکھتے ہیں۔ جو نفع کی بجائے انہیں نقصان پہنچاتا ہے۔

فَرِیَّا وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰہُ مَا لَہُ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَدَقٍ نَّظَرٌ
یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے اس علم کے ذریعے کیا خریدا ہے۔ یہ لوگ یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ کہ آخرت میں ساجر کو اس علم کا کیا فائدہ ہوگا وہ تو اٹا عذاب میں مبتلا ہوگا۔ خاص طور پر اگر اس نے ایسا جادو کیا ہے۔ جس میں کفر و شرک پایا جاتا ہے۔ تو وہ یقیناً آخرت سے محروم ہے گا۔ اگے فرمایا وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِہِ اَنْفُسُہُمْ انہوں نے بہت ہی بُری چیز کے بدلے میں اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ ان کا یہ سودا بہت ہی خسارے کا سودا ہے۔ لَوْ کَانُوا یَعْلَمُوْنَ اگر ان میں کچھ بھی سمجھ ہوتی تو ایسا کام نہ کرتے۔

یہودیوں سے
موافقت

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہودیوں کی بد اعمالیوں کا ذکر فرمایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امت محمدیہ کا حال بھی اُن سے زیادہ مختلف نہیں ہے جب لوگ اللہ تعالیٰ کے دین سے غافل ہو جائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تنہی دامن ہو جائیں۔ تو پھر پستی کی طرف ہی جانا ہوگا۔ آج انڈیا پاک میں دیکھ لیں۔ دیگر ممالک پر نظر ڈال لیں۔ ہر طرف گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب الہی کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور دین کے لیے سعی و جہد کو ترک کر دیا گیا ہے۔ دین کا دار و مدار

عملیات پر رہ گیا ہے۔ اس کام کے لیے یہ عمل کر لو۔ اس کام کے لیے وہ وظیفہ کافی ہے علم و عمل ختم ہو چکا ہے۔ علمائے حق کا ایک مہم سارا ٹھمکا ہوا ہے۔ دوزخ ساری دنیا کفر و ضلالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی طرح ہماری امت میں بھی حق و باطل غلط و صحیح ہے۔ صحیح اور غلط کی پہچان ایک عام شخص کے لیے مشکل ہو چکی ہے۔ دیہات میں حالات اور بھی خراب ہیں جہاں کے اہم کے فرائض میں نماز پڑھنا بھی ہے۔ اور مرنے کو غسل دینا بھی۔ بچے کی پیدائش پر کان میں اذان بھی دینی کہتا ہے۔ حقیقتہً کے لیے جانور ذبح کرنا ہو۔ تو اہم صاحب کو بلایا جاتا ہے۔ اور اگر تعویذ گنڈے کی ضرورت پڑ جائے تو بھی میاں صاحب دیں گے، ان کا علم خطبہ جموعہ تعارفی مسائل تک ہوتا ہے۔ دین کے علم سے بچے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ غرض یہ حالت یہودیت سے مشابہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت بھی پہلے لوگوں کے نقش قدم پر بالکل اسی طرح چلے گی۔ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

بعض علاقوں میں چار چار بکروں کا ایک ہی اہم ہے۔ بلکہ ہم نے خود غنم میں ملاحظہ کیا۔ کہ ایک علاقہ میں چار سات گاؤں کا ایک ہی اہم تھا۔ کہیں نکاح کرنا ہو۔ جنازہ پڑھنا ہو۔ وہی مولوی صاحب انجام دیں گے۔ تعویذ گنڈے کا کاروبار چل رہا ہے۔ نقش سلیمانی والی کتابیں ہیں۔ لکھنؤ والے کی کتاب نفع المخلوق ہے۔ یہ تعویذ گنڈے والی دہلوی کی کتاب۔ فائدہ ہے۔ کسی مسئلہ کا حل غلوب ہو۔ کتاب کھول کر معلوم کر لو۔ حتیٰ کہ چوری تک کی تفتیش عملیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ کالاعلم جھاڑ چنوک وغیرہ سفلی عملیات ہیں۔ یہی چیزیں یہودیوں میں رائج تھیں اور آج ہم میں بھی یہی پائی جاتی ہیں۔ بعض صحیح و خالص بھی ہیں۔ جیسے سورۃ یسین کا ورد ہے۔ سورہ منزل کی روزانہ تلاوت ہے۔ رزق کی فراوانی کسی جائز چیز کے حصول یا کسی مصیبت سے رہائی کے لیے کسی کو کوئی اچھی بات بتادی۔ مگر عام طور پر یہ گنڈے تعویذ یہودیوں والے ہیں۔ ذرا کھوم پھر کے دیکھ لیں۔ ماہرین عملیات کے ہاں خورتوں کی جبر ہے کوئی نہیں دیکھا کہ مقصد جائز ہے۔ یا ناجائز کھرے یا شرک۔ سب ایک ہی گاؤں میں

سوار چلے جائے ہیں۔ یہی یہودیت کی موافقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَآتَيْنَهُم مِّنْ لَّدُنَّا فَجْوَاجٍ
 کی بجائے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ شرک و بدعات سے اجتناب کھیتے
 لَمَثُوبَةٍ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ تُوَاهِ اللہ تعالیٰ کے بہتر اجر و ثواب کے مستحق
 ہوتے۔ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ اگر انہیں علم ہوتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا
وَالْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۴۳ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ
رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصِرُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ۝۱۴۵ مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا
أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۴۶
أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ
مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝۱۴۷

ترجمہ: اے ایمان والو! امت کو راعی بلکہ کو نظرنا اور سنو اور کفر کرنے

والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۝۱۴۳ اہل کتاب اور مشرکین میں سے

جنہوں نے کفر کیا، وہ نہیں پسند کرتے، کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی

بھلائی اتاری جائے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں

کہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۝۱۴۵ جو ہم کسی آیت کو

منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی

آتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۝۱۴۶

کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اس کے سوانہ کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار ۝۱۴۷

رابطہ آیات

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی پستی اور غلطی کا ذکر تھا۔ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی

کتاب کو پس پشت ڈال دیا، دین کی سر بلندی کے کام کو ترک کر دیا، جہاد سے منہ موڑ گئے

اور سحر جادو کرنے لڑنے لگے جیسے سفلی اعمال کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ انہوں نے ان برائیوں

خاص طور پر سحر کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کیا۔ جو کہ ان کی ذلت کا انتہائی درجہ تھا۔
 ان آیات میں اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کی اخلاقی بستی کا ذکر فرمایا ہے جس کے
 ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو ذہنی تعلیم پہنچاتے تھے۔ یہودیوں نے اپنی
 اس ذلیل حرکت کا ارتکاب نہ صرف سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں کیا۔ بلکہ حضور
 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں بھی اس حرکت سے باز نہ آئے۔ اور آپ
 کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس حرکت کا تذکرہ کر کے
 اہل اسلام کو خبردار کیا۔ کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے معاذ اللہ نبی علیہ السلام کی توہین
 کا پہلو نکلتا ہو۔

بنی اسرائیل کی
 اخلاقی بستی

اس مقام پر جس خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہودی آپ کی
 مجلس میں آتے تھے۔ تو آپ کی توجہ بند دل کرنے کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے
 جو کہ اُنْظُرْنَا کا ہم معنی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری رعایت کریں یعنی ہماری طرف
 توجہ فرمائیں۔ اُنْظُرْنَا کا معنی بھی یہی ہے آپ ہماری طرف دُعا دیجیے، نظر کریں۔ ہماری بات
 غور سے سنیں۔ بظاہر دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے۔ مگر یہودی اپنی گندی ذہنیت کے
 اظہار کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اور پھر اس لفظ کو کھینچ کر اور گھما کر رَاعِنَا
 بولتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ لَيْتَا يَا لِسِنَّتِهِمْ زَبَانٌ مِّنْ بَیْرِ بَحْرِ کر کے لفظ لَوَا
 کرتے تھے جس کی وجہ سے رَاعِنَا کہتے۔ یعنی ہمارا چہرہ ادا۔ مزید برآں یہودیوں کی زبان میں
 یہ لفظ گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کا معنی احمق اور بیوقوف ہے۔ گویا اس طرح یہ
 لوگ اپنی گندی ذہنیت کا اظہار کرتے تھے۔

مذہب جلیل شہر علیہ السلام
 کی طرف سے

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا کہ تم اہل کتاب کی پیروی نہ کرنا۔ ارشاد ہوتا ہے
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ۖ اٰیْمَانُ وَالْوَاۡجِبُ اَنْ تَعْبُدُوْا اللّٰهَ وَرَبَّکُمْ ۚ وَتَعْلَمُوْا
 اپنی طرف مبذول کرنا چاہو۔ تو رَاعِنَا کا لفظ استعمال نہ کرو کیونکہ اس سے لغو ذبا اللہ نبی علیہ السلام

کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور نبی کی توہین کفر کے مترادف ہے۔

سورۃ مجادلہ میں یہودیوں کی ایک اور قبیح حرکت کا بھی ذکر آتا ہے جب یہ بد بخت حضور علیہ السلام کی مجلس میں آتے تھے تو السلام علیکم کی بجائے السّام علیکم کہتے تھے۔ سام کا معنی موت یا ہلاکت ہے۔ گویا السلام کا لفظ جگاڑ کر السّام کہتے تھے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ جب یہودی سلام کریں ان کے سلام کا جواب دے علیکم السلام کی بجائے صرف علیکم دیا کرو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جو کچھ تم نے کہا۔ وہ تم پر ہی ہو۔ یعنی اگر السلام کی بجائے السّام بولا جائے۔ تو یہ ہلاکت تمہیں نصیب ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی حرکت کے متعلق فرمایا حَتَّىٰ تَبْصُرَ لَكُمْ يُحْيِيكَ بِهِ اللَّهُ تَبِيعَ لَكُمْ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو متنبہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کریں۔ جس سے آپ کی شانِ اقدس میں فرق آنے کا احتمال ہو۔ وَقُولُوا انْظُرْنَا وَرَاعِنَا کی بجائے انْظُرْنَا کہو۔ یعنی ہماری طرف نظر کر م فرمائیں۔

اہل ایمان
کو خطاب

سورۃ بقرہ میں یہ پہلا موقع ہے جس میں اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ہم لوگوں کو خطاب ہوتا رہا ہے۔ جیسے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ۔ اے نوح انسان! اپنے رب کی عبادت کر۔ یا بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا يٰبَنِي إِسْرَءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ یعنی اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔ اب یہاں سے اہل ایمان سے خطاب ہو رہا ہے۔ اور پورے قرآن پاک میں اٹھائی مرتبہ اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ شاد عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب سماویہ میں اہل ایمان سے براہِ راست خطاب نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہوتا تھا۔ جو آگے اپنی اپنی امت تک پہنچا دیتے تھے۔ یہ صرف آخری امت کو شرف حاصل ہوا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اہل ایمان کو خطاب کیا ہے۔

زائد منہ اندھ میں یہ رویت ہے۔ اور امام بیہقی نے اسے شعب الایمان میں بھی بیان کیا ہے۔
 کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ بحضور! مجھے کوئی نصیحت
 فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ اے عبداللہ! جب تم قرآن میں یہ خطاب پڑھو **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**
 تو پورے دل کے ساتھ متوجہ ہو جایا کرو۔ یہ سمجھ لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم سے براہ راست خطاب فرماتا
 ہے۔ اس سے بڑی نصیحت اور وصیت کیا ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ ایسی اعلیٰ چیز ہے کہ
 پوری توجہ کے ساتھ سمجھ کر گوش ہو کر سنا کر کہ اللہ تعالیٰ کیا حکم فرما رہے ہیں۔ کس چیز کے کرنے کا
 حکم ہے۔ اور کس چیز سے رُک جانے کی بات ہے۔

غرض! اس خطاب میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی توجہ بند دل کھٹنے
 کے لیے **رَاعِنَا** کا لفظ استعمال نہ کرو کہ **اِنْظُرْنَا** سے خطاب کیا کرو اس خطاب میں
 امر اور نہی دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاکید فرمادیا **وَأَسْمَعُوا** یعنی جو حکم ہو
 رہا ہے۔ اُسے خوب غور سے سنو۔ کیونکہ یہ ایک بڑا اہم حکم ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ عام گفتگو میں مشتبہ الفاظ استعمال نہ کرو۔ کوئی شخص اپنے
 غلام یا لونڈی کو عبیدی اور اہلی کہہ کر نہ پکارتے۔ لفظ **عَبْد** سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ
 پتہ نہ ملے والا شاید اپنے آپ کو موجود سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ موجود تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے
عَبْد کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے مگر معاملہ بالکل واضح ہونا چاہیے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں رہنا
 چاہیے۔ اسی طرح لونڈی کو بندی کہہ کر پٹانے کی بجائے لونڈی کہہ کر پکارو۔ غلام اور لونڈی کو
فَتَا اور **فَتَاة** کہہ کر بھی بلایا جاسکتا ہے۔ یعنی اے جوان یا اے لونڈی۔ حضور علیہ السلام نے
 فرمایا۔ عبید کا لفظ اس لیے مناسب نہیں کہ **كُلُّكُمْ عَبِيدُ اللَّهِ** کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندے
 ہو۔ اسی طرح ساری عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں۔ یہ کسی انسان کے بندے یا بندیاں نہیں ہیں۔
 لفظ **مَوْلَى** بھی مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کو بلا تخصیص ہر جگہ استعمال کرنا
 اشتباہ پیدا کر سکتا ہے۔ مولا کے کئی معنی ہیں جیسے دوست، صاحب، آقا، غلام، غلام

مشتبہ الفاظ کے
 استعمال کی ممانعت

آزاد کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی کہ اس لفظ کو غلط طور
 مت استعمال کرو۔ جس سے شبہ پیدا ہوتا ہو۔ مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام
 نے فرمایا لَا تَقُولُوا لِلْعَنْبِ الْكَرْمُ یعنی انگور کو کرم مت کہو بلکہ عنب کہو یا جلد کہہ سکتے ہو۔
 اس کی وجہ یہ ہے کہ کرم تو مومن کا بدلہ ہے جس میں ایمان پایا جاتا ہے۔ اور جس میں اخلاقِ حسنہ
 ہوتے ہیں۔ ایسی چیز کو انگور کے معنوں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ انگور سے عام طور پر شراب
 تیار کی جاتی ہے۔ جب لوگ شراب کی تعریف کرتے ہیں تو اس میں جب کرم کا نام آتا ہے
 تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شراب کرم یعنی بخشش اور فیاضی سے کشیدہ کی گئی ہے۔ گویا اس
 لفظ سے بالواسطہ شراب کی تعریف ہوتی ہے۔ لہذا انگور کے لیے کرم کا لفظ استعمال کرنے
 سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
 کے لیے لفظ لیدر
 کا استعمال درست
 نہیں

لیدر کا لفظ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی راہنمائی کرنے والا ہے۔ بلاشبہ پیغمبر بھی امت
 کی راہنمائی کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ ہے جو ہر قسم کے راہنما کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
 عام طور پر اس کا اطلاق سیاسی لوگوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی اقدار اور دیانہ داری سے بے بہرہ
 ہوں اور خواہ ان کی فکر بھی فاسد ہو۔ اہل اسلام میں سے ہوں یا غیر مسلم متقی ہوں یا فاسق فاجر
 یہ لفظ سب کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی طور پر یہ لفظ چرچل، برٹنٹ
 ٹریگال، ریجن وغیرہ قسم کے لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہذا اس قسم کا مشتبہ لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ
 وسلم کے برگزیدہ شاہانِ شان نہیں۔ ہمارے زمانے کے بعض مفسرین نے اپنی تصانیف میں یہ لفظ
 حضور علیہ السلام کے لیے استعمال کیا ہے۔ جو قطعاً نامناسب ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا
 کہ مشتبہ لفظ کسی عام چیز کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے چہ جائیکہ خود حضور والا صفات علیہ السلام
 کی ذاتِ اقدس کے لیے ایسا لفظ بولا جائے۔ پیغمبر کے لیے انگریزی کے مقببول الفاظ
 MESSENGER (پیغمبر) پرافٹ (PROPHIT) وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

الغرض فرمایا کہ نبی علیہ السلام کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرو جو آپ کی شان کے خلاف ہو یا اگر
 کوئی ایسا کرے تو یاد رکھو کہ لَعْنَةُ الْكَافِرِینَ عَذَابٌ أَلِيمٌ کہ کافر کے دلوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب
 تیار کر رکھا ہے۔

فَرِیَا مَا یَعِدُّ الذِّیْنَ کَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْکِتَابِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ أَنْ یُنَزَّلَ
 عَلَیْکُمْ مِنْ خَیْرِ مَنْ رَّبِّکُمْ کَمَا أَهْلُ کِتَابٍ مِنْ سِوَا یَاسُورِیْنَ مِیْنِ سِیْ
 نَہِیْنِ لَیْذِ کَرْتِیْ۔ کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بہتری کی چیز اتاری جائے۔ مشرکین کو
 میں ابولہب، ابوسب، عتبرہ اور شعیبہ جیسے بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ حضور علیہ السلام سے حسد
 کرتے تھے۔ کہ اگر وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے تو ان کی سرداری حضور علیہ السلام کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اور وہ
 بزعم خویش ناپتیز ہو کر رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف اہل کتاب تھے جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ نبی
 آخر الزمان بنی اسرائیل میں آئے گا۔ جب آخری نبی ہونے کا دعویٰ بنو اسماعیل کے قبیلہ قریش
 میں سے ہوا۔ تو وہ بھی حسد کی آگ میں جلنے لگے لہذا انہوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی تسلیم
 کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی رکوع میں آگے آئے گا حَکْدًا مِّنْ عِنْدِ انْفِہِہُمْ
 انہوں نے حسد کیا اور ایمان کی دولت سے محروم ہے اسی لیے فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین
 نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک آپ پر نازل ہو۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں پر تمہاری خواہشات اور
 توقعات کی بات نہیں بلکہ واللہ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَن یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْخَیْمِ اللّٰہُ
 ہے چاہے اپنی رحمت کیلئے ماس کیلیت ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس نے یہ پند کیا کہ اپنی رحمت
 خاصہ بنو اسماعیل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر نازل فرمائے۔ اس سے پہلے
 اللہ تعالیٰ بنو اسماعیل پر بے شمار رحمتیں نازل کر چکا ہے۔ اس قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور
 جلیل القدر رسول بھیجے۔ اِذْ جَعَلْ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَ فِیْکُمْ مِّنْکُمْ کَاذِبًا
 تفصیلی تذکرہ کسی گزشتہ درس میں گزر چکا ہے۔ اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی
 مبعوث فرمائے۔ اور کتنوں کو بادشاہت بھی عنایت کی۔ ایسی حکومت اور بادشاہت
 جو دنیا میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ تو اب کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے۔
 کہ نبوت بنو اسماعیل سے باہر نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں ہے کہ سلسلہ نبوت

کو بنو اسماعیل پر ختم کرنا تھا۔ لہذا اس میں بنو اسحاق کے لیے حصہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

تینسج آیات
کی وجوہات

بنی اسرائیل اور شرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ پہلی کتابوں کا حصہ ق بھی ہے۔ تو پھر یہ سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر کے نئی تربیت کیوں نافذ کرتا ہے۔ نیز پہلے ہی احکام کو بعض اوقات تبدیل کر دیتا ہے۔ بقول ان کے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ معاذ اللہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو معاملے کا پوری طرح علم نہیں ہوتا تو حکم جاری کر دیتا ہے۔ پھر جب اس کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔ تو حکم میں ترمیم کر دیتا ہے۔

دیانندہ سرسوتی ہندوؤں کی آریہ سماج تنظیم کا مشور لیڈر ہوا ہے۔ اپنی نوعیت کا شہرت پسند آدمی تھا۔ یہی اعتراض — اُس نے اپنی کتاب میں بھی کیا تھا کہ کسی پٹنے ہی حکم کو منسوخ کر دینا جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیا تھا کہ احکام کی تینسج جہالت کی بنا پر نہیں بلکہ حکمت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عظیم و حکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حکم حالات کے تقاضوں کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ جب حالات متقاضی ہوتے ہیں۔ تو پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو صبح کے لیے اور دوا دیتا ہے اور شام کے لیے دوسری۔ یا ایک ہفتہ ایک دوا استعمال کرتا ہے تو دوسرے ہفتے کے لیے کوئی اور تجویز کرتا ہے۔ کیا ڈاکٹر یا قوف ہے یا جاہل جو مختلف اوقات کے لیے مختلف دوا تجویز کرتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مریض کے حالات کے مطابق دوا کو منسوخ کر دیتا ہے یا تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کسی قوم کے حالات کے تقاضے کے مطابق احکام نازل فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض احکام کو تبدیل کر دیتے ہیں یا اپنی حکمت کی بنا پر احکام میں ترمیم کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ تمام اقوام کے لیے یہاں طور پر نافذ العمل ہے۔ لہذا اس نے

پہلے شرائع کو منسوخ کر کے ابدی احکام نافذ کر دیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ یہ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ البتہ مختلف شرائع میں بعض اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً کسی شریعت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ہماری شریعت میں حلال ہے۔

کسی شریعت میں درگئی بنیں ایک نسخ میں آ سکتی تھیں۔ ہمارے ہاں حرام ہے: اَنْ يَّجْمَعُوا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ البتہ دین کے بنیادی اصول کبھی منسوخ نہیں ہوئے۔ تنبیح آیات کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کچھ نئی امور میں جوں جوں حالات بدلتے ہیں۔ احکام بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب انسان بچہ ہوتا ہے۔ تو اس کی ضرورت اس کی عمر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں۔ جب جوان ہوتا ہے۔ تو اس پر دوسرے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ پھر جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ تو حالات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی اقوام عالم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایسی اعتراض والی بات نہیں ہے۔

الغرض ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا مُمْسِكَ آيَةٍ كُفْرًا نَّاتٍ بِخَيْرٍ مِنْهَا مَكْرُمًا اس سے بہتر آیت یا حکم لے آتے ہیں اَوْ مِثْلَهَا يَكْمُ اَزْكَمُ اُس جیسا ہی لے آتے ہیں۔ نیا حکم بہر حال پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ کمر نہیں ہوتا۔ بہتر سے مراد یہ ہے کہ نیا حکم پہلے کی نسبت اجر میں بہتر ہوتا ہے۔ آیت یا حکم بھلائیے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کے ذہن سے ایسی آیت فراموش کر دی جائے۔ آیات کا یاد کرنا یا بھلانا اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں فرمایا سَنُقَرِّئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ہم غفریب آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں اَوْ مَا كُنَّا اللّٰهُ ہاں جس کو اللہ بھلانا چاہیں۔ وہ آپ بھول جائیں گے یہاں یہ بھی نُسْخَا کا مطلب یہی ہے کہ جس حکم کو تبدیل کرنا مقصود ہوتا ہے اُسے نَقِیْتُ منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یا اُسے

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ
وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِلَا إِيمَانٍ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ
﴿۱۰۸﴾ وَكَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ
إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا حَتَّىٰ تَخْرُجُوا مِنْهُمْ مِّنْ أَعْيُنِ
مَتَابِعِنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَأَعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ
إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح سوال کرو جس
طرح اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ اور جو شخص ایمان کے نزلے میں کفر
اختیار کرے گا، وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا ﴿۱۰۸﴾ اہل کتاب میں سے بہت
سے پسند کرتے ہیں کہ مومن ہونے کے بعد تیس کفر کی طرف پٹا دیں۔ اپنے
نفوس میں حسد کرتے ہوئے۔ بعد اس کے کہ ان کے لیے حق ظاہر ہو گیا ہے۔
پس درگزر کرو، اور معاف کر دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۰۹﴾ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے ہو اور بھلائی میں سے
جو کچھ تم اپنے نفوس کے لیے آگے بھیجو گے۔ اس کو اللہ کے پاس پا لو گے۔
اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کو دیکھنے والا ہے۔ ﴿۱۱۰﴾

بنی اسرائیل کی نرابیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ
نے اہل ایمان کو راعیٰ کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کی بجائے اُنظرنا
استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ یہودی دید و دانستہ راعیٰ کا لفظ بولتے تھے جس سے

ربطیات

معاذ اللہ یہ غیر علیہ السلام کی توہین کا سہل نہ تھا۔ گذشتہ درس میں اس بات کا الحظ رہا بھی کیا تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر کوئی بہترین نازل فرمائے۔ یہ لوگ نبی کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ پھر انہوں نے نسخ آیات کا مسئلہ بھی اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم جانی کرنے کے بعد اُسے منسوخ کیوں کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ایسا کسی لاعلمی یا جہالت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جس طریقے پر نوبہ انسانی کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس کے مطابق شریعت نازل فرماتا ہے۔ اسکی مثال ایسے ہی ہے۔ جیسے ایک ڈاکٹر کسی مریض کو مختلف اوقات میں مختلف دوائیں دیتا ہے۔ کسی کو منسوخ کر دیتا ہے۔ کسی کو تبدیل کرتا ہے اور کسی کو جاری رکھتا ہے۔ یہ مریض کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی لوگوں کے حالات کے مطابق شریعت میں رد و بدل فرماتے ہیں۔ وہ ملک الملک جس طرح چاہتا ہے حکم نازل فرماتا ہے۔ اس کے کسی حکم پر اعتراض کرنا اس کے قادر مطلق ہونے پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

یہودیوں کے
سوالات

ان آیات میں یہودیوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نبی آخر الزمان سے ایسے سوالات نہ کرتے جو جیسے تمہارے آباء اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے۔ ارشاد ہوتا ہے اَفَرَأَيْتُم مَّا كَانَتْ تَأْتُوا رَسُولَكُمْ مِمَّا سَبَّلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ مِنْ مَّنْزِلِ كَرَامِ فَمِنْ مَّا تَأْتُوا بِهِ خَلِيفَةً لَّأُولَٰئِكَ فِي الْآيَاتِ اس آیت میں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہی ہے۔ یہی لوگ حضور علیہ السلام سے طرح طرح کے یہودہ سوالات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان سے سوال کرتی ہے۔ اُنْكَ سَورَةٌ نَّارِيں اس کی تفصیل آئے گی۔ يَكْشُكُ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابٌ مِّنَ السَّمَاءِ اہل کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں۔ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب بیک وقت اکہن کیوں نہیں لاتے۔ بیسار تورات مکمل طور پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ ان کے سوالات کو غامض نہ لائیں۔ فَقَدْ كَلَّمَا مَوْسَىٰ أَكْبَرُ مِنْ ذَلِكَ أَنْ يَنْصَبُوا

نے تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا۔ کہنے لگے اَرِنَا اللّٰہَ جَهَنَّمَ اَیُّ الشَّیْءِ
سے ہماری بالمشافہ ملاقات کرانیں۔ تب ہم مانیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اتاری ہے
سورۃ بقرہ میں بھی اس قسم کے سوالات گزر چکے ہیں۔

مشرکین کے
سوالات

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطبین اہل کتاب کے علاوہ مشرکین
بھی ہیں۔ ان کے یہودہ سوالات کا تذکرہ بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔
سورۃ بنی اسرائیل کے مطابق انہوں نے نبی علیہ السلام سے فرمائش کی کہ آپ یسوعی لگا کر ایمان
پر چڑھ جائیں۔ اور پھر وہاں سے کتاب لائیں۔ مکے کی سرزمین کو باغات میں تبدیل کر دیں۔
آپ کے ارد گرد فرشتوں کی جماعت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خود ہمارے سامنے آکر
آپ کی رسالت کی تصدیق کرے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام سوالات
کا ایک ہی جواب دیا۔ قَدْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُ سُوْلًا یعنی
میں انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میں قادر مطلق
ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہے۔ وہ جو چاہے کرتا
ہے۔ مقصد یہ کہ یہود کی طرح مشرکین بھی طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ اس قسم کے سوالات
کا مقصد محض تکبر یعنی ہوتا ہے اور کسی بات کو تسلیم نہ کرنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے

صریح کفر ہی

فرمایا اس طرح کے بے معنی سوالات نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہوگا۔
وَمَنْ یَّتَّبِعْ اِلَ الْکُفْرِ یَاۤیْمٰنٍ جو کوئی ایمان کے بے میں کفر اختیار کرے گا۔
فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِیْلِ دوسیدھے راستے سے بھٹک گیا گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ
اعتراض برائے اعتراض اور وہ بھی ایذا رسانی کے لیے کھلی گمراہی اور کفر ہے۔ یہاں پر
اگر یہ روئے سخن اہل کتاب اور مشرکین کی طرف ہے۔ تاہم بات اہل ایمان کو بھی سمجھائی
جاری ہے کہ جو بھی اس قسم کے یہودہ سوالات کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
مسی علیہ وسلم کے احکام کو تسلیم نہیں کریگا۔ وہ بہر حال راستے سے بھٹک جائے گا۔

لَا تَسْأَلُوهُنَّ عَنْ شَيْءٍ رَّانُ مُبَدَّلَكُمْ تَسْأَلُوهُنَّ وَأَنْ تَسْأَلُوهُنَّ عَنْهُنَّ حِينَ يُسْأَلُ
الْقُدْرَانُ مُبَدَّلَكُمْ یعنی نزول وحی کے زمانے میں سوال نہ کیا کرو۔ اگر بعض چیزوں
کے متعلق سوال کرو گے، تو وہ ظاہر کر دیا جائے گا۔ اور تم کو ناگوار گزرتے گو۔ مہات یہے
بنامی کا باعث ہوگا۔ اس لیے صحابہ کرام کثرت سوال سے اجتناب کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کا بیان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصحاب محمد
صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا
کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے ڈرتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ باہر کا کوئی اغرابی سوال
کرسے تو وہ بھی مستفید ہوں۔ خود سوال کرنے میں بہت محتاط ہوتے تھے۔ قرآن پاک میں کل
بارہ سوالات کا ذکر آتا ہے۔ جو صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام سے کیے۔ ان میں یَسْأَلُونَكَ
عَنِ الْخَمْرِ اور یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَمْنِ یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ وغیرہ ایسے
سوالات شامل ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دگر می تھا۔ اسے لوگوں فضول
اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو۔ کیونکہ پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کَثْرَةُ مَا يَسْأَلُونَ
وَلَا خَيْرَ فِيهِمْ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ کثرت سوال کی وجہ سے انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے
اختلاف کیا اور ہلاک ہوئے۔ لہذا کثرت سوال سے بچو۔ ہاں ایسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے یا کسی
کام کے جواز یا عدم جواز کے لیے سوال کرنے کی ممانعت نہیں۔ زیادہ سوال کرنے میں قباحت
یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب تمہیں ناگوار گزرسے یا بنامی کا باعث ہو۔ اکثر
سوال محض نکتہ چینی یا اذارسانی کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے منع کیا کہ اے اہل ایمان!
تم یہود کی روش پر نہ پنا اور کثرت سوال سے اپنے آپ کو بچنا

مسلمانوں کو سوالات کی ممانعت کی ایک وجہ تھی کہ اہل کتب مسلمانوں کو اکستے تھے
کہ اپنے نبی سے یہ سوال پوچھو، اور اس سے ان کا مقصد فتنہ پر بازی ہوتا تھا۔ اہل ایمان کو
یہ بھی نصیحت ہے کہ وہ یہودیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کریں۔ پہلے گندہ چمکے کہ لوگ

سحر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں
شہہ ڈال مقصود تھا۔ تاکہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں۔ ان کی سازشوں سے محفوظ
رہنے کے لیے فرمایا کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے ابے معنی سوال نہ پوچھ کر دو۔

اہل کتاب کے
باطنی ارادے

مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے ارادے بڑے خطرناک ہیں وَدَّ كَثِيرٌ
مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّدُّكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا۔ اس سے اہل کتاب
چاہتے ہیں کہ تمہیں پھر ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں۔ وہ ہر وقت اسی کوشش میں لگے
ہوتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان کمزور ہو جائیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ وہ بھی اپنے سابقہ دین
پر پٹ بائیں۔ یہ تو نزول قرآن کے زمانہ کی بات ہے۔ کہ اہل کتاب مسلمانوں کو پھلتا چھوٹا
نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی یہ کوششیں آج تک جاری ہے۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو دوبارہ
کفر کی طرف لوٹا دیا جائے۔ دنیا میں جتنی مشایاں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب اسی کام کے لیے
ہیں۔ دُوسرے مقام پر آئے ہیں فَتَكُونُونَ سَوَاءً۔ سب برابر برابر ہو جائیں۔ جس طرح
وہ خود گمراہ ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ان کی رہش پر چل پھریں۔ جس طرح انسانوں نے اللہ تعالیٰ
کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا۔ اسی طرح مسلمان کی کرنے لگیں۔ اہل کتاب کی دلی
خواہش یہی ہے۔

فرمایا اہل کتاب کی اس گندنی ذہنیت کے نیچے ان کی ایک اور خباثت کا ذکر فرمایا
یعنی حَدَّثَنَا عَنْ أَنفُسِهِمْ۔ ان کے نفسوں میں چھپا ہوا حسد ہے۔ جو انہیں مسلمانوں
کے خلاف ابھار رہا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ ایسا کسی خطہ فہمی یا لاعلمی کی بنا پر نہیں
کرتے۔ بلکہ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ۔ یہ سب کچھ حق کے اظہار کے بعد
کر رہے ہیں۔ انہیں حق اور باطل میں تمیز ہو چکی ہے۔ مگر حسد اس بات پر کرتے ہیں کہ نبی
آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نوا مبعول کی بجائے بنو اسحاق میں کیوں نہیں آیا۔

حسد بدترین
بیماری ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حسد و بدبود کی بنا پر ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ فلاں نعمت فلاں

کہ کیوں ملی ہے اور پھر اس کے زوال کی قتا کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فذل نعمت اس کی بجائے مجھے ملنی چاہیئے۔ ایسی خواہش کرنا حرام ہے۔ یہ اخلاقی بیماری ہے۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا يَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ یعنی حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔ حسد اتنی بُری چیز ہے۔

امیر بن ابی صلت عرب کا عظیم شاعر اور محکم تھا۔ خدا کو ماننا تھا۔ قیامت کا تصور ذہن میں موجود تھا۔ اسی لیے سچے مذہب کا متلاشی تھا کبھی تو رات کا مطالعہ کرتا کبھی انجیل پڑھتا کبھی اہل کتاب سے گفتگو کرتا۔ تاکہ حق کو پاسکے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو یہ شخص حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ یہ بات تھا کہ وحی اس پر نازل ہوتی۔ محض حسد کی وجہ سے دین خاص کا مخالف ہو گیا۔ اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔

حسد کو قطعاً حرام ہے۔ ابراہیم غنبد یا رشک جائز ہے۔ غبط کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس نعمت دیکھ کر تمنّا کرے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی ایسی نعمت سے سرفراز فرمائے حسد کا معنی تو یہ ہے کہ جس کو کوئی بستی ملی ہے وہ اس سے محروم ہو جائے۔ مگر غبط میں کسی کے زوال کی تمنّا نہیں ہوتی بلکہ اس کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔

بزرگان دین فرماتے ہیں مَا خَدَّ جَسَدٌ عَنْ حَسَدٍ عَامٍ طَوْرٍ بِكَوْنِ جَسَدٍ عَمَلٍ غَالِي نِيْلٍ بَوْنًا۔ اسی لیے تعوز کی تلقین کی گئی ہے۔ وَهِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اَللّٰهُ فِيْ حَاسِدٍ كَيْفَ تَسِيْرِيْ بِنَآءٍ جَابِتًا بَوْنًا۔ ہر حال حسد ایک بہت بُری بیماری ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

جیسا کہ عرض کیا، غیر مسلم اقوام میں مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ نزول قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بھڑک رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت امرِ کبیر برہنہ ہو چکی اور فرانس وغیرہ کی عیسائی طاقتیں اربوں روپیہ اس مقصد کے لیے خرچ کر رہی ہیں

غیر مسلم
حسد اقوام

کہ کسی طرف سے ان قوم کا تعلق قرآن پاک سے منقطع کر دیا جائے۔ مستشرقین کا فتنہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے الحاضری العالم الاسلامی جو ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یوپی عیسائیوں اور یودیوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر طیبہ کو سنجہ کہہ کر لودہ قرآن پاک کی تردید میں چھ لاکھ کی تعداد میں کہیں شائع کی ہیں۔ تاکہ مسلمان اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اگر عیسائیت نہ بھی مقبول کریں۔ تو کم از کم مسلمان کی حیثیت میں باقی نہ رہیں۔ مشنری سکول، ہسپتال وغیرہ سب اسی مقصد کے لیے چل رہے ہیں۔ لوگوں کو لالچ دیکر عیسائیت کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ یہ اسی حسد کی بنا پر چاہتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کا تعلق اپنے نبی سے کٹ جائے۔ اور یہ قرآن پاک کی تعلیمات کو چھوڑ دیں۔

مہرِ رحم
پر اعتراض

مہرِ رحم کا الگ بھی یہودیت کا شاخ نہ ہے۔ اس شخص کی خباثت کی داد جس نے فیڈرل شریعت کورٹ میں دعویٰ دائر کیا ہے۔ کہ رجم کی سزا کو کالعدم قرار دیا جائے۔ یہ کوئی بقول اس کے یہ شرعی حد نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ لوگ شوک و شبہات میں مبتلا ہو کر دین سے بیزار ہو جائیں۔ غارتیوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔ اور آج کے زمانے کے پرویزی اور چکرالوی بھی اسی قماش سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں رجم کی سزا نہیں ہے۔ ہمیں! صحیح سنت میں تو موجود ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں رجم کے متعدد کیس ہوئے۔ صحیح یہ کہ ام غنم کے زمانے میں رجم کی سزا دی گئی۔ اگرچہ عام طور پر رجم کی سزا قرار جرم پر ہی دی گئی۔ تاہم اکتے دوسرے ایسے واقعات بھی پیش آئے۔ جن میں گواہی کی بنیاد پر رجم کی سزا دی گئی۔ اس زمانے میں کسی کو رجم کی سزا ملی ہو یا نہ۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر اس کے شرعی حد ہونے سے مجال انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک کے
خلاف سازش

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچ سکا لار کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ختمِ مچینی کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بدظن ہو جائیں۔ فیلڈ سٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بڑا کہا تھا کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی قوار انسانیّت کی دشمن ہیں (العیاذ باللہ) اس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کہا تھا۔ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ یہ دنیا مہذب نہیں بن سکتی۔ لہذا

اس کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے مٹا ہوا ہوگی۔ اس کا مطلب یہی تھا۔ کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے۔ جو فحاشی سے روکتی ہے۔ اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی۔ ان کے نزدیک انسان مہذب نہیں کہلا سکتا۔ لہذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے۔ کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے محو کر دیا جائے۔

فرمایا بہت سے اہل کتاب یہ پسند کرتے ہیں کہ تمہیں کفر کی طرف پٹا دیں۔ ایمان کے بعد احمق کرتے ہوئے بعد اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو متعین کی جا رہی ہے۔ کہ اہل کتاب کے خلاف کسی قسم کا انتقامی جذبہ ذہن میں نہیں رکھنا۔ بلکہ فَاغْفِرُوا لَہُمْ پس معاف کر دو۔ وَاَصْفَحُوا اور درگزر کر دو وَحَیَّ یَا اَیُّہَا اللہُ بِامْرِہٖ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم سے آئے۔ گویا مسلمانوں کو انتقامی کارروائی کی بجائے حکم الہی کا انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ اور مدینہ طیبہ بلکہ پورے عرب کو یہودیوں اور نصاریوں سے پاک کر دیا گیا۔ فرمایا اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وقت آنے پر وہ ان بدعظمتوں سے مواخذہ کرے گا۔

نماز اور زکوٰۃ

اہل کتاب کی طرف سے جو کس بننے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پر کاربند بننے کی تلقین بھی فرمائی۔ وَاقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ تمہاری طاقت کا منہج یہی دو چیزیں ہیں۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ تمہاری تمام تر قوت کا دار و مدار تعلق باللہ پر ہے۔ اور نماز۔ زکوٰۃ اس کا مظہر ہے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔ اسے وقت پر ادا کرتے رہو۔ اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کر دو۔ بخل جیسی، قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے۔ اسے کبھی نظر انداز نہ کرو۔ غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش پیش ہیں۔ اس معاملہ میں وہ تمہیں ہنسنے پر مجبور نہیں آئے دیں گی۔ اگر تم یہ بدعت قائم کرو کہ پچاس برس میں امریکہ کے برابر مادی ترقی حاصل کر لو گے۔ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک مہاجرہ تم سے پچاس سال مزید آگے نکل چکا ہو گا۔ لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے صلوٰۃ و زکوٰۃ ہے۔ انہیں کے ذریعے اندر ایمان اور وضاحت پیدا ہوگی۔ تعلق باللہ قائم ہوگا۔ جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

فرمایا، یاد رکھو، وَمَا تَقَدَّمُوا لَكُمْ مِنْ خَيْرٍ حَتَّىٰ وَهَّ عِنْدَ اللَّهِ
 تم اپنے نفسوں کے لیے جو بھی بھلائی آگے بھیجو گے۔ کوئی نیکی، کوئی عمل، صدقہ خیرات کر دو گے
 نماز ادا کر دو گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ اس کا واضح
 اعلان ہے: مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ایک ذرے کے برابر کیا ہوا عمل بھی ضائع نہیں
 ہوگا۔ بلکہ انسان اپنا برا چھپایا برا عمل قیامت کے دن دیکھ لے گا۔ یہاں بھی فرمایا کہ جو کچھ تم
 اعمال کے ذریعے آگے بھیجو گے حَتَّىٰ وَهَّ عِنْدَ اللَّهِ اُسے اللہ کے ہاں پالو گے۔ ہر چیز
 کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو
 دیکھ رہا ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کوئی کام کس
 نیت اور ارادے سے انجام دے رہے ہو۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرَانِيًّا تِلْكَ
 آمَانَتُهُمْ قُلْ مَا تَوَابَعْنَاكُمْ أَن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ (۱۱۱) بَلَىٰ
 مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ
 وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۱۱۲)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ داخل ہرگہ جنت میں مگر وہ جو یہودی ہو یا
 نصرانی ہو۔ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے، لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو
 (۱۱۱) کیوں نہیں۔ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے سامنے جھکا دیا۔ اور وہ نیک کام
 کرنے والا ہو۔ پس اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بدلہ ہے یوں لوگوں پر

نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۝ (۱۱۲)

اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام سے فضول سوال کرتے
 تھے۔ اور پھر ان سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ان کی روش سے
 منع فرمایا۔ کہ تم یہودیوں والے کام نہ کرنا۔ اور ان کے بہکاوے میں آکر دین میں شک نہ کرنے
 لگنا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اہل ایمان پھر کفر کی طرف پلٹ آئیں۔ اہل کتاب حاسد ہیں۔ اسی بنا پر
 پر وہ انبیاء علیہم السلام پر سختہ چینی کرتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں نقص نکالتے ہیں۔ تاکہ مسلمان
 اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ الغرض! بنی اسرائیل کی یہ خرابیاں یَسْبِيْنَ رَأْسًا يَلْدُ
 اُذْ كُرُوا اِنْعَمْتِ الْيَتَى سے لے کر لگے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی ملت
 اور خانہ کعبہ کے ذکر تک چلی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو ان خرابیوں سے بچنے کی تلقین کی
 جا رہی ہے۔

یہودی نصاریٰ اہل کتاب میں یہودی اور نصرانی دونوں فرقے پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں کی نسبت
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کی

طرف منسوب کرتے ہیں۔ محض حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل ایمان ہے اور نہ تورات کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر کے اس کا علیحدہ بگاڑ دیا۔ اس بات کا تذکرہ گذشتہ دروس میں آچکا ہے۔ آج کل یہودیوں کو صیہون بھی کہا جاتا ہے۔ صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ ان نسبت سے انہیں صیہونی کہتے ہیں۔

نصاری اپنی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی طرف کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بستی کا نام ناصروت تھا۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ تاہم سمان معمر بن کرامہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر کہا تھا مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ يَعْنِي اللَّهُ كَيْ رَاسْتِي فِي مِيرِي كُون مَدْرَكِي كَا۔ تو حواریوں نے کہا تھا تَخْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ بِمَالِكَ كَيْ دِينَ كِي مَدْرَكِي وَلَسِي هِي۔ اس لحاظ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نصاریٰ نہ تو اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور نہ انجیل پر ایمان ہے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کہنے کی بجائے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا۔ بعض تین خداؤں میں انہیں تیسرا کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں عواں کر گیا تھا۔ سورۃ مائدہ میں وضاحت موجود ہے "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ" یعنی وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی مسیح ہے جو زمینوں میں تیسرا ہے۔ وہ قطعی طور پر ملعون ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے والے بھی کلمہ کفر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے "سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ" اللہ تعالیٰ ایسی تمام شرکیہ چیزوں سے منزہ ہے۔ نصاریوں نے انجیل کو بھی تحریف کے ذریعے بگاڑ دیا ہے اب ایک کی بجائے ایک سو بیس انجیلیں بن چکی ہیں۔ عام مشورہ چار انجیلیں یعنی یوحنا، متی، مارقا اور مرقس تو بائبل کے ساتھ فلک ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پانچویں انجیل برناس بھی ہر جگہ دستیاب ہے

عِندَ رَبِّهِ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ پس ان کا حساب ان کے رب کے پاس
جا کر ہی ہو گا۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ عقلی دلیل۔ زیادہ سے
زیادہ یہ لوگ رواج کو بطور دلیل پیش کر بات کرتے ہیں۔ باوجودیوں کرتے ہیں۔ ہماری
قوم کا یہ رواج تھا۔ ہمارے علمائے دین اس بات کو نہایت تھے۔ برخلاف اس کے توحید کے
ہزاروں کروڑوں دلائل آپ کے مشاہدہ کے یہ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ نجات غلط ہے۔ یہ شخص مخصوص فرقہ
کی بنیاد پر جنت میں نہیں جاکھے۔ نجات کا یہ قانون مرکز نہیں ہے۔

فرمایا جسکی تکلیف نہیں یہ نہایت ایک جاب ہے۔ اور یہ اپنے سے پہلی بات کی نفی کرتا ہے۔ اتباع خداوندی
اپنے دعویٰ تھا۔ یہود و نصاریٰ کے سوا نجات میں کوئی نہیں داخل ہو گا۔ فرمایا کیوں نہیں ہو گا۔
بلکہ جنت میں داخل ہو گا۔ مگر وہ مَن اسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰہِ جس نے اپنے چہرے کو
اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا۔ ذکر چہرے کا ہے مگر مراد اس سے ذات ہے۔ کہ جس شخص نے
اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دیا۔ وہ جنت میں ضرور داخل ہو گا۔ وَجْهَهُ
کا یہ معنی دوسرے مقام پر بھی آتا ہے جیسے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" ہر چیز فنا
ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ذات خداوندی حقیقی۔ قیوم قائم۔ وہ دائم۔ قائم۔ ازل
اور ابدی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز کا فعل فانی ہے فنا ہو چکی ہے۔ یا آئندہ فنا ہو جائے گی۔
قائم اور دائم ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

مَن اسْلَمَ جس نے تابع کر دیا۔ اسلام کا معنی منقاد ہو جانا یا تابع ہو جانا۔ آگے
آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو فرمایا "اسْلِمُوا"
یعنی طبع ہو جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا "اسْلَمْتُ لِلرَّبِّ الْعَلِیْمِ" میں ظاہر
باطن طریقے سے اللہ رب العالمین کا فرمانبردار ہوں۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے
لیے سرلمحہ تیار ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔
میں اس سے بہت کر کے تسلیم پے ہوا۔ آپ نے تعمیل کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ غار کعبہ
تعمیر کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عمل کیا۔ حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ یحییٰ یحییٰ کو زندہ

چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ گویا انہوں نے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ میں نے جو اقرار کیا تھا اسے حرف بحرف پورا کر دکھایا۔

نیک نیتی

فرمایا جنت میں جانے کا معیار یہ ہے۔ مَنْ اَسْلَمَ یعنی جو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو گیا۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل میں کمر بستہ ہو جائے۔ اس کا اعتقاد درست ہو جائے۔ اس کی فکر پاک ہو جائے۔ اس کا ایمان مکمل ہو جائے جس کا تعلق نیت اور نیت سے ہے۔ ایمان کا تعلق چونکہ باطن سے ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انسان کی باطنی طہارت کی ضرورت ہے اس کے قلب و روح میں اللہ تعالیٰ کی واحدیت سرایت کر جائے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے۔ اور نہ اس کی صفات میں کوئی شریک ہے۔ اگر دل کے کسی گوشے میں شرک کا معمولی سا شاہ بھی موجود ہے تو ایسا شخص مومنہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شرک ہے یا منافق ہے یا شرک کرنے والا ہے۔ بخاری و ابوداؤد سلم شریفین کی حدیث ہے۔ مَنْ سُرَّ بِهِ السَّلامُ فِي فَرْيدِهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰی صَوْرِكُمْ وَلَا نَوَاصِبِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ اِلٰی قُلُوبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمام دشمنوں اور دشمنوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ کسی شخص کے اعمال کا دار و مدار اس کی نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ اللہ کو پکارو۔ خاص نحی کی اطاعت کرنے والے ہی جاؤ۔ حدیث شریف میں ہے۔ اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اللہ اپنے باطن کو درست کر دو۔ جنت میں داخلے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔

اہم رازیؒ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک ایماندار آدمی بھوک میں مبتلا تھا۔ سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے نظر آئے۔ اُس نے کہا، کاش میرے پاس ریت کے ان ٹیلوں کے برابر دان ہو تا۔ تو میں سب بھوکوں میں تقسیم کر دیتا۔ چونکہ خود اس وقت بھوکا تھا۔ اُسے بھوک کی تعریف محسوس ہوئی تو اس نے دست بھوکوں کو خیال میں نہ رکھتے ہوئے یہ بات کی۔ کہنے پر اللہ تعالیٰ کو کی بات پسند

آئی۔ چنانچہ اس وقت کے نبی پر وہی بھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تیری اس خالص نیت کو قبول کر کے تجھے ریت کے ٹیلوں کے برابر غلہ تقسیم کرنے کا ثواب عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے۔ جیسی تمہاری اچھی نیت تھی۔ ہم نے ویسا ہی اچھا اجر عطا کیا ہے جنت میں داخلے کا جو رسول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ اس کا پہلا جزئیہ تھا کہ داخلے کا خواہشمند شخص اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اس کا دوسرا جزئیہ یہ فیتا: **فَهُوَ مُحْسِنٌ** اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ مقصد یہ کہ جنت میں داخلہ کسی فرقہ یا جماعت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ کہ وہ یہودی ہو یا عیسائی کہلاتا ہو۔ بلکہ نجات کا قانون اس مقام پر یہ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اس نیت اور ارادہ درست ہو۔ اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ اور پھر دوسرا جزئیہ یہ کہ وہ اعمال صالحہ کرنے والا ہو۔ ایسا شخص یقیناً جنت کا حقدار ہوگا۔ اور اس کو نجات حاصل ہو جائے گی۔

اعمال صالحہ

فرقہ بندی
ذریعہ نجات نہیں ہے

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ یاد رکھو نجات کا دروازہ اکابر پر ہے۔ نہ کہ انبیا پر۔ نسب کے لحاظ سے کوئی کہتے ہیں اپنی اپنے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کا باطنی طور پر ایمان اور عقیدہ درست نہ ہو۔ اور ظاہری طور پر اعمال صالحہ نہ انجام دیتا ہو۔ ہمارے ہاں جمعی بہت سی فرقہ بندیوں پائی جاتی ہیں۔ بعض جاہل یا کم فہم لوگ کسی خاص فرقے یا گروہ کو ہی نجات یافتہ تصور کرتے ہیں کہ فلاں مسلک والے جنت میں جائیں گے۔ دوسرے نہیں جائیں گے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ان میں کہتے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی بات کو تعصب رکھتے ہیں۔ بعض حنفی، خابہ کے ساتھ یا شافعی، بیکوں کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف ہم ہی جنت کے وارث ہیں۔ دوسرے اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سلوک اور تصوف کے سلسلے ہیں۔ جیسے چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی وغیرہ۔ ان میں سے بھی بعض ایک دوسرے کے خلاف عداوت رکھتے ہیں اور جنت کو صرف اپنی وراثت سمجھتے ہیں۔ بات سب لوگوں کو جنمی خیال کرتے ہیں۔ یہ تو محض فروری اختلافات ہیں بنیادی طور پر چاروں مسالک یا سلسلہ ہائے تصوف میں کوئی اختلاف نہیں۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں: کہ یہ چیزیں فروعات دین میں سے ہیں۔ دین میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ مگر اس کی بنا پر دوسرے فرقہ و گروہ کو جہنمی قرار دینا جہالت محض ہے۔ دین میں جتنے مسک اور بھٹنے سوک ہیں۔ سب کا مقصد واحد ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی۔ کوئی حنفی بویا شافعی، مالکی بویا حنبلی، چشتی بویا قادری منزل مقصد تو سب کی ایک ہی ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ طریقہ تعلیم مختلف ہے۔ مگر مقصد تو مختلف نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو جہنمی اور دوسرے کو جہنمی کہنا بات خود گمراہی کی علامت ہے اس میں اور یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ اس غلط فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ فروعات میں اختلاف رائے عین فطری امر ہے۔ اور اس کی گنجائش ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دواکڑا یا حکیم ایک ہی قسم کے مریض کے لیے مختلف دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہتا کہ فلاں دواکڑا بد قوت ہے۔ اور فلاں حکیم درست ہے۔ انہیں سب درست ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ یعنی مریض کی صحت یا بی مقصود ہے۔ دوا کوئی بھی تجویز کی جاسکتی ہے۔ جو اس کے مناسب حال ہو۔ لہذا دین کے معاملہ میں ایسا تعصب کیوں اختیار کیا جائے۔ کہ فلاں فرقہ ایسا ہے یا فلاں اہم ایسا ہے۔ بجائی یہ سب ایک ہی اللہ تعالیٰ کو رہنے والے تو ہیں۔ ان کے متعلق کسی گروہ میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

اب دیکھئے ملک میں فوجداری قانون رائج ہے۔ کسی ملزم کو ایک جج اسزائے موت دیتا ہے۔ تو دوسرا اسی قانون کے مطابق اسے بری کر دیتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے کسی جج کو غلط نہیں کہا۔ کیونکہ قانون میں مختلف فیصلہ جات کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح دین کے قانون کو مننے والے سائے ہی ہیں۔ خواہ کوئی حنفی بویا شافعی۔ لہذا ان کے پیروکاروں میں بھی تعصب نہیں آنا چاہیے۔ یہ کہنا کہ فلاں فرقے والے اس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز نہیں ہوتی و وہ جہنمی ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔ اور من حیث القوم مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ یہ یہودیت اور نصرانیت ہے۔ قرآن پاک نے اس کی مذمت بیان

فرمان ہے۔

الغرض! فرمایا قانونِ نجات یہ ہے۔ کہ جو شخص مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ قاننِ نجات جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنالیا۔ اور وہ نیک کام کرنے والا ہے۔ مجتہد و محبت فرماتے ہیں۔ کہ جب أَمِنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد بڑی بڑی چار عبادتیں ہیں۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس کے بعد پانچویں درجے میں جہاد آتا ہے۔ علاوہ ان کے ساتھ دوسری نیکیاں بھی ہیں۔ اس کو یوں بیان فرمایا فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ جو کوئی بھی نیک کام کرے گا۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی عمل کی ناقصی نہیں فرمائیں گے۔ اپنے ہر کام کا بدلہ وہ پائے گا۔ ہاں! اگر ایمان ہی مغفود ہے۔ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ تو پھاڑوں بتنی بڑی بڑی نیکیاں بھی گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گی: لَا يَقْدِرُونَ عَمَّا كَسَبُوا ان کی کھائی میں سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ ان کی نیکیاں گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ گویا کہ وہ راکھ کے ذرات تھے۔ جو آندھی کے آگے بالکل نہ ٹھہر سکے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ بڑے بڑے عامل، ریاضتیں اور محنتیں کرنے والے، کام کر کے تھک جانے والے ہوں گے۔ مگر قیامت کے روز تَصْلِي نَارِ حَرَمِيَّةٍ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ وہ ایمان کی دولت سے محروم تھے۔ سب نیکیاں اینٹیں بنائیں گی۔ بہر حال قانونِ نجات فرقہ بندی نہیں بلکہ اتباعِ خداوندی اور اعمالِ صالحہ ہیں۔

فرمایا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر لیا۔ اور پھر وہ نیکی کرنا لا بن گیا فَلَهُ الْجَزَاءُ عِنْدَ رَبِّهِ پس ایسے شخص کے لیے اپنے رب کے ہاں اجر ہے۔ نیکی کا بدلہ اس کو ضرور ملے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ایسے اشخاص مقبل میں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ نہ ان پر کوئی خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ان پر ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ کم از کم موت کا ڈر تو اسے ہر وقت رہتا ہے۔ گویا موت ہر وقت اس کے پیش نظر ہے۔ پھر دولت اور صحت کا خوف مسلط رہتا ہے۔ پتا

نہیں یہ بولت مہائے پاس ہے گی یا نہیں۔ پتا نہیں کل کو صحت بھی برقرار رہ سکے گی یا نہیں۔ تو اس قسم کے خوف انسان کے ہمیشہ دامن گیر رہتے ہیں۔ مگر جن کا عقیدہ صحیح ہوگا۔ جو اعمال اچھے کرنے والے ہوں گے۔ وہ ان تمام پریشانیوں سے محفوظ رہیں گے۔ انہیں نہ پینے ہاضی پر افسوس ہوگا اور نہ انہیں مستقبل کا کوئی غم شہ ہوگا۔ برخلاف اس کے جنہوں نے کوئی کمائی نہیں کی۔ زندگی کی پونجی کو ضائع کر دیا۔ وہ افسوس کریں گے۔ کہ ہم نے کتنی کوتاہی کی۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت دی تھی۔ مگر ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ نہ عقیدہ درست کیا اور نہ نیکی کا کوئی کام کیا۔ ایمان سے محروم ہے۔ ایسے لوگ خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ اور پینے کے پر ہمیشہ افسوس کرتے رہیں گے۔

الْمَآءِ

درس چل و پل ۲۵

البقرة ۲

(آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسِيحَ اللَّهِ أَنْ
يُذَكِّرَ فِيهَا أَسْمَاءَ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
أَنْ يَدْخُلُوهَا وَلَا يَخَافِينَ هَٰلَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ
فَإِنَّمَا تُكَلَّفُ شِمَةٌ وَجْهَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾

توجہ دے: یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں۔ اور نصاریٰ نے کہا کہ
یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں (یعنی ان کا دین صحیح نہیں ہے) حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں
اسی طریقے سے اہل لوگوں کی جو جانتے نہیں (جاہل ہیں) ان جیسی بات پس لائے تعالیٰ
ان کے درمیان قیمت کے دن فیصلہ کرے گا۔ ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف
کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں
سے منع کرتا ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اور ان کی بربادی میں کوشش
کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ کہ نہیں ہے ان کے لیے کہ داخل ہوں۔ ان
گھروں میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان
کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب
پس ہر جہر بھی تم نہ کرو۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا
ہر سب کچھ جاننے والا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾

یہودی و نصاریٰ
آمنے نہ

یہودیوں اور نصاریٰ کی بخلہ ظاہریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک گروہ

دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتا ہے۔ تیسرا گروہ مشرکین کا ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کو باطل کہہ کر اپنے آپ کو صحیح العقیدہ سمجھتا ہے۔ تو گویا یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کا ابطال کرتے ہیں۔ ان آیات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں۔ یعنی ان کا دین سچا نہیں ہے۔ اس طرح جب یہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ یہودیوں کا اعتراض یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر کفر کیا۔ اور عیسائیوں کا نظریہ یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے نہ صرف ان کا انکار کیا۔ بلکہ انجیل کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لہذا یہ گمراہ ہوئے۔ فرمایا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ وَهُمْ يَسْتَلُونُ الْكِتَابَ حالانکہ یہ دونوں گروہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی توراۃ اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

کتبِ سماویہ
بدھتی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن پاک اور دیگر صحائف سب کے سب برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اصل دین انہی کتب کے ذریعے نازل فرمایا۔ مگر ان بد بختوں نے تحریف کر کے دین کو مسخ کر دیا تاہم اصل دین ان کی کتابوں میں اب بھی موجود ہے۔ جنہیں یہ پڑھتے ہیں۔ لہذا کسی کتاب کا بالکل انکار کر دینا کہ اس میں کچھ سچی باتیں ہیں۔ انصاف کے خلاف ہے۔ اور اہل کتاب کی جھٹ دھرمی کی دلیل ہے۔ ہاں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا اصل دین تو نمیک تھا۔ مگر انہوں نے خرابیاں پیدا کر دیں۔ یا نصرائی جو دین اور کتاب بدھتی تھے مگر ان کی تحریفات نے اسے کچھ اور بنا دیا ہے۔ ایک درسِ مذہب کو بالکل ہی باطل قرار دینا درست نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
پر الزام تراشی

جب قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے توراۃ اور انجیل کی تفسیق کی کہ یہ دونوں آسمانی کتابیں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس کے علاوہ تمام صحیفہ سماویہ کی بھی تصدیق کی۔ البتہ قرآن پاک نے ان مقامات کی ضرورت نشاندہی کی۔ جہاں جہاں سے یہ لوگ جھٹکے ہیں

اور جہاں جہاں انہوں نے کُتب میں تحریر کی ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہودیوں نے حضرت
 سیمان علیہ السلام کی طرف کفر کا کلمہ فسوب کیا۔ اور کہا کہ اُن کی عظمت بحر پر قائم تھی۔ لہذا ہم بھی
 ان کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بحر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے
 فرمایا: وَمَا كَفَرَ مِثْلَهُمْ یعنی سیمن علیہ السلام نے جادو کر کے کفر کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ انہوں
 نے خود کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت سیمان علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے صاحبِ شریعت رسول تھے
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو بمثال حکومت عطا کی تھی۔ اُن سے بحر کی لوث رابعدہ زقیاس ہے۔ انہوں
 نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِوَحْدٍ مِّنْ بَعْدِي
 یا اللہ مجھے ایسی عظمت عطا کر جو میرے بعد کسی کو عطا نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو
 شرف قبولیت بخشا اور آپ کے لیے ہوا اور جنات کو مسخر کر دیا مگر ان ظالموں نے سمجھا کہ یہ جادو
 کا اثر ہے۔ العیاذ باللہ۔

مشرکین کا نظریہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُدھر شرکین کا حال بھی یہود و نصاریٰ سے کم نہیں۔ كَذَلِكَ
 قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَحَرَّبَ كَيْفَ يَكُونُ لَكَ عِلْمٌ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ
 کرتے ہیں۔ جو اہل کتاب نے کی۔ یہ کہتے ہیں کہ نہ یہود و نصاریٰ حق پر ہیں اور نہ مسلمان۔
 حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے یہ تو جاہل غلط ہیں۔ نہ ان کے پاس
 کوئی کتاب ہے جس سے یہ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور نہ ہی دو ہزار سال کے عرصہ میں ان
 کے پاس کوئی نبی آیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جدِ تقدیر یا ڈیڑھ ہزار سال تک عرب
 خنزت، براہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بن یہ قائم ہے۔ اس کے بعد ان میں بگاڑ
 پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور پھر ایا وقت بھی آیا کہ سب کے سب شرک کی طرف مائل ہو گئے۔
 ہزاروں میں سے کوئی اکا دکا ہی موصدق تھا۔ ورنہ سب دین سے ہٹ چکے تھے۔

آخری فیصلہ

حدیث النبی میں ہوگا

الغرض! یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں گروہوں نے ایک دوسرے کی تکذیب کی۔
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جو کچھ چاہتے تھے وہ کرتے رہیں۔ قَالَ اللَّهُ يُخَذِّمُ بَيْنَهُمْ
 يَوْمَ الْقِيَمَةِ قِيَامَتِ كَيْفَ يَكُونُ لَكَ عِلْمٌ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ
 پرست۔ اور کون اصل دین سے چرچکا ہے۔ ان کا فیصلہ ہر اس معاملہ میں ہو جائے گا۔

فِيهِ كَاثُرًا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فرمایا ان کے درمیان قطعی فیصلہ
 تو قیامت کو ہوگا۔ تاہم جہاں تک ہدایت اور گمراہی کا تعلق ہے۔ تو اس کے متعلق اسی سورۃ میں
 آئے آیت: قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ہدایت اور گمراہی بالکل واضح ہو چکی ہیں۔
 دنیا میں حق کے متلاشی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار ذرائع پیدا فرمادیے ہیں۔ وہ حق و صداقت
 کی پہچان کر سکتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ہے: وَيُخَيِّجُ مَنِ حَتَّىٰ عَنْ أَبِيْنَنَ ۚ جو ہلاک ہوا
 وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ دوزخ میں ہے وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ زندہ ہے حق و باطل کی تفریق ہو چکی ہے تنگٹ کے مقتولین
 یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس واضح دلیل نہیں آئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے
 پاس اللہ تعالیٰ کا نبی آیا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی۔ مگر انہوں نے انکار کر کے مقابلہ کیا اور ہلاک ہوئے۔
 مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں باعتبار دلیل و عقل، دستور اور قانون ہدایت اور گمراہی
 کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اب کسی کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہم قطعی اور اٹل فیصلہ اللہ تعالیٰ
 کی عدالت میں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضرت علیؓ سے مروی ہے: اِنَّا اَوَّلُ مَنْ يَخْشَوْنَ
 بَيْنَ يَدَي الرَّحْمٰنِ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن میں گھٹنے ٹیک کر رحمن کے سامنے
 بیٹھوں گا اور درخواست کروں گا کہ اے پروردگار! آپ ان بد والدوں سے پرچھیں کہ یہ
 ہم سے کیوں لڑے تھے گویا اس دن حق و باطل کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں
 ہوں گے۔ اسی طرح ایک دوسرے کو باطل فرقہ کئے والوں کا فیصلہ بھی اُسی روز ہوگا۔

اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی تفریق کے لیے تمام محنت پوری کر دی ہے
 اہم بیضاویؒ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے
 انسان کو عقل و ضمیر عطا کی۔ انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ کتابیں نازل فرمائیں اب کون سا
 عذر باقی رہ گیا ہے۔ قیامت کو کون کہے گا: مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ
 کہ ہمارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ اب تو بشیر و نذیر آپکے۔ لہذا قیامت
 کے دن کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حضرت زبیرؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔

اَتَكْفُرُ عَلَيْنَا الْخُصُومَةُ مُنْهَرَةً! قیامت کو ہمارا اور ان کا جھگڑا دوبارہ قیامت ہو گا۔
فرمایا: ہاں! جن تنازعات کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہوا۔ ان کا فیصلہ رب العزت کی بارگاہ میں
خبردار ہو گا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: یہ تینوں فرقے یعنی یہود۔ نصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے
کو گمراہ کہتے ہیں۔ یہ خود سائے کے سائے گمراہ ہیں۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مارنے
سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا۔ اور جب قریب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام
دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے۔ تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے
علماء بھی ہوں گے۔ اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے۔ اور اس
کو مسیح سمجھیں گے۔ یہی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو (العیاذ باللہ) دجال سمجھ کر انہیں سولی پر
لٹکانے کیلئے لے گئے۔ ان کلمہ تختوں کا یہ حال ہے۔

جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو سولہ یا سترہ ماہ مکہ بیت المقدس
کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ مقصد یہود کی دُجوئی تھی۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے قریب ہوں
اور دین کی طرف راغب ہو سکیں۔ تحویل قبلہ کی آیات قرآن پاک کے دوسرے پارہ کی ابتداء سے
تشریع ہوتی ہیں۔ مگر اس معاملے میں بھی یہودیوں نے بہت دھرمی کا ثبوت دیا۔ اپنے تعصب
میں مبتلا رہے۔ اور مسلمانوں کے قریب نہ آئے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہی تھی کہ
مسلمانوں کے لیے بیت اللہ قبلہ مقرر ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں تحویل قبلہ کا حکم
دے دیا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں۔ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اسی
طرح یہودی اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام سے اور دُور ہو گئے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ان برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اس قدر
عنادی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عبادت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي

خَرْابِهَا اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا

نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ الحدیث

فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مصداق نصاریٰ ہیں جنہوں نے یسوع کا مقابلہ کر کے توراۃ کو بھلا دیا تھا۔ اور بیت المقدس کو دیران کیا تھا۔ یہ آیت مشرکین مکہ پر بھی صادق آتی ہے جنہوں نے ۶۰۰ میں مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا تھا۔ اور حرم پاک میں عمرہ ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ حالانکہ مسلمان محض عمرے کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ان کا لڑائی کر نیکار ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو اس وقت کے واقعات ہیں۔ یہ آیت آج بھی اُسی طرح نافذ ہے جس طرح یہ اپنے نزول کے وقت تھی۔ آج بھی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے۔ مسجد کی بربادی کا باعث بنتا ہے۔ وہ اس آیت کی رو سے بہت بڑا ظالم ہے۔

یسودی اور نصرانی ہمیشہ ایک دوسرے کو مساجد میں جا کر عبادت کرنے سے روکتے رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی یسود کو موقع ملا انہوں نے نصاریٰ کے ساتھ ہی سوک کیا۔ اور جب نصاریٰ کو غلبہ حاصل ہوا تو ان ظالموں نے بیت المقدس کو اکھاڑ دیا۔ گودا کو تہ آتش کیا۔ اور عبادت خانوں کو برباد کیا۔ مشرکین مکہ نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی سوک کیا۔ مکی زندگی میں حضور علیہ السلام خانہ کعبہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مشرکین مسلمانوں کو سخت ازیتیں دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی پٹائی کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے۔ ابو جہل کی حرکات کا ذکر خود قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿أَرَأَيْتَ الْكَذِبِيَّ يَنْهَىٰ ۙ عَبْدًا ۖ إِذَا أَصْلَىٰ ۚ﴾ کیا تم نے اس بد بخت شخص کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کے بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

دوسرے مقام پر جھوٹے مدعی نبوت کو بڑا ظالم کہا گیا ہے کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہو سکتا ہے۔ جو نبوت کا جھوٹا مدعی کرتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہے جس کے پاس خدا تعالیٰ کا نبی آئے، ہدایت کی بات پیش کرے اور وہ اس سے انکار کر دے۔ تاہم اس مقام پر غدار کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے گھر میں اس کی مساجد میں عبادت کرنے سے، نماز پر مہنے سے روکتا ہے۔ یہ تو ظاہری رکاوٹ ہے کہ کسی کو عبادت کرنے

سے روک دیا جائے۔ یہ عبادت خانے کی بربادی کے مصداق ہے۔ اس کے علاوہ ایک باطنی بربادی بھی ہے۔ کہ وہاں پر غیر اللہ کی پرستش کی جائے۔ بہ عبادت کو فروغ دیا۔ ایسا کرنے سے بظاہر تو عبادت خانہ آباد ہوگا۔ مگر باطنی طور پر بہایت سے خالی ہوگا اور بہ باطنی خرابی ہے۔

سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عبادت خانہ یوں دکا ہو یا نصاریٰ یا کسی اور کا۔ اسے گرانے کا حکم نہیں۔ مسلمانوں کی مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کو گرانے یا ان کی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر دیکھ لیجئے ۱۹۴۷ء میں تعمیر ہند کے وقت کیا کچھ ہوا۔ مشرقی پنجاب میں پچاس ہزار مساجد کی بے حرمتی ہوئی۔ ہندوؤں اور سکھوں سے یہ توقع کی جاسکتی تھی۔ دوسرے مغربی پنجاب میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کتنے نہ تھے جنہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دونوں فریقوں نے غلط کام کیا۔ عبادت خانے خواہ کسی سے متعلق ہوں۔ ان کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت جو عرب قبائل شرک سے تائب ہو کر ایمان کی دولت سے نواز ہوئے۔ انہوں نے اپنے مندر اور بت خانے گرا دیے تھے۔ اور وہاں پر مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ یہاں ہم تہذیب و آداب سے کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے ہی تعمیر کردہ معابد کی جگہ مسجدیں تعمیر کر لیں۔ عبادت خانے کی جگہ عبادت خانہ ہی تعمیر ہوا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بھی غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ محمد بن قاسم جب سندھ پر حملہ آور ہوا۔ تو ہندوؤں کے بعض مندروں کو نقصان پہنچا تھا۔ مسلمانوں نے خود اس نقصان کی تدفین کی۔ ورنہ نقصان زدہ مندروں کو دوبارہ تعمیر کر دیا۔ کیونکہ کسی کے عبادت خانے کو گرانے کا حکم ہرگز نہیں ہے۔

البتہ سلطان محمود غزنوی نے سومات کے مندر کو ٹکڑا کر ڈالا۔ چنانچہ اس کا سر نہیں کیا تھا۔ وقتی طور پر وہاں مسجد بھی بنادی۔ مگر وہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کے بعد ہندوؤں نے پھر وہاں پر مندر تعمیر کیا۔ راجندر پرشاد نے سوالا کھ روپے کے عوض کابل سے مندر کا گیسٹ بھی واپس منگوا کر اسی جگہ نصب کیا۔ جہاں سے اکھاڑا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ غلط کام کا نتیجہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ ترکوں نے بھی اپنے دور میں ابا صوفیہ کا مگر جاگرا کر وہاں مسجد تعمیر کر لی۔ جب اخیر ہر

کو وہاں غلبہ حاصل ہوا۔ تو وہاں پُر کرنا بنا۔ اب چیتختے ہیں کہ ہماری مسجد تھی۔ بہت بڑی لاہری تھی۔ جو عنایت ہو گئی مگر جس طرح مہ نے کیا۔ اسی طرح کا جواب انہوں نے دیا۔ اب چیتختے چلانے کا کیا مطلب۔ وہاں اگر عیسائی خود عثمان ہو کر اپنے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیں۔ تو وہ جائز ہے۔ مگر کسی کے عبادت خانے کو زبردستی گرانے بالکل نامناسب ہے۔

مسجد کے آداب

جس طرح مسجد کا ظاہری طور پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسجد کو باطنی خرابی سے محفوظ رکھنا بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے۔ ————— باطنی خرابی یہ ہے کہ مسجد کو اس کے اصل مقصد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسجد عبادت خانہ ہے۔ اس میں نماز، تلاوت، ذکر و اذکار ہونا چاہیے۔ نہ کہ دنیا کے دوسرے کاروبار۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے مسجد میں حد قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مسجد میں کسی مقصد کے لیے فیصلہ تو ہو سکتا ہے مگر طرز کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ کہ اس سے مسجد کی بحیرتی ہوتی ہے۔ مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا، فحش کلامی۔ گالی گلوچ کرنا، گندگی پھینکنا، تجارت یا لین دین کرنا۔ یہ سب مسجد کے آداب کے خلاف ہے حضور علیہ السلام نے گندہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنے سے منع فرمایا۔ بلکہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں گندگی کا اعلان کرے۔ اس کے حق میں یوں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس لوٹائے۔ تو نے آداب مسجد کا خیال نہیں رکھا۔ اسی طرح فرمایا کہ مسجد میں تجارت کرنے والے کے حق میں کہو کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس تجارت میں نفع نہ دے۔

مسجد میں شعر گوئی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ہاں ابتر اگر کوئی اچھی بات کہتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا ہے۔ تو جائز ہے۔ ایسی شعر گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسان بن ثابت سے منقول ہے۔ موجودہ زمانے کی طرح مسجد میں ہر قسم کی شعر گوئی کی اجازت نہیں۔ جن میں عشقیہ غزلیں گائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشاد الاشعار سے منع فرمایا۔

۱۔ ابوداؤد ص ۲۶۱ ۲۔ ترمذی ص ۴۷ ۳۔ مسلم ص ۲۱۱

۴۔ ترمذی ص ۲۶۱، دارمی ص ۲۶۶ ۵۔ ترمذی ص ۴۷ ۶۔

مسجد کی بے ادبی کے بعض دوسرے ذرائع سے بھی منع کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ماجہ شریف کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ چھوٹے بچوں یا کسی پاگل کو مسجد میں نہ آنے دو۔ وہ مسجد کی بھڑکتی کاباعت بن سکتے ہیں۔ چھوٹے بچے یا نابالغ و غیرہ کرٹے گا۔ وہ ابھی شور نہیں رکھتا اس جب بچہ پانچ سات سال کا ہو جائے تو مسجد میں آ سکتا ہے۔

الغرض! فرمایا اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کرتا ہے۔ اور مسجدوں کی بربادی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ فَمَا بَأْسُ الْيَهُودِ مَا كَانُوا يَكْفُرُونَ أَنْ يَخْلُقُوا هَذَا الْخَائِفِينَ ان لوگوں کا اصل میں حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر خوف کہتے رہتے۔ یعنی کفار اس لائق ہی نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ وہ خوفزدہ ہوں۔

الْخَائِفِينَ کا مطلب یہ بھی ہے کہ مسجد میں خشوع و خضوع کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ آؤ ذکر و تہنہ کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔ مسجد میں جمع و پکار اور ایسی ایسی دنیوی باتیں کرنے کی ممانعت ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے بَلَّغْ إِذَا مَرَدُّكُمْ بِرِجَالِ الْجَنَّةِ فَإِنْ تَعَوَّضُوا جب تم جنت کے باغوں میں جاؤ۔ تو وہاں چڑچڑکے یا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا جب تم مسجد میں جاؤ تو وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ اس کی تسبیح و تہلیل بیان کرو۔ تلاوت کرو۔ درود پاک کا ورد کرو۔ معتکف ہو کر خاموشی سے بیٹھو۔ اگر اعتکاف کی نیت کر کے بالکل خاموش بھی بیٹھو گا۔ تو باہر کی باتوں اور کسی گناہوں سے بچے گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر بھی پائے گا۔ مگر لوگ اکثر ایسا نہیں کرتے۔ مسجد میں فضول کہیں مارتے ہیں۔ خشوع و خضوع سے محروم ہوتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب خشوع و خضوع اٹھ جائے گا۔ آپ ایک بڑی مسجد میں داخل ہوں گے۔ وہاں پانچواں آدمی موجود ہوں گے۔ مگر ان میں ایک

بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جس کے چہرے پر خشوع و عاجزی کے آثار نظر آتے ہوں۔ سب فضول
حرکات میں مصروف ہوں گے۔

فرمایا جو شخص مساجد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے روکتا ہے۔ اور مسجد کی بربادی چاہتا ہے
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ لِّیْلے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے وَلَهُمْ فِي
الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور ان کے لیے آخرت میں بھی سخت عذاب ہوگا۔
اہل ایمان کو کم چھوڑنے کا ہڑاد کھٹ تھا۔ چہرہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز
پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قتل دی۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ مَشْرِق
اور مغرب سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ فَإِنَّمَا تَوَكَّلُوا تَمَّ مَدھر بھی رُخ کر دے فَشَاءَ
وَجْهَ اللّٰهِ تَمَّ الشَّرُّ کی توجہ اُدھر ہی پاؤ گے۔ لہٰذا تم کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس نہ کرو وَلِلّٰهِ
ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔

استقبال قبلہ

استقبال کعبہ کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ سفر کے دوران اذھیری رات
یا طوفان باد و باران میں اگر قبلہ کا رُخ معلوم نہ ہوتا، تو ہر شخص جس طرف رُخ ہوتا اسی طرح
نماز ادا کر لیتا۔ ترمذی شریف میں آتا ہے کہ ایسا ہی کوئی واقعہ صحابہ کرام کو پیش آیا جب
حضور علیہ السلام کو پتا چلا تو یہی آیت تلاوت فرمائی فَإِنَّمَا تَوَكَّلُوا فَشَاءَ وَجْهَ اللّٰهِ یعنی
تم نے جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ سب کی نماز درست ہے۔ اللہ تعالیٰ
کے ہاں مقبول ہے۔ اگر قبلہ کا رُخ درست نہیں تھا تب بھی نماز لوٹنے کی ضرورت نہیں۔

جب کوئی آدمی سواری پر سفر کر رہا ہو۔ تو جس طرف بھی وہ جا رہا ہے اسی طرف نفلی نماز ادا کر سکتے
صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام سفر پر تھے۔ اگرچہ آپ کا رخ مبارک قبلہ کی طرف
نہیں تھا۔ پھر بھی آپ نفلی نماز ادا کر لیتے تھے۔ تو ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا کہ تمہارا رُخ جس طرف
بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ اُدھر ہی متوجہ ہے إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا
اور سب کو جاننے والا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے حالات کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ بَلْ لَمْ يَكُنْ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
كُلٌّ لَّهُ قَانُونَ ﴿١١٦﴾ بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا
فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿١١٧﴾ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا
يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَنَزِّلُ آيَةً ۖ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ
كَافِرُونَ ﴿١١٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ
أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾

ترجمہ: اور کہا ان لوگوں نے کہ اللہ نے بیٹا بنالیا۔ پاک ہے اس کی ذات،
بلکہ اسی کے لیے بنے۔ جو پچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُن کی اطاعت
کرنے والے ہیں ﴿۱۱۶﴾ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کا
فیصلہ کرتا ہے۔ تو اُسے اُتاتا ہے۔ ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے ﴿۱۱۷﴾ اور کہا
ان لوگوں نے جو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کلام کرتا۔ یا
ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح کہا ان سے پہلے لوگوں نے ان
کی بات کی طرح۔ ان کے دل آپس میں جڑے جلتے ہیں۔ تحقیق ہم نے ان لوگوں
کے لیے آیات بیان کر دی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں ﴿۱۱۸﴾ بے شک ہم نے
آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ اور آپ
سے درجہ والوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا ﴿۱۱۹﴾

اللہ تعالیٰ والہو
سے پاک ہے

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے۔ ان آیات میں
ان کی ایک اور بدعتیہ گئی کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے۔
قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا اس غلط عقیدے میں یہ یمنوں مگر وہ شامل ہیں۔ یعنی

یہود، نصاریٰ اور مشرکین قَالُوا کی ضمیر ان تینوں کی طرف لٹتی ہے۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے کہ یہودیوں کے ایک فرقہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ اگرچہ تمام یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ تاہم ایک گروہ ایسا ہے جو اہل کتاب میں شامل ہے۔ مگر عقیدہ یہ رکھتا ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا عقیدہ تو واضح ہے۔ کہ یہ کھل کر کہتے ہیں الْفَرِیْسُ بْنُ اللَّهِ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ قرآن پاک نے یہ بات تصریح کے ساتھ بیان کی ہے۔ کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا بنانا اتنا قبیح فعل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، اس کے حکم سے زمین و آسمان پھٹ جائے۔ اور خدا تعالیٰ کا قہر نازل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا بڑی بیودہ بات ہے مشرکین عرب کے متعلق تصریح موجود ہے۔ کہ وہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا۔

اس باطل عقیدے کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَجْنُونٌ الشک ذات پاک ہے مبرا اور منزہ ہے۔ بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجوہ سے محبوب ہے۔ اگر بیٹا غیر جنس کا ہو تو یہ ان کے لیے عیب ہے۔ اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، فردانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔

مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے محبوب نہیں۔ کہ مخلوق عاجز ہے۔ اسے اولاد کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشتاق ہوتے ہیں اولاد کی عدم موجودگی میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت سے محروم ہوتے ہیں۔ برخلاف اسے اللہ تعالیٰ تو احد ہے۔ اس کی صفت تو بختی ہے۔ وہ صمد ہے۔ وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے۔ لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت بُری بات ہے۔

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے۔ کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے۔ اور پھر وہ بچے کی صورت میں لڑکے کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے۔ تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کو طرف کرنا بہت

قیح حرکت ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے۔ سُبْحَانَہ سے یہی مراد ہے۔
 جب انسان کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں نقصان
 آتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں یا تو تشبیہ آتی ہے۔ یا تنزیہ ہوتا ہے۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ
 مخلوق کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی جائے۔ مثلاً لانا ہر ما مخلوق کی صفت ہے اگر
 یہی صفت اللہ تعالیٰ میں ثابت کی جائے تو یہ تشبیہ کہ ارتکاب ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفت
 مختصہ کو مخلوق میں ثابت کیا جائے، تو شرک ہو جائے، مثلاً قادر مطلق، علیم کل اللہ تعالیٰ کی
 ذات ہے۔ اور اگر یہی صفت کسی مخلوق میں مانی جائے۔ تو شرک ہوگا۔ سُبْحَانَہ کا لفظ
 اللہ تعالیٰ کی اسی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔

صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے سُبْحَانَہ کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا:
 تَنْزِيهِهِ اللّٰهِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ بِرَقْمٍ كِي بَدَلِي دَرَجَبٍ سَے پاکیزگی۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن
 عباسؓ سے دریافت کیا کہ حضرت اللہ تعالیٰ کا معنی تو ہم جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے
 بڑا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب جی سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں الْحَمْدُ لِلَّهِ
 کا معنی یہ ہے کہ سب حمد و ثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ حضرت سُبْحَانَہ کا مطلب
 آپ سمجھادیں۔ آپ نے جواب دیا۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔ سُبْحَانَہ اللہ ایک ایسا کلمہ ہے۔
 جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے۔ کہ اس کلمے
 کے ساتھ میری تعریف کیا کرو۔ الغرض! یہ چاروں کلمات یعنی اللَّهُ أَكْبَرُ۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔
 الْحَمْدُ لِلَّهِ اور سُبْحَانَہ اللہ خدا تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرمائے ہیں مطلب یہ
 ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ تمام تعریضیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بَلَّ لَكَ مَا فِي السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں
 اور اللہ جل شانہ ان کا مالک ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں

سے ایک شخص رافع بن حریذ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کھنے لگا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو آپ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہِ راست کلام کرے۔ یا وہ کوئی خاص نشانی ہم سے پاس بھیجے۔ جسے دیکھ کر ہم تصدیق کریں۔ فرمایا: یوقونی اور حماقت کا سوال ہے۔ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اس طرح کی باتیں تزان سے پہلے لوگوں نے بھی کی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ پُرانا یہودہ ہوال ہے۔ آج کے دور کے کافر، مشرک اور جاہل لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ فلاں نشانی ہونی چاہیے۔ یا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا۔ فرمایا: تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ اس قماش کے تمام اگلے پچھلے لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے تودہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور لایعنی سوال پیش کرتے ہیں۔

حضور علیہ السلام
کے معجزات

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ لوگ کون سی نشانی طلب کرتے ہیں حالانکہ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ہم نے تو یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں یا معجزات دکھائیے ہیں۔ کسی ایک آدمی کو نشانی کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر تقریباً تین ہزار معجزات ظاہر فرمائے۔ اور یہ سارے ان لوگوں کے سامنے ہیں۔ کیا شق القم کا معجزہ کوئی دھکی چھپی بات ہے۔ کیا ان لوگوں نے کھجور کے خشک تنے کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کی نریں جاری ہو جانا کس کے علم میں نہیں یہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہے۔ مگر یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پختہ نبی ہیں اور جن کے دل میں عناد ہے اس قسم کی بے معنی باتیں وہی کرتے ہیں۔ البتہ نبی کے دل میں تکلیف ہوگی۔ غم لاحق ہوگا کہ اتنی واضح نشانیاں موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست باتیں کر کے فرشتوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یا اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کے برابر سمجھتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ یہ سب نابالغ مطالبات ہیں

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے۔ تو یقیناً دل میں فوس

حضور علیہ الصلوٰۃ
والسلام ایسے نسی

پیدا ہو گا۔ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلیمیت ہوئے فرمایا۔
 رَمَّا سَلَكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا قَدْ نَذِيرًا اے پیغمبر! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ نبی اور رسول
 بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اپنی امت کے لیے بشیر اور نذیر ہیں۔ یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری
 سناتے ہیں۔ اور منکرین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں۔ جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لازماً
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ آپ ان کی حرکات پر غمگین نہ ہوں۔ اور نہ ہی ان کے
 دوزخ میں جانے پر کوئی قلق محسوس کریں۔ کیونکہ وَلَا تَسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ
 آپ سے دوزخیوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے۔ بلکہ اِنَّ
 سَئِئًا مَّا سَأَلْتُمْ فِي سُعُرٍ اللہ تعالیٰ پر پھٹے گا۔ تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ
 تھی۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ سکیں سے بہہ رہی نہیں
 کرتے تھے۔ فضولیات میں گھسے تھے۔ اور روزِ قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔ لہذا آپ
 اُن کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ آپ کا کام صرف بھانا ہے
 باقی ان سے ہم خود نپٹ لیں گے۔

الْعَاقِبَةُ

درس چہل و ہفت ۴۷

البقرة ۲

(آیت ۱۲۳: ۱۲۴)

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مَتَابَهُمْ قَدْ
 إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ
 الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ
 (۱۲۰) الَّذِينَ اتَّيَهُمُ الْكُتُبُ يَتْلُونَهَا حَقِّ تِلَاوَةٍ أُولَٰئِكَ
 يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ تَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَافُونَ (۱۲۱)
 لِيَبْنِيَ اسْرَٰهُ يَلْذَكِّرُوا فِئْتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
 وَأَلِي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (۱۲۲) وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ
 عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
 وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۱۲۳)

ترجمہ: اور ہرگز راضی نہ ہونگے آپ سے یہودی اور نصرانی یہاں تک کہ آپ ان کی
 امت کا اتباع کریں۔ آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور
 آپ نے اگر ان کی خواہشات کا اتباع کیا۔ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا
 ہے۔ تو نہیں ہوگا۔ آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار (۱۲۰)
 جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تلاوت
 کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے گا
 پس یہی لوگ نقصان اٹھائیں گے (۱۲۱) اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں
 یاد کرو۔ جو میں نے تم پر کیں۔ اور یہ بات کہ بیشک میں نے تم کو جہان والوں پر
 فضیلت بخشی (۱۲۲) اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آئے گا کوئی نفس کسی کی
 طرف سے ذرا بھی۔ اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے بدلہ۔ اور نہ اس کو سفارش فائدہ
 دیں گی۔ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی (۱۲۳)

اتباع کرنے لگیں وَلَٰكِنْ اَتَّبَعْتَ اَهْوَاۡهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
 تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ اللہ کی طرف سے آپ کے کوئی
 حمایتی ہو گا اور نہ مددگار۔ یعنی اے نبی علیہ السلام اور اہل ایمان اب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی آخری
 کتاب ہدایت آچکی ہے۔ اگر اس کو چھوڑ کر اہل کتاب کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے۔ تو پھر
 اللہ تعالیٰ کی گرفت بھی آسکتی ہے۔ اگرچہ یہ آپ کے قطعاً ممکن نہیں کہ حق کو ترک کر دیں تاہم قانون
 کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ اسی
 کی پیروی کرنا ہے۔ اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا۔ یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ اور اس سے
 کوئی بھی بری الذمہ نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا
 لَٰكِنْ اَشْرَكَتَ لِيُخْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اگر آپ سے بھی شرک
 سرزد ہو گیا۔ تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اور آپ نقصان اٹھانے
 والوں میں ہوں گے۔ یہ اصول صرف حضور علیہ السلام کے لیے ہی نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام
 انبیاء علیہم السلام پر یہی وحی بھیجی کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ لہذا آپ حق کی پیروی کرتے
 رہیں اور اہل کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔

یہود و نصاریٰ کا دین اسلئے تو کتاب الہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا۔ اور وہ برحق تھا۔ مگر
 اب ان کی ملت تحریف کی وجہ سے بگاڑ چکی تھی۔ لہذا اب وہ قابل اتباع نہیں رہی۔ بلکہ اب تو
 آخری نبی کا دین غالب آئے گا۔ وہی قابل اتباع ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ
 رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اللّٰهُ تَعَالٰی وہ رحیم و کریم ذات ہے۔
 جس نے اپنے آخری نبی کو سچا دین سے کر بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کو مانتی ادیان پر غالب کر دے۔ جب
 مقصد رسالت دیکھو ادیان پر غالب ٹھہر کر یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہل کتاب
 کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ جسور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ کسری کی ہلاکت کے بعد کوئی
 دوسرا کسری پیدا نہیں ہو گا۔ اور قیصر کی ہلاکت کے بعد کوئی دوسرا قیصر نہیں ہو گا۔ مگر وہی معنی یہاں

نزدول مسیح علیہ السلام تک باقی رہیں گے۔ اور تم ان تمام سے با دست و گریبان رہو گے۔ کبھی ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور کبھی تم غالب آؤ گے۔ گویا یہ لوگ قرب قیامت تک باطل پر ڈٹے رہیں گے۔ لہذا ان سے قبول حق کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

اہل کتاب میں
اہل ایمان

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بات بیان فرمائی ہے۔ کہ جب کسی قوم کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم کے سرفہرست لوگ ایسے ہی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کی اکثریت ان صفات کی حامل ہے۔ ان میں بعض اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر یہی چیز بتائی جا رہی ہے۔ کہ اگرچہ اہل کتاب کی اکثریت ایسی ہے۔ جو اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹی ہوئی ہے۔ تاہم ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے۔ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ جو اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِالْآيَاتِ یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں تورۃ اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ جو لوگ سابقہ کتب کا دیر پر صحیح معنوں میں ایمان رکھیں گے۔ وہ ہی آخر الزمان کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تورۃ و انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اور جو حضور علیہ السلام پر ایمان لائے گا۔ وہ قرآن پر بھی ایمان لائے گا۔ یہ ساری کی ساری کتابیں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسلمان تو تمام کتب کا دیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر یہ کم نکتہ قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے۔ بہر حال فرمایا۔ کہ اہل کتاب سات کے سات بے ایمان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بھی ایسے ہیں جو کتاب کو صحیح طور پر پڑھتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگ ایمان دار ہیں۔

حق تلاوت

تلاوت کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ جو شخص زبانی تلاوت تو کرے مگر اس کے احکام کی پروا نہ کرے یا اس کے احکام کو توڑ موڑ کر پیش کرے یا اس کی غلط تاویل کرے۔ جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے۔ تو ایسے شخص نے تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بھی یہی اصول کار فرما ہے متذکر حاکم کی روایت میں آتا ہے۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تلاوت یہ ہے کہ کتاب کی مدال کردہ چیز کو مدال اور
حرام کردہ چیز کو حرام سمجھے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں مگر
استَحَلَّ حَآرَ مَکْذَہ جس نے قرآن پاک کی حرام کردہ چیز کو مدال سمجھ لیا۔ لہذا لازم ہے کہ
اللہ تعالیٰ کے مدال و حرام کی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ یہودیوں کی عرت اس کے الفاظ اور
کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ کتاب الہی کے محکم اور مشابہات تمام آیات پر ایمان ہونا چاہیے
محمیات میں ستمجاست بھی آتی ہیں۔ اُن پر بھی یقین ہونا چاہیے۔ اور غل کرنا چاہیے۔ یہ حق تلاوت
ہے۔ ایمان لانے کے بعد احکام کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اگر غل نہیں کرتا تو اس نے حق تلاوت
ادا نہیں کیا۔

مکون کیلئے
خار

فرمایا وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کفر کرے گا۔ یعنی اس کی
تلاوت کا حق ادا نہیں کرے گا۔ اس کے احکام کو چھپانے گا۔ اس کی غلط تاویلیں کرے گا۔ جیسا کہ
یہودی کرتے تھے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں
اس دنیا میں تو شاید نرا سے بچ جائیں گے۔ مگر ان کا انجام کاربرا ہوگا۔ اور آخرت میں یہ لازماً
خار پانے والوں میں ہوں گے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے احکام میں تحریف
کر کے اور کتمان حق کے ذریعہ کتنا نقصان دہ سودا کیا تھا۔

حق و باطل
کی پہچان

اہل کتاب کے دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک گروہ وہ ہے جس کی برائیاں مسلسل بیان ہو
رہی ہیں اور جو اپنی ضد و عناد کی وجہ سے ایمان سے محروم ہوا۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو کتاب
کو صحیح طریقے سے پڑھتا ہے۔ اور پھر اس میں تحریف کرنے کی بجائے اس کے احکام پر ایمان
لاتا ہے۔ انہیں لوگوں میں حضرت عبداللہ بن سلام ہیں۔ یہودی عالم تھے۔ مگر منصف مزاج تھے
عنصر علیہ السلام سے پہلی ملاقات میں ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ بار بار کہتے تھے کہ مجھے یقین
ہے کہ آپ ہی اسے تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ جن کی بشارت کتب سابقہ میں آچکی ہے۔
ان کی اکثریت متعصب تھی۔ جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور آج تک اُسی ڈگر پر چلتے آئے

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ اور میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی۔ بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کی فضیلت کا تذکرہ ان دروس میں تفصیلاً آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مرتبہ پھر بار دہائی کرانی۔ مگر یہ ایسی ناشکرہ کفار قوم تھے کہ حسد کی آگ میں جل کر تمام انسانیت کو مار گئی۔

قیامت کا
نقشہ

فرمایا ہے بنی اسرائیل! تم نہ سمجھنا کہ ان تمام برائیوں کے باوجود تم آخرت میں کسی نہ کسی عمر لیٹھے ہو خود ہو جاؤ گے۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا اس دن سے ذرہ جس دن کوئی کسی کے کچھ کا نہ آسکے گا۔ اُس دن انسان کے بچاؤ کے تمام ذرائع خواہ وہ قوت کے ذرائع ہوں یا گتہ دزاری کے سب ناکام ہو جائیں گے۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا۔ دنیا میں تو مال یا جان یا کسی قدر کے بدلے کوئی جان چھڑائی جاسکتی ہے۔ مگر قیامت کے دن مجرم سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ صرف اسکی اپنی جان ہی قابلِ مواخذہ ہوگی۔ فَرَأَى وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةُ اس دن کسی کی سفارش بھی سودمند نہیں ہوگی۔ اس دن کوئی کسی بہ بخت کی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ تمنا یہ غصہ، باطل ہے کہ سنت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں گرنے سے بچالیں گے۔ سفارش تو ایماندار کی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے جس سفارش کے زعم میں ہے بنی اسرائیل! تم بدلتا ہو اس کی قطعاً کوئی کنجاش نہیں۔ اس لیے اب بھی مجھ جاؤ۔ اور ایمان قبول کر لو۔

فرمایا جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو پھر وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اللہ رب العزت کی عدالت میں ٹھیک ٹھیک فیصلے ہوں گے۔ اُن فیصلوں کو بدل کر مجرمین کی مدد کرنے والی کوئی ہستی نہیں ہوگی۔ اگلی آیات میں قت ابراہیم کی تائیس سے شروع کر کے حضور علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا بیان ہے۔

البقرة ۲

(آیت ۱۲۳)

الْحَمْدُ
در سچل و بشت

وَإِذَا بَنِيَ آلُ إِبْرَاهِيمَ رَبَّهُ بِكَلِمَتٍ فَاتَمَّهِنَّ قَالَ لَأَنِىْ جَاعِلُكَ
لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (۱۲۳)

ترجمہ: اور اس وقت کو وہ بیان میں لاؤ، جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس
کے رب نے چند باتوں کے ساتھ۔ پس انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ (اللہ تعالیٰ
نے، فرمایا میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔) (ابراہیم علیہ السلام) نے
کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں

(۱۲۳)

گہشتہ دروس
پر ایک نظر

سورۃ بقرہ کی ابتداء میں قرآن پاک کے کتاب ہدایت ہونے کا بیان تھا۔ اس کے بعد
اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا۔ پہلا گروہ ہدایت کو قبول کرنے والوں کا دوسرا
منکرین کا اور تیسرا منافقین کا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع سے اپنی توحید کا اقرار
اور اپنی عبادت کے لیے کہا۔ پھر قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کو بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ
پیغمبر علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا ذکر کیا۔ اسی غنم میں اللہ تعالیٰ نے اگے تخلیق آدم
علیہ السلام اور پھر ان کی خلافت ارضی کا ذکر کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں طے ہو چکا تھا۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو کہ اپنے زمانے میں ایک عظیم قوم تھی
اُسے اُس وقت اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان خرابیوں کا تفصیل کے ساتھ
ذکر آتا ہے۔ جو بنی اسرائیل میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگرچہ بنی اسرائیل کی خرابیاں لاتعداد ہیں مگر
ان آیات میں ان کی چالیس کے قریب خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے
بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور فرمایا اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو اور ان کی نافرمانی نہ
کرو۔ فرمایا: وَاهْبِئْوا بَعَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اِسْ كِتَابٍ
ایمان لاؤ جس کو میں نے سب سے آخر میں نازل کیا ہے اور وہ سابقہ کتب کی مُصَدِّق ہے۔

يَسْبِيْنِي اِنْ سَرَّاهُ نِيْلًا اَذْكُرُوْا کے جملہ کو دوبارہ دہرایا گیا۔ اور اس قوم کو بار بار توجہ دلائی گئی۔ کہ وہ ہٹ دھرمی، غمہ اور غنا کو ترک کر کے حق کو قبول کر لیں۔ مگر یہ لوگ اپنے باطل حقانہ پر اڑے ہوئے ہیں اور پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی آخر کتاب قرآن پاک کا انکار کرتے ہوئے ہیں۔

قیامت کے متعلق بنی اسرائیل کا نظریہ درست نہیں ہے۔ شفاعت کے متعلق انہوں نے غلط عقیدے بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام باتوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ یہاں سے لیکر آگے روز تک حضور علیہ السلام کی نبوت، آپ کی صداقت اور حقانیت کا ذکر ہے۔ آپ کی معرفت نازل ہونے والی کتاب اللہ کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملتِ منیغہ کے پہلے اہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ کیونکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اسی ملت کے آخری اہم ہیں۔ اور پھر اسی ضمن میں مرکزِ ہدایت مکہ معظمہ، اس کی تاسیس اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے۔ یہ ساری باتیں آگے آرہی ہیں۔

یہاں سے لے کر لیس الیہ ان تولُّوا وُجُوْہَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ تک ملتِ ابراہیمی کا تذکرہ آئے گا۔ درمیان میں ضمناً اور بھی بہت سے مسائل آئیں گے۔ لیکن خیالاً طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت کا تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کئی ہزار سال پہلے دعا کی تھی: رَبَّنَا وَبَعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْهُمْ لَيُؤْمِنُوْا بِالْكَرِيْمِ! ان میں رسول بھیج۔ چنانچہ آپ کی نبوت کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پیدا ہونے والے دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر بھی آئے گا۔

امتحان کی غرض و غایت

یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں اُن امتحانات کا بیان ہے۔ جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو آزمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَافْتَبٰى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهِنَّ اور اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے بعض باتوں میں آزمایا۔ اِبْتٰى کا معنی امتحان یا آزمائش ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر آتا ہے بِكُوْنُفْهِمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالتَّيٰبٰتِ ہم نے اچھائی اور برائی کے ساتھ لوگوں کا امتحان کیا۔ تاکہ بات کھل کر سامنے آجائے۔ حدیث شریف میں حضرت عمرؓ کا قول ہے: بَلِّغْنَا بِالْاَسْرَآءِ فَصَبَرْنَا ہم کو تکلیفوں کے ذریعے آزمایا گیا تو ہم نے

نمبر کیا۔ مگر جس وقت ہمیں راحتوں کے ساتھ آزمایا گیا ہم صبر نہ کر سکے گویا ابستلی کا معنی آزمائش ہے۔
 یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آزمائش تو وہ ہے۔ جسے کسی کی اہلیت یا کارکردگی کا علم ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ تو عظیم کمال ہے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی جانتا تھا کہ
 آپ کس حیثیت اور قدر و منزلت کے نبی ہوں گے۔ اور پھر جس قدر بھی آپ میں اوصاف پائے
 جاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ تھے۔ تو ان حالات میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کی آزمائش کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آزمائش کی غرض و غایت یہ بھی ہوتی ہے
 کہ کسی کو آزمائش میں ڈال کر اس کی حیثیت کو دوسروں پر واضح کیا جائے۔ امتحان لینے والے کو
 تو علم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کیلئے مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہذا
 امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کی یہی غرض
 غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ جس ہستی کو میں نے اپنا خلیل
 منتخب کیا ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ جن کی بنا پر انہیں بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ الغرض
 اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ وہ چاہے تو انبیاء علیہم السلام کا امتحان لے لے۔ اور نہ چاہے تو
 ایک گنہگار کو معاف کر دے۔ بہر حال یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں کا ذکر ہے۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے مقام اُرم میں پیدا ہوئے جو موجودہ بغداد سے ساڑھے ستر میل
 کے فاصلے پر واقع ہے۔ اُس زمانے میں بابل آشوریوں کی سلطنت اور بڑا امجدان ملک تھا۔ یہ شہر
 کھدائیوں کا پتہ تخت جی رہا۔ مگر زمانے کی دست برد کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ اور تباہ و برباد ہو گیا
 اب اس کے کھنڈرات سے اس زمانے کی اشیائے حال نکال کر انہیں عجائب گھروں میں تبدیل
 کر دیے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کے کھنڈرات ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں ٹیکسلا کے کھنڈرات ہیں۔
 اسی طرح کے بعض مقامات سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کے کھنڈرات سے پرانی تہذیبوں
 کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالون بابل تھا۔ جس کے
 اب کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ تحریق زمانے میں یہ بہت بڑا شہر اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کا وطن مالون

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف آزمائشوں کے لیے یہاں پر کلمت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ تاہم مبہم ہے۔ مفسرین کرام بہت سی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی آزمائش کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب آپ نے ہوش و حواس سنبھالا اور ارد گرد کے ماحول مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آپ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے آپ کی اپنے والد، قوم اور بادشاہ وقت کے ساتھ کشمکش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل عمر میں ہی رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ تَبَيَّنَ لَكُمْ عَطَاكَ۔ چنانچہ آپ نے اپنے مشرک زاد ماحول کا یہ اثر یا کر آپ مشرک اور کفر سے متنفر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کفر و شرک کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ غاندان، قوم اور بادشاہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تو معمولی تنازعہ ہو جائے تو لوگ بھاگ جاتے ہیں مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ بچاس ساٹھ سال تک اپنے ماحول کے سامنے سینہ سپر رہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے عبادت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ دیا۔ تو آپ کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مخالف تو پہلے ہی تھے اب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے بتوں کی توہین ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ قوم کے ساتھ تھا۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا۔ حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا الْاِلٰهَتَكُمْ عِندَ بَارِئِ مَعْبُودُوْں کو جو نقصان پہنچا گیا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے بہت بڑی مقدار میں ایندھن جمع کیا گیا۔ اور پھر اُسے ایک کھائی میں اچھی طرح جلا کر بخنقیق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا۔ ان حالات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے اترے انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی کوئی ہزیمت فزع نہیں کی۔ اپنے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معافی کی کوئی درخواست نہیں کی۔ بلکہ نہایت خند ویشانی سے آگ میں ڈالے جانے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَرَادُوْا بِہٖ کَيْدًا جَعَلْنٰہُمْ الْاٰخِرٰیْنَ وَاٰیۃً دَاوِّیۡہِمْ جَاہِلَیۡہِمْ تھے۔ کسی طرح نصرت ابراہیم علیہ السلام کو صفحہ ہستی سے ناپید کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ ہم نے ان بیٹوں کو جی گھاٹے والا بنایا۔ یعنی ان سب کو ناکام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ثابت قدم رکھا۔ اور آپؐ اس امتحان میں کامیاب و کامران ہوئے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ہرگز یہ سیدہ سدرہ کو بعض اوروں میں آزما دیا۔ فَاتَّقِمْهُنَّ قرآن آپؐ ان آزمائشوں میں پورے اترے۔ یہ آپؐ کی پہلی بڑی آزمائش تھی۔

دوسری آزمائش
وطن سے ہجرت

اتنی بڑی آزمائش دیکھنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم آپؐ پر ایمان نہ لائی۔ بلکہ آپؐ کو ایک دوسرے امتحان سے کھڑا پڑا۔ آپؐ کا نانا دان ایک یونی حضرت سارہ اور خدیجہ حضرت لوط علیہ السلام پر مشتمل تھا۔ لوط علیہ السلام بچپن ہی سے آپؐ کی تحویل میں تھے۔ اور آپؐ پر یقین بھی رکھتے تھے۔ اتنی بڑی مومن عظمت میں کوئی دوسرا شخص ایمان نہیں لایا۔ اگرچہ قوم پہلے منصوبے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کے دشمن تھے۔ اور آپؐ کے قتل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہجرت کا حکم دیا۔ یہ آپؐ کی دوسری آزمائش تھی۔ ہجرت کرنا یعنی وطن اور گھر بار چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ تو نبی اس کی تعمیل میں ذرا تاقل نہیں کرتا۔ بلکہ نبی کے ساتھ اگر اہل ایمان کو بھی ہجرت کا حکم دیا جائے تو وہ اس کھٹن گھاٹی کو عبور کر لیتے ہیں۔ ہمارے نبی آخر الزمان علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی ہجرت ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے تو وَالشَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُہَاجِرِينَ کہہ کر ان کی تعریف فرمائی۔

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم پر بیک کتے ہوئے ہجرت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور فرمایا إِنِّي مُہَاجِرٌ إِلَى رَبِّي میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے یوحیٰ اور ہتھیجہ کے عہدہ بابل اور عراق کو چھوڑا۔ آپؐ کو مصر کے راستے سے شام اور فلسطین پہنچنے کا حکم تھا۔ راستے میں شرق اردن کے علاقے میں بحریت آتا ہے۔ اس کے کنارے پر بڑے مومن لوگ آباد تھے۔ انہوں نے جلی دربت کا نظریہ جو امت قائم کر رکھا تھا۔ اس مقدمہ پر حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ تم یہیں قیام کرو۔ اور ان لوگوں کو دین حق کی دعوت دو۔ چنانچہ آپؐ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے یونی بچے کے عہدہ آگے شام اور فلسطین اور ہجرت تک چلے گئے۔ منہ میں آپؐ کو ایک اور آزمائش

سے دوچار ہونا پڑا۔ جب وہاں کے ظالم حاکم نے آپ کی بیوی حضرت سارہؓ کو قبضہ میں کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور اس جابر حاکم سے نجات دلائی۔

تیسری آزمائش
بیوی بچے سے
جہائی

مصر کے حاکم نے حضرت سارہؓ کو ایک لڑائی دی تھی۔ اگرچہ وہ لڑائی نہیں جیتی مگر اس وقت وہ لڑائی کی حیثیت میں تھی۔ حضرت سارہؓ نے باجبرہ لڑائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دی۔ اور اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بن گئی۔ شام و فلسطین کے قیام کے دوران حضرت ہاجرہؓ سے بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام امی اسمعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ حضرت اسمعیل علیہ السلام بھی شہ خوار کی عمر میں تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا کہ اے ابراہیم! اس بچے اور اس کی ماں کو عرب کے دور دراز بیابان وادی غیریٰ زرع میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے حکم کی تعمیل میں بیوی اور بچے کو بھرا لیا۔ اور وہ موجودہ مکہ مکرمہ والے مقام پر پہنچے۔ جو کہ اس وقت بے آب و گیاہ وادی تھی۔ اس مختصر قافلے کے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ ایک شکاریزے میں تھوڑا سا پانی اور کچھ کھجوریں تھیں۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر اور بیوی کے پاس چھوڑ کر چلے آئے۔ یہ سارے واقعات آپ سنتے بہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی جاتے اور اپنے بیوی بچے کی خبر گیری کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس بیابان وادی میں زمزم جیسے بہترین پانی کا انتظام فرمادیا۔ پھر وہاں بنو جرہم قبیلہ کے لوگ آباد ہو گئے۔ اور اس طرح وہ دیران اور غیر آباد جگہ بستی میں تبدیل ہو گئی۔

چوتھی آزمائش
بیٹے کی قربانی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور بڑی آزمائش آئی۔ جب حضرت اسمعیل بارہ تیرہ سال کے ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا کہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ اس واقعہ کی تفصیل بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات پر آئی ہے۔ آپ کو بار بار خواب آیا۔ آخر آپ نے اس کا ذکر بچے سے کیا۔ بچہ بڑا صابر تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں۔ چنانچہ آپ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ حتیٰ کہ بیٹے کی گردن پر پھری چلا دی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ اس نے قربانی بھی قبول کر لی اور بچہ بھی صحیح سلامت نکلا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جان، مال، اولاد ہر طریقے سے آزمایا۔ اہل آپ اس آزمائش میں پستے اترے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس ثابت قدمی پر جو انعامات عطا کیے۔ ان کا ذکر بھی قرآن پاک میں آتا ہے۔

احکام القرآن کے نام سے بہت سے بزرگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حلال و حرام سے متعلق قرآنی احکام کی تشریح کی گئی ہے۔ سب سے پہلی تفسیر امام ابو جبر حسان نے کی ہے۔ یہ حنفی امام ہیں ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ ان کے بعد پانچویں صدی میں امام ابو جبر بن العربی بموئے میں آپ کا تعلق بنی ملک سے ہے۔ اور آپ کا وطن مالوف اندلس تھا۔ آپ بھی بہت بڑے مفسر قرآن تھے۔ حضرت امام شافعیؒ کی احکام القرآن موجود ہے۔ اگرچہ انہوں نے خود یہ کتاب نہیں لکھی۔ مگر امام بیہقیؒ نے ان کی کتابوں سے متعلقہ تفسیری آیات کو منتخب کر کے علیحدہ کتابی صورت دی ہے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کے محدث اور امام ہیں۔ کشف اور سلوک کے بہت بڑے امام شیخ ابن عربیؒ ساتویں صدی میں بموئے میں۔ انہوں نے بھی احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے حلال و حرام کے مسائل کی بجائے تصوف پر زیادہ مسائل جمع کیے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو بھی احکام القرآن تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے اپنے بعض شاگردوں اور مریدوں کو اس کام کی تکمیل کے لیے کہا۔ چنانچہ احکام القرآن کا ایک حصہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اور دوسرے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تالیف کیا اور ایک حصہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ابھی بقایا ہیں۔ جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

الغرض امام ابو جبر بن العربیؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے کہ سورۃ نجم کی آیت **وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى** کا یہی مطلب ہے کیا تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خبر نہیں پہنچی۔ جنہوں نے پورا پورا کر دکھایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آیا۔ انہوں نے پورا کیا۔ اور اس طرح ہر آزمائش پر پورے اترے۔ آپ نے اپنا سارا مال مہمانوں اور محتاجوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ اکیلے کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب تک کوئی نماز نہ شامل ہو جاتا۔ آپ نے اپنے آپ کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی ذرا پس و پیش نہ کیا۔ اپنے قلب کو ہمیشہ رمان کے سلسلے رکھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف کر دیا اور آپ ہر سختی میں کامیاب ہوئے۔

استحسان میں
سومیاں

حضرت ابراہیم علیہ السلام
ام ان سید

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ مبارک ہستی ہیں کہ جب ان امتحانوں میں کامیاب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر انعام مرحمت فرمایا قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًاؕ میں تم میں لوگوں کا امام یعنی پیشوا بنانے والا ہوں۔ امام وہ ہوتا ہے جسکی اقوال و افعال میں اقتداء کی جلتی۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امت کے امام ہوتے ہیں وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اِبْرٰهٖمَ یٰحٰقْدُوْنَ بِاٰمُرِنَا مُجْرِبًاؕ حکم سے امت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بن کا ذکر خیر ہو رہا ہے، وہ تو امت عینیت کے بہت بڑے امام ہیں۔ آپ کا لقب ابوالانبیاء ہے۔

آپ تمام بعد میں آنے والے انبیاء علیہم السلام کے باپ اور جد امجد ہیں۔ الغرض تمام آذنانہوں میں سے گنتے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مژدہ سنایا کہ اے ابراہیم! میں تجھے لوگوں کا امام یعنی پیشوا بناتا ہوں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کا انعام پایا تو فوراً درخواست پیش کر دی۔ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ عَمِلْ صَالِحًاؕ مولاکریم! جس طرح تو نے مجھے منصب

ظالم محروم ہے

امت سے نوازا ہے۔ کیا یہ سلسلہ میری اولاد میں بھی جاری رہے گا۔ کیا میری اولاد بھی اس عمدہ و جلیل پر فائز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ منصب امت صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ قَالَ لَا یَسْکُنُ الْعَهْدِی الْظٰلِمِیْنَؕ فرمایا میرا یہ وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ظالم اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے منصب امت عطا کیا جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے حصے میں آتا ہے۔ اور یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو چیز عطا ہوئی۔ وہ نبوت ہے۔ فقہاء و محدثین حکامین وغیرہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے آنکھ نہ پکھنے کے وقت کی مہتداری بھی کفر یا شرک کیا ہو تو وہ عمدہ نبوت کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس قدر پاک رکھتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں۔ ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے۔ اس آیت کی رو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک امت کے قائل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سر بلند رکھنے والے ہیں۔ کوئی بھی ظالم ہیشوالی کے لائق نہیں ہے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُعَلِّينَ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ (۱۲۵)
وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمِيقَ قَلِيلُهُ ثُمَّ أَصْطَرَّةَ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (۱۲۶)

ترجمہ: اور اس بات کو دسیان میں لاؤ۔ جب کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے رجوع اور امن کی جگہ بنایا۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑا ہونے کی جگہ کو معلیٰ یعنی نماز کی جگہ بنا لیا۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھو ۝ (۱۲۵) اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ جو کوئی ان میں سے ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اور جس شخص نے کفر یا میں اُسے نختہ دے دن تک فامہ سپناؤں کا۔ چہرے کٹاں دوزخ کے عذاب کی طرف سے جاؤں گا۔ اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بُری جگہ ہے ۝ (۱۲۶)

گزشتہ
پیوستہ
بنی اسرائیل کی خبروں کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت بھی بیان ہوئی ہے۔ مگر اس سلسلہ کی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے شروع ہوئی۔ کیونکہ اگلی آیات میں اس دعا کا

ذکر ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق کی تھی۔ مگر اس سائے سلسلہ کی بنیاد تو وہاں سے شروع ہوئی ہے۔ مگر پہلے قسیدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور پیشوائی کا ذکر فرمایا ہے آپ پر آنے والی آزمائش کا ذکر آیا۔ اور پھر ان تمام امتحانوں میں آپ کی کامیابی کا بیان بھی آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امامت عامہ بھی عطا فرمائی۔ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اِس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے متعلق بھی دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا یَتَّکِلْ عَہْدِیَ الظَّالِمِیْنَ میرے ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ وہ منصب امامت کے اہل نہیں ہوں گے معلوم ہوا کہ امامت میں سے حصہ اس کو بٹے گا۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نیک اور صالح ہوگا۔ اور کفر و شرک کا مرتکب اس کا حصہ نہ لے سکے گا۔

شیعہ امامیہ کا
غلط استدلال

شیعہ امامیہ نے اس آیت سے بہت غلط استدلال کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ صاحبان دعوٰی باللہ امامت کے اہل نہیں تھے۔ کیونکہ زندگی کے پہلے حصہ میں وہ کفر و شرک کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور ایمان بعد میں لائے۔ بر خلاف اس کے حضرت علیؓ اوائل عمر سے ہی مومن تھے۔ لہذا خلافت کے اہل وہ تھے۔ شیعہ حضرات نے یہ غلط استدلال کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ ابتداء میں کفار میں شامل تھے۔ اسی طرح خالد بن ولیدؓ سَیِّفٌ مِّنْ سَیُّوفِ اللّٰہِ حضرت ابو عبیدہؓ حضرت عباسؓ حضرت عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور حضرت خلیلؓ اور آپ کے دیگر چچا زاد وغیرہ سب کے سب ابتدائے نبوت کے زمانہ میں اسی سوسائٹی کا حصہ تھے۔ جو مشرکین مکہ کی سوسائٹی تھی۔ مگر جوں جوں اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ عطا کرتا رہا۔ یہ اصحاب ایمان کی دولت سے مشرف ہوتے رہے۔ اور اپنے کفر و شرک پر مبنی سابقہ عقائد سے تائب ہو گئے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَعَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ لَکِنِّہٖ سَعۃٌ مِّنۡ تَوْبَہٗ کَرۡہِیۡہٗ۔ گویا کہ اس نے کوئی گناہ

کیا ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے۔ **اَلْاِسْلَامُ كَيْفَ فَرَمَا كَانَ قَبْلَهُ سَلَامٌ** لانے کے بعد مومن کے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمام صبیحہ کرام ض۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر سابقہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے۔ لہذا اس کے باوجود ان پر کفر و شرک کا الزام لگانا قبیح حرکت ہے۔ اور مذکورہ آیت کریمہ سے غلط استدلال ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کا تذکرہ بیان فرمایا۔ **وَلَاذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمِّنًا** اس بات کو خیال میں رکھو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے مٹا بار امن والا بنایا۔ بیت اللہ سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ اور مٹا بہ کے دو معنی آتے ہیں۔ پہلا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہاں بد بار آتے ہیں۔ لوگوں کا ذوق و شوق انیس دنیا کے کونے کونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و عبادت کے لیے کھینچ کھینچ کر لاتا ہے۔ وہاں پر ایک مرتبہ پہنچ جانے والا سیراب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا ذوق و شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح وہ پھر وہیں پہنچ جائے۔ **مَثَابَةً** کا یہی معنی ہے۔ اور اس ضمن میں تعلیم بھی سی دی گئی ہے کہ حاجی طوافِ دواغ کے وقت یہ دعا مانگے۔ اے اللہ! یہ میرا آخری عہدہ ہو کہ مجھے پھر بھی موقع دے کہ میں تیرے گھر کی زیارت کروں۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو **هُدًى لِّلْعَالَمِينَ** یعنی دنیا بھر کے لیے ہدایت کا مرکز بنایا ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مَثَابَةً کا دوسرا معنی "ثواب کی جگہ" ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقدس مقام پر جس قدر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ پر نہیں ملتا۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے۔ مسجدِ حرام یعنی حرم شریف میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری جگہ پر ایک لاکھ نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص بیت المقدس یا مسجد نبوی میں ایک نماز ادا کرتا ہے۔ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب پاتا ہے۔ بہر حال یہاں پر مٹا بہ کے دونوں معنی ہیں یعنی مرکز ہدایت اور ثواب کی جگہ۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب نے بیت اللہ شریف کو امن والی جگہ بنایا۔ ظاہر ہے۔ جو شخص ایمان کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے آخرت کے عذاب سے امن مل جاتا ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی جو کوئی احرام کی حالت میں وہاں جاتا ہے۔ اس کو پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ درحکم مقام پر فرمایا: مَنْ دَخَلَہٗ كَانَ اٰمِنًا

ہم اہم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی مجرم حرم میں داخل ہو جائے۔ تو اس کے خلاف تعزیری کارروائی حرم میں بھی جائز ہے۔ اُسے حرم سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پھر حد جاری کر دی جائے گی۔ بعض دروگر ائمہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی قاتل جیسا بڑا مجرم بھی حرم میں داخل ہو جائے تو اُسے وہاں کچھ نہ کہو! اس کا دامن پانی بند کر دو۔ جب مجبور ہو کر خود ہی حدود حرم سے باہر آئے تو اس پر حد جاری کر دی جائے۔ گویا یہ مقام ظاہری طور پر بھی گمراہ امن ہے۔

مقام ابراہیم

بیت اللہ شریف کے ضمن میں مقام ابراہیم کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰہِیْمَ مُّمَلِّیْنَ اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو — نماز کی جگہ بناؤ۔ مقام ابراہیم سے مراد کوئی کمرہ نہیں ہے۔ جہاں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی۔ آپ کے پاؤں مبارک کے نشانات اس پتھر پر اب بھی موجود ہیں۔ یہی وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر حج کا اعلان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا: وَادْخُلْ فِی السَّائِسِ بِالْحَجِّ۔ اے ابراہیم! لوگوں میں اعلان کر دو کہ اللہ تعالیٰ کا کھڑ تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کاج کرنے کے لیے آؤ۔ تفسیر مدارک میں آتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ پروردگار! میری آواز کون سنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا کَامِ اَعْلَانِ کرنا ہے۔ میں اس آواز کو تمام نسل النبی کی پشتوں تک پہنچا دوں گا۔ جن کی قسمت میں بیت اللہ کاج مقدر ہے۔ ان تک آپ کی آواز پہنچے گی۔ بہر حال مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس کے متعلق فرمایا کہ اس کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ۔

سنت عمرؓ کی فضیلت کے باب میں حدیث شریفین میں آتا ہے کہ آپؐ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ تم شیعیان پر نماز پڑھنے کا حکم ہو۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی: **وَتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ رَبِّكُمْ مُمَكِّلًا**۔

مقامِ ابراہیمؑ تقریباً چودہ انچ مربع چھوٹا سا پتھر ہے۔ حور: بیت اللہ شریف کے قریب ہی تعمیر کعبہ کے وقت سے پڑا ہے۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے پتھر کو تسلی بنا کر اس کے اوپر تو نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ تاہم اس سے مراد یہ ہے کہ پتھر کے قرب و جوار میں نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ ہر طواف کرنے والا طواف کے صلت چکر پٹے کرنے کے بعد دو رکعت مقامِ ابراہیم کے قریب ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے بالکل قریب جگہ نہ ملے تو پیچھے کہیں بی دو رکعت واجب الطواف ادا کر لیے جاتے ہیں۔

اہم عظیم البرصیفہ کے نزدیک عتبات کے دو رکعت واجب ہیں۔ جب کہ دوسرے حکم کرام اُسے سنت کہتے ہیں۔ بہر حال اس مقام پر نماز پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت ہے۔ پہلے یہ پتھر ایک چبوترے پر رکھ ہوا تھا۔

مگر موجودہ حکومت نے مقامِ ابراہیمؑ کے چبوترے اور زمزم کے چبوترے کو بنادیا ہے۔ اور اب مقامِ ابراہیمؑ شیشے کے ایک خیمہ بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے اوپر پتیل کی ٹولیسورت جالی لگا دی گئی ہے۔ اور اس طرح بند کی دہری حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کہ اگر کسی جسے ایک خول کو نقصان پہنچے تو کم از کم دو سو روپے ہے۔ حکومت سعودیہ نے لاکھوں دیال کے خرچ سے حفاظت کا یہ انتظام کیا ہے۔ اب مقامِ ابراہیمؑ دور سے تو نظر نہیں آتا۔ مگر جالی کے قریب کھڑے ہو کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ اس پر حضرت

ابراہیم علیہ السلام پاؤں کے نشان موجود ہیں۔ یہ پورا دس انچ بابِ نعمت سے عموماً فاصلے پر مطاف میں رکھا ہوا۔ عام ایام میں تو طوفین مقامِ ابراہیمؑ اور بیت اللہ شریف کے درمیان ہی چلتے ہیں۔ عکرام حج میں جوں جوں رش بڑھتا ہے۔ عکرام ہر طواف کرنے والوں کے درمیان میں آجاتا

ہے۔ اور لوگ اس کے دونوں طرف سے گزرتے بہتے ہیں

بیت شریف
کی صفائی

مقام ابراہیم کے تذکرے کے بعد پھر بیت اللہ شریف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَعَهْدْنَا إِلَىٰ اٰبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ ہَمۡ نَعۡمۡ اَبْرٰهٖمَ اور اسمعیل علیہما السلام کو حکم بھیجا اَنْ طَهِّرَا بَيْتَیَّ لِلطَّٰہِیِّیۡنِ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں طواف کرنے والوں کے لیے وَالْعٰکِفِیۡنِ اور اعتکاف بیٹھنے والوں کے لیے وَالتَّوَكُّعِ السَّجُوۡدِ اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ پاک و صاف رکھنا دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ یعنی ظاہری پاکیزگی اور باطنی پاکیزگی۔ چونکہ حج و عمرہ کے لیے دو روزہ سے لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔ اس لیے ان کی سہولت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ظاہری صفائی کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک کو ہر قسم کی غلطی بدبود وغیرہ سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ لوگ وہاں عبادت کے لیے آتے ہیں۔ وہاں اعتکاف بیٹھتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور دیگر وظائف میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تم دونوں باپ بیٹا میرے مہمانوں کی خاطر اس گھر کو ہمیشہ پاک صاف رکھو۔ جس طرح بیت اللہ شریف کی پاکیزگی قائم رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح عام مساجد کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے۔ سورۃ ناز میں ارشاد ہے فِیۡ بُیُوتِ اٰذِنَ اللّٰہُ اَنْ تَرْفَعَ وَیُذَکِّرَ فِہَا اَسْمَۃُ اَنْ تَحْمَدُوۡا اللّٰہَ تَعَالٰی حَتّٰی تَنْہَیۡ کُنْہَ کا حکم دیا ہے۔ اور وہاں اس کا نام ذکر کرنے کو کہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے۔ قَطِّفُوۡا اگر تم نے گھر میں بھی کوئی جگہ نماز کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ تو اس کو بھی پاک صاف رکھو۔ ظاہر طور پر وہاں کوئی کوڑا کاٹا یا گندگی نہیں رہنی چاہیے۔

مساجد کی صفائی

مساجد کی باطنی صفائی کا مطلب یہ ہے کہ وہاں پر کوئی مشرکانہ حرکت نہ کی جائے اور نہ ہی وہاں پر نیروی باتیں کی جائیں۔ جس طرح بدن کی طہارت ضروری ہے۔ اسی طرح عقل اور دل کی طہارت بھی ضروری ہے۔ اگر دل کے کسی کونے میں شرک و نفاق کا کوئی شائبہ بھی ہو گا تو پورے کا پورا انسان ناپاک ہو گا۔ اسی لیے ارشاد درباری ہے۔ اِنَّکُمۡ الْمُشْرِکُوۡنَ فَجَسَّ

یعنی مشرکین میں ان کے دلوں پر شرک کی نجاست پڑی ہوئی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ دل و
 دماغ کفر، شرک، بدعت و دیگر خرافات سے پاں و درتسہ توجیہ پر صحیح طریقے سے ایمان ہو۔
 حضرت مولانا جید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ملت کو پایہ کی بھی ضروری ہے۔ ہماری ملت
 میں کفر، شرک و بدعت کی جو کنگھی سرایت کر چکی ہے۔ اس سے بھیچا بھڑانا بھی ضروری ہے۔ گند
 مٹانے پر دردی ملت کو ناپاک کر رکھا ہے۔ لہذا انفرادی طہارت کے ساتھ ساتھ اجتماعی پاکیزگی کی
 بھی ضرورت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کی خصوصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ صحیح احادیث میں آیت ہے کہ آپ
 سب سے پہلے شخص اول من اُختلن میں جنہوں نے غنڈہ یا تفسیری روایتوں میں یہ ہی آیت
 کہ انبیاء علیہم السلام تختوں پر بیٹے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے نہیں ہوئے۔ انہیں کسی
 سال کی عمر میں ختنہ کا حکم ہوا۔ چنانچہ تادم کے مقام پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے سنتِ تطہیر ادا
 کی۔ اب حتم یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اسے چاہیے کہ یہ سنت ادا کرے، خواہ عمر کے کسی
 حصے میں ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان میں جن کی
 دماغی میں سفید بال نکلنے شروع ہوئے۔ آپ سے پہلے کسی انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا سب
 کی دماغی سیاہی۔ مگر آتی تھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں داخل
 ہوئے۔ تو سفیدی دیکھ کر عرض کیا۔ مولا کریم! یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار ہے۔ آپ نے
 پھر عرض کیا۔ اے اللہ! زِدْنِي وَقَارًا میری اس عزت کو در بڑھاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اللہ کریم کی وحی آئی کہ اے ابراہیم! اَنْتَ اَكْرَمُ اَهْلِ
 الْاَرْضِ اِلٰی آپ میرے نزدیک روئے زمین کے تمام انسانوں سے برگزیدہ ہیں۔ جب آپ
 نماز ادا کرتے وقت حالتِ سجدہ میں ہوتے ہیں تو آپ کا سر نہیں کھنکھاتا چاہیے۔ چنانچہ سب سے

۱۔ السلام الرحمن فی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۶۵ ۲۔ تفسیر عزیزی ص ۲۲۹ پ

۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱ ص ۲۲۹ ۴۔ تفسیر عزیزی ہندی ص ۲۲۹ ۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱ ص ۲۲۹

پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پا باندھنا۔ اگرچہ تہ بند پہننا بھی درست ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پا باندھنا بھی سنا کر دو۔ اور تہ بند بھی باندھا کر دو۔ یہود تہ بند نہ باندھتے تھے۔ آپ نے دونوں چیزوں کی بابت فرمائی۔ آپ نے پا باندھنے کی تعریف فرمائی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں ملا۔ تاہم پا باندھنا ضروری ہے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں آتا ہے کہ منبر پر کھڑے ہو کر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خطبہ دیا۔ اور دُئی کی روایت میں ہے کہ مہمانوں کی خاطر سب سے پہلے آپ نے نان شیر مال تیار کیا۔ یہ کھانا دو دو اور نان کے مرکب سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر میں حیدر آباد دکن اور کھنڈوالے بڑے شوق سے تیار کرتے ہیں۔ اور مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ بڑی لذیذ چیز ہے اسی طرح معافقے کا طریقہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوا۔ جب کوئی شخص باہر سے آتا تو آپ اس سے گلے ملتے۔

معافقے کا
پس منظر

کہتے ہیں کہ بیت المقدس کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام جانوروں کی چراگاہ کی تلاش میں کسی پہاڑ کے اندر تک چلے گئے۔ انہوں نے ایک مقام پر نہایت غناک آواز سنی۔ کوئی شخص نہایت خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ آپ اُدھر متوجہ ہوئے۔ تو دیکھا کہ ایک ضعیف عمر شخص اپنے حال میں محو ہے۔ آپ نے اس بڑے شخص سے دریافت کیا کہ تم کس کو یاد کر رہے ہو۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ کو۔ آپ نے پوچھا تمہارا اللہ کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا آسمان پر ہے۔ فرمایا زمین پر بھی وہی خدا ہے۔ پھر آپ نے پوچھا تمہارا قبلہ کدھر ہے۔ تو بڑھے نے بیت اللہ شریف کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پوچھا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا نیچے اسی غار میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑھے کا ٹھکانا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو بڑھے نے کہا کہ دباں جانا محال ہے۔ کیونکہ راستے میں گہری ندی پڑتی ہے۔ جسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کاتم کیسے پہنچ جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا خرق عادت

کے طور پر چلا جاتا ہوں۔ یہ ایک کرامت ہے۔ جس کی وجہ سے میں خشک پاؤں نذی کو عبور کر لیتا ہوں
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا چلو ہم بھی اسی طریقے سے چلتے ہیں۔ جو خدا تمہارے لیے پانی کو مسخر
کرتا ہے۔ وہ میرے لیے بھی کرے گا۔ چنانچہ دونوں چل پڑے۔ غار میں اترے تو آگے نذی تھی۔
اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُسے غور کر لیا۔ اور آپ کے پاؤں تک نہیں بھیگے۔ پانی کے نیچے آپ
اُس شخص کے عبادت خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ اس کی نشاندہی کے عبادت خانے کا رخ واقعی بیت اللہ
شریف کی طرف تھا۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یہ خدا پرست انسان ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے بزرگ یہ یاد کر سب سے خوفناک دن کون سا ہے۔
تو اس نے جواب دیا کہ جس دن اللہ تعالیٰ کو سی عدالت پر بیٹھے گا۔ اور نبی اور اللہ تعالیٰ کے
سب مقرب لڑ رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم
دونوں کو اس دن کے خطرات سے محفوظ رکھے۔ بوڑھا کہنے لگا۔ کہ مجھے دعا کرتے ہوئے تین
سال ہو گئے ہیں مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہاری
دعا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس پہاڑ میں گیا۔ تو مجھے ایک نوجوان ملا جس کے بال بکھرے ہوئے
تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے
دوست ابراہیم علیہ السلام کے جانوروں کے لیے چراگاہ تلاش کر رہا ہوں۔ بوڑھا کہتا ہے کہ اس
دن سے میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ اے مولا کریم! اگر دنیا میں تیرا کوئی خلیل ابراہیم علیہ السلام
بھی ہے۔ تو مجھے اس کی زیارت نصیب فرما۔ مگر آج تک میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حضرت
ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا بڑے میاں! اللہ تعالیٰ نے تیری دعا قبول فرما لی ہے اٹھو اور میرے
ساتھ معافہ کرو۔ چنانچہ معافے کا طریقہ دہاں سے جاری ہوا۔

حج کی فضیلت

بیت اللہ شریف کی تعمیر کا تذکرہ آگے آئے گا۔ پہلے کعبۃ اللہ اور حج کی فضیلت کے متعلق
کچھ بیان ہوگا۔ صحیح احادیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ
کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل میں حج کیا۔ تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے۔ گویا کہ

وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ بیت اللہ شریف پر ہر روز ایک بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں پر، چالیس دیگر عبادت کرنے والوں پر اور بیس اُن لوگوں پر نازل ہوتی ہیں جو بیت اللہ شریف کی طرف دیکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **النَّظَرُ إِلَى الْكَعْبَةِ عِبَادَةٌ** یعنی بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ البتہ طواف کے دوران کعبہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ طواف سے فداغ ہو کر نہایت ذوق و شوق اور محبت سے بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا چاہیے۔ صحیح روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حجر اسود جنت کے یا قوتوں میں سے ایک یا قوت ہے۔ یہ پتھر بہشت سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سورج کی طرح یہ مشرق و مغرب کو روشن کرتا۔

طواف کا
جمہ و ثواب

تاریخ از رقی میں آتا ہے کہ طواف کی نیت سے گھر سے چلنے والا شخص ایسا ہے۔ جیسے کہ وہ دریائے رحمت میں چنا شروع کر دیتا ہے۔ جب مطاف میں پہنچتا ہے۔ تو گویا رحمت کے دریا میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جب طواف شروع کرتا ہے۔ تو ہر قدم اٹھانے کے عوض اُسے پانچ سو نیکیاں مل جاتی ہیں۔ اور جب قدم نیچے رکھتا ہے۔ تو ہر قدم کے بدلے پانچ سو گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور جب وہ شخص طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیمؑ تک آتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے کہتے ہیں کہ اے بندے! تیرے سابقہ گناہ تو داخل گئے۔ اب آئندہ زندگی میں محتاط رہو۔ اعمالِ صالحہ انجام دیتے رہو۔ اسنے میرے اچھی زندگی کا آغاز کرو۔

حرم پاک

حرم پاک کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرمت والا خط بنایا ہے۔ کسی کے لیے اس میں لڑائی کرنا حلال نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن تھوڑی دیر کے لیے صرف میرے لیے حرم میں لڑائی حلال ہوئی تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد حرم شریف میں لڑائی قطعاً حرام ہے۔ یہ خط ہمیشہ محترم ہے اور امن والا شہر ہے۔ چنانچہ یہاں پر

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذْ قَالَ رَبُّهُمُ
جِب اِبْرٰہِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِنِّیْ کَمَا رِبِّ اَجْعَلْ ہَذَا بَلَدًا اٰمِنًا اے مولا کریم! اس شہر
 کو امن والا بنائے۔ دوسرے مقام پر ہَذَا الْبَلَدُ کا لفظ آتا ہے۔ گویا یہ ابھی کھلی جگہ ہے
 شہر آباد نہیں ہوا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی سرمت کی دعا کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی
 روایت میں آتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف دالی زمین کو
 اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے فرشتے عبادت کرتے تھے۔ وہاں پر ایک
 پردہ سا اٹھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو پوری دنیا کا مرکز قرار دیا۔ اور پھر اسی جگہ سے تمام زمین
 کو پیدا کیا۔ گویا یہ مقام ساری زمین کا وسط (وسط البلاد) ہے۔ یہ بخور می نے اپنی شرح شامل میں
 لکھا ہے۔ جس شخص کو بخیر ہوئی ہو۔ اس کی پیشانی پر کچھ دیا جائے اَلْعُكَّةُ وَسَطُ الْبِلَادِ وَاللّٰہُ
رَزَقَ بِالْعِبَادِ تَوَاضَعًا بخیر بند ہو جائے گا۔

فرمایا ہے اللہ اس شہر کو امن کا گوارہ بنائے۔ وَارْزُقْ اَهْلَکَ مِنَ الثَّمَرَاتِ اِنَّہٗ
 کے بنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ہُوَ
کَرَّ اللّٰہُ اور آخرت پر ایمان لائے قَالَ وَمَنْ کَفَرَ اللّٰہُ تعالیٰ نے فرمایا جس نے کفر کیا فَاَمْتَعْنٰہُ
قَلِیْلًا اے مٹھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا۔ ثُمَّ اَصْطَرٰہُ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ پھر اے کشاں
 کشاں دوزخ کی طرف بجاؤں گا۔ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے مٹھوڑا
 فائدہ سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو ممکن ہے کہ کافر بھی آدم سے رہیں۔ لیکن اس کے
 بعد انہیں بہر حال دوزخ میں جانا ہوگا۔ مگر اہل ایمان کو دونوں چیزیں حاصل ہوں گی دنیا میں امن بھی
 نصیب ہوگا۔ اور آخرت میں نجات بھی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا
 کو قبول فرمایا۔ چنانچہ ہم پاک اور شرمکے کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا

وَذَرِّفْ اَبْرَهُمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاسْمِعِلْ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام) بیت اللہ
شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور دونوں کہتے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے
قبول فرما بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے پروردگار! بنا دے ہم
دونوں کو اپنی فرمانبرداری کرنے والے ماور بنائے ہمارے اولاد میں سے بھی ایک
اپنی فرمانبرداری امت۔ اور بتلا ہم کو ہمارے احکام۔ اور ہمارے اوپر رجوع فرما مہربانی کے
ساتھ۔ بے شک تو ہی رجوع فرمانے والا اور از حد مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

رابط آیات

اس آیت کا تعلق سابقہ درس کی آیت مبارکہ "وَلَا تُجْعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ"
کے ساتھ ہے۔ وہاں پر تھا کہ اُس بات کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے
رجوع کی جگہ مقرر کر دیا اور جائے امن بنایا۔ اس کے ساتھ مقام ابراہیم کا ذکر ہوا۔ بیت اللہ شریف
کو پاک و صاف رکھنے کا حکم ہوا۔ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر بھی تھا۔ جس میں اہلینا
شہر مکہ کے یہ چلوں کی روضی طلب کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا
جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

تایید کتب

آیت زیر درس میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ذکر ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے فضائل میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی تعمیر آپ کے ہاتھوں سے
کرائی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَلَا ذَرِّفْ اَبْرَهُمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَاسْمِعِلْ" و دکنی مبارک گھڑی تھی جب ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام یعنی باپ بیٹا اپنے

مبارک ہاتھوں سے بیت شریف کی بنیادیں اٹھائے تھے۔ بعض دوسری احادیث میں آتا ہے کہ بیت اللہ شریف کی ابتدا کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ حضرت ابوذر غفاری کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے اولین گھر کی تعمیر کا ذکر آیت **بِأَنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا** میں آیا ہے۔ اس آیت میں لفظ **بیت** استعمال ہوا ہے۔ مگر کجہ اور کجہم معنی الفاظ ہیں۔ قرآن میں کجہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اے اُمّ القریٰ بھی کہتے ہیں۔ گویا دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گھر بیت اللہ شریف ہے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا حضور! اس کے بعد کون سا گھر تعمیر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ بیت المقدس۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیرات میں چالیس سال کا وقفہ ہے۔ یہاں پر یہ اشغال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تو بہت زیادہ فرق ہے۔ پھر دونوں گھروں کی تعمیر میں صرف چالیس سال کے وقفہ کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تعمیر سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد علیہما السلام والی تعمیرات مراد نہیں بلکہ ان دونوں گھروں کی اولین تعمیرات مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کا طوفان آیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی سیلاب آئے۔ جن میں بیت اللہ شریف کی عمارت بہ گئی۔ اور وہاں پر صرف ایک ٹیلہ سا باقی رہ گیا۔ عمارت منہدم ہو گئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔

قرآن پاک کے لفظ **قَوَاعِدَ** سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ اس عمارت کی اولین تعمیر نہیں تھی۔ بلکہ یہ عمارت اپنی اصل بنیادوں پر دوبارہ اٹھانی جا رہی تھی۔ چونکہ اس وقت عمارت کے کوئی نشانات باقی نہ تھے۔ صرف ایک ٹیلہ سا باقی تھا۔ تو عمارت کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا جس نے اس اصل جگہ پر سایہ کر کے اس کا تعین کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجھ گئے کہ بیت اللہ شریف کا اصل مقام یہ ہے چنانچہ

آپ نے اسی جگہ پر دوبارہ تعمیر شروع کی۔ اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر مبارک چودہ سال کی تھی۔

خبر گیری کیلئے
حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی آمد و رفت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہؑ شام و فلسطین میں تھیں۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام حجاز میں تھے۔ آپ ایک سال دو سال میں ایک مرتبہ آکر بیوی بچے کی خبریں لے کر آتے۔ تاہم آپ نے بیوی سارہؑ کی یہ شرط تھی کہ آپ بیوی بچے کی خبر گیری کے لیے قریب وقت کے لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے پاس رات کو غھڑی کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس عرصہ میں حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہو گیا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے قبیلہ بنو جہرجم میں نکاح کر لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی خبر گیری کے لیے آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام تمہارے یہ موجود نہیں تھے۔ انہوں نے ان کی بیوی سے دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ کہیں شکار کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ آپ نے گزران اوقات کے بارہ میں پوچھا تو اس عورت نے کہا کہ: رعبہ حاش کوئی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے گزران اوقات ہو رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کوئی کام نہیں کرتے۔ اس لیے فاقے آتے ہیں۔ یہ شکایت سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تیرا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور ساتھ یہ پیغام بھی دینا کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار سے واپس آئے تو انہیں باپ کی آمد کی خبر و بکت معلوم ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بیوی کے بتانے سے پہلے خود ہی پوچھ لیا کہ میرے بعد کون آیا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا۔ اُس نے مال احوال پوچھا تو میں نے سب احوال بتا دیے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پھر دریافت کیا کہ وہ کوئی پیغام بھی لے گئے ہیں۔ تو بیوی نے کہا کہ ہاں۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ پیغام کا مطلب سمجھ گئے۔ چنانچہ بیوی کو الگ کر دیا۔ اور بتایا کہ اب میں تمہیں گھر میں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے در سرانجام کیا۔ کئی سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام

دوبارہ تشریف لائے۔ اتفاق سے حضرت اسماعیل علیہ السلام بچہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ اُن کی بیوی موجود تھی۔ آپ نے اُس سے گھر کے حالات دریافت کئے۔ اُس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گھر کے حالات بہت اچھے ہیں۔ میرا خاوند بھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ نیک سیرت اور عبادت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میں رزق بھی دیا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار جی کرتے ہیں گزراوقات بھی بڑی اچھی جو رہتی ہے۔ اس عورت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سواری سے اترنے کی درخواست کی تاکہ آپ کی خاطر تواضع کر سکے۔ مگر آپ نے کہا کہ میں نے بھڑنا نہیں ہے ہاں جب تمہارا خاوند آئے۔ تو اُسے میرا پیغام دینا کہ تمہارے مکان کی تو کھٹ بہت اچھی ہے اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ پیغام دے کر چلے گئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر واپس آئے۔ تو بیوی نے پیغام دیا۔ آپ نے فرمایا وہ میرے باپ تھے۔ وہ یہ پیغام دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔

یہ واقعہ بھی تفسیری روایتوں میں موجود ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیسری مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا ارادہ کیا۔ تو اپنی بیوی حضرت سارہ سے طے کر لیا کہ اس دفعہ میں کچھ عورتوں ہاں بھڑوں گا۔ چنانچہ یہ ان ایام کا ذکر ہے۔ کہ آپ کریت اللہ شریف کی تعمیر کا حکم ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کے ایک ٹکڑے کو، مور کیا۔ اور اس طرح باپ بیٹے نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر گھر سے ہو کر دیواریں بنیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کے لیے گارا اور پتھر لاتے رہے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد جب یہ عمارت طوفانِ نوح کی نذر ہو گئی تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں دوبارہ تعمیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت ذی قعدہ میں شروع ہو کر ذی الحجہ میں تقریباً ایک ماہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

بیت اللہ شریف کی تعمیر مذکور کے بعد دوبارہ تعمیر قصی بن کلاب کے زمانے میں ہوئی جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ مبارک

تعمیر کے مختلف
ادوار

میں بیت اللہ شریف کی عمارت پھر بوسیدہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ قریش مکہ نے چندہ جمع کر کے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینیس برس تھی۔ گویا یہ تعمیر آپ کی بعثت کے پانچ برس قبل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ رد سائے طے کر لیا تھا کہ اس مقدس تعمیر میں ناپاک ڈال سناں نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ پاک و صاف اور حلال مال سے جو چندہ جمع ہوا وہ پورنی عمارت کی تعمیر کے لیے ناکافی تھا۔ لہذا عظیم والاسات ہاتھ کا حصہ چھوڑ کر باقی جگہ پر بیت اللہ تعمیر کر لیا گیا۔ اسی موقع پر محمد اسود کی تنصیب کا مجرمہ اٹھرا ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ حضور عید السلام کے مبارک ہاتھوں کے اس طرح کر دیا کہ سارے لوگ خوش ہو گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ نبوت میں بیت اللہ شریف کی تجدید نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو سرمایہ کی کمی تھی۔ اور دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں اس کو دوبارہ تعمیر کرتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرز پر کرتا۔ اور اس وقت عمارت میں تغیر و تبدل کرنا مناسب نہیں تھا۔ یزید کی وفات کے بعد حجاز میں نو سال تک حکومت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس رہی، حجاز، مکہ، مدینہ اور طائف و حیفہ آپ ہی کے زیر نگرانی تھے۔ اس زمانہ میں آپ نے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور آپ نے یہ عمارت ابراہیمی بنیادوں پر قائم کی یعنی حطیم کو غار کعبہ میں داخل کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم پر عمارت کی تجدید کی اور حطیم کو پھر باہر نکال دیا۔

ہارون الرشید نے اپنے زمانے میں حطیم کو پھر شامل کر کے از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اہم مکتب نے اسے ایسا نہ کرنے کی درخواست کی۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے یہ مقدس گھر آئندہ آنے والوں کے لیے گھسٹونا بن جائے گا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں کے عہد میں سلطان مراد خان کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تجدید ہوئی۔ یہ مسئلہ کا واقعہ ہے۔ موجودہ عمارت وہی ترکوں کی تعمیرِ مجدد ہے۔ اب تک بیت اللہ کی عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا۔ اب نہ موجودہ سعودی حکومت کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ کہ انہوں نے بھاری رقم خرچ کر کے یہ ایک کوہست وسیع کر دیا ہے۔ اور زائرین کے آرام و سہولت کے لیے بڑے

بڑے — منصوبوں پر کام کیسے ہے۔

الغرض جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی دیواروں اٹھا رہے تھے تو ساتھ ساتھ نہایت مخلصانہ انداز میں دعا بھی کہہ رہے تھے۔ رَبَّنَا اقْبَلْ هَذَا مِنَّا ہمارے پروردگار! ہم سے یہ خدمت مقبول فرما لے اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ تو دعا کو سنتا بھی ہے۔ اور ہمارے اخلص کو بھی جانتا ہے۔ لہذا ہمارے عمل کو قبول فرما لے۔

ظاہر ہے کہ قبولیت کے بغیر ہر عمل بیکار محض ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ کہ ہمارا عمل قبول ہو جائے۔ ہر مومن کی بھی یہی مناجاتی ہے کہ اس کی نیکی بارگاہِ رب العزت میں مقبول ہو جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مجھے علم ہو جائے کہ میری دو رکعت نماز قبول ہوگئی ہے مگر میں اس کے بدلے میں دنیا و دنیا کی ہر چیز کو ہتھکڑیوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ بہت بلند ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنْ الْمُتَّقِينَ اور کھو! اللہ تعالیٰ متقین کے اعمال کو ہی قبول فرماتا ہے۔ نیکی اُسی کی مقبول ہوگی جس کا دل تقویٰ سے معمور ہے۔ اگر تقویٰ سے خالی ہے۔ دل میں کفر، شرک، نفاق اور ریاکاری پھری ہوئی ہے۔ تو کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوگا۔ قبولیت کا معیار خلوص اور تقویٰ ہے۔

اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اگرچہ چودہ سال کے نیچے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے نیکی اور تقویٰ کی دولت ابتداء سے ان کی سسے ہی ردیت کر دی تھی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باپ بیٹا کے عمل کو شرف قبولیت بخشا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو کر رسول بنا کر بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں آپ کی تعریف کی ہے۔ آپ صاحب شریعت رسول ہوئے ہیں۔ تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی متعدد بیویاں اور بارہ بیٹے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹے کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے خاندان پیدا کیے۔ آپ کا سب سے بڑا بیٹا نابت تھا۔ اور سب سے چھوٹا قیدار تھا۔ کہ

بعد بیت اللہ شریف کی توہیت آپ کے بڑے بیٹے نابت کو ہی ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں بڑے بیٹے کو اتنی فضیلت بخشی۔

قبولیت دعا
کی شرائط

ترمذی شریف کی حدیث میں نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے ——— لَا تَقْبَلُ صَلَوةٌ بِغَيْرِ طَهْوَرٍ یعنی اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کسی نماز کو قبول نہیں ———

فرماتے۔ گویا نماز کی قبولیت کے لیے طہارت بمنزلہ شرط کے ہے۔ پاکیزگی کے بغیر کتنی نمازیں پڑھو قیام کرو۔ رکوع و سجود کرو۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح دیگر نیکیوں کی شرط بھی ایمان اور اخلاص ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ اسی طرح بعض برائیاں ایسی ہیں جن کے ارتکاب سے نیکیاں مردود ہو جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ شراب نوشی کرنے والے کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوتی۔ اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں۔ ورنہ قانون یہی ہے۔ فرمایا جو غلام اپنے مالک کی مرضی کے خلاف بھاگ جائے، وہ جب تک واپس نہ آئے، اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے مالک کو بدعوا کا دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آئمہؑ کے ہمنام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَخْلَصْ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلاً مِنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیدا کر لو تو چہر تھما، مختصر عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے مُخْلِصِينَ لَهُ الْعَمَلُ سَاحِدًا ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اخلاص ایک ایسی نعمت ہے جو توحید کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اہم ابو بکر جصاصؓ فرماتے ہیں۔ اگر انسان میں خلوص موجود ہے، اس کا عقیدہ توحید پر ہے، افرو درست ہے، تو پھر اس کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی
فرمانبرداری

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے تذکرہ کے بعد امت مسلمہ کی اساس اور پھر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دعا ہے۔ یہی مرکزی محور ہے۔ جو اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعائیں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست پیش کی۔ گویا نبی علیہ السلام کے ظہور

۱۔ ترمذی ص ۲۶۱ ۲۔ ترمذی ص ۲۶۱

۳۔ جامع سفیر شریف فیض الغبر ص ۲۱۶ ۴۔ احکام القرآن ص ۴۱۴

سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا کی۔ اور دعا کے پتہ جسے
میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ سے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
بنائے۔ کہ ہم دونوں ہر حالت میں تیری اطاعت کرنے والے بن جائیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی ہمیشہ
یہی دعا رہی تُوَفِّقْنِي مُسْلِمًا وَ أَخْلُقْنِي بِالصَّالِحِينَ اے اللہ! ہماری موت فرمانبرداری
کی حالت میں آئے۔ رجب وصیت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں فَلَا تَعْلُتُنَّ اِيَّاهُ وَ اَنْتُمْ قَبْلُكُمْ
کو کشش کرو بھائی کہ تمہارا خاتمہ اسلام اور فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
اور اسماعیل علیہ السلام نے جی بن رعائ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے اللہ! ہم دونوں
کو اپنا فرمانبردار اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے اِیْمَرْنَا اِسْلَمًا فرمانبردار ہونا۔ آپ نے جواب دیا اَسَلَّمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ
میں رب العالمین تم پر جمع ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض مسلمانوں کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو امانت
عطا کی۔

امت مسلمہ کی
تاسیس

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی دعا مانگی۔ اور
پھر اپنی اولاد کے متعلق دعا کیا وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ میں اور ہماری اولاد
میں سے ایک فرمانبردار امت پیدا فرما۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس وقت یہ دعا کی گئی،
اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی موجود تھے۔ لہذا امت مسلمہ کی دعا حضرت
اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حق میں جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت حق علیہ السلام تو اس وقت تک ابھی
پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی مقام پر یہ دو نصابی دھڑا لگتا ہے میں۔ اور حضور علیہ السلام کی ولادت
کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ دعا حضرت حق علیہ السلام کے حق میں ہے۔ اور
امت مسلمہ بھی آپ ہی کی قوم ہے۔ حالانکہ تاریخ غنی شواہد سے واضح ہو رہا ہے کہ امت مسلمہ
کا تعلق حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہے۔ جو اس وقت موجود تھے۔ اور دعائیں شامل تھے چنانچہ
یہ قبولیت دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم بنی نبی نہت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے
مبعوث فرمایا۔

امت مسلمہ کی
تاسیس

دعا کے درجہ جتنے میں باپ بیٹے نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی وَ اِنْ مِّنْ مَّا سَأَلْنَاكَ

اے پروردگار! ہم کو ہمارے مناسک حج بھی بتا دے۔ مناسک مناسک کی جمع ہے جس کا لفظی معنی دعوٰنا ہے۔ اسی لیے عربی والے کپڑا دھو لے کر نسک الشوب بولتے ہیں۔ نسک قربانی کو بھی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے عبادت و ریاضت کو نسک کہتے ہیں۔ اور عابد کو ناسک اور عبادت گاہ یا قربانی کی جگہ کو مناسک کہتے ہیں۔ گویا معنی یہی نکلتا ہے۔ کہ جس طرح دعوٰنا سے کپڑا میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قربانی اور عبادت سے انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ تو جیسا کہ گذشتہ درس میں ذکر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کا حکم صادر فرمایا۔ تو ضرور ہی تھا۔ کہ جس حج کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا طریقہ اور احکام بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ اسی لیے باپ اور بیٹا دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ارکان حج بھی سکھلا دے۔ تاکہ جو لوگ اس ارادے سے آئیں وہ تیرے احکام کے مطابق اس فریضہ کو ادا کر سکیں۔

جنت اوداع کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں اونٹ کی سواری پر خطبہ ارشاد فرمایا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ** اے لوگو! مجھ سے احکام حج اچھی طرح سیکھ لو لعلی لا اراکم بعد عارمی هذا شاید اس سال کے بعد تمہارے ساتھ ملاقات نہ ہو سکے۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ آپ اس حج کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ نہ آ سکے۔ اور تین ماہ بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ غرض مناسک سے حج کا طریقہ اور اس کے احکام مراد ہیں۔ جن کے مطابق قیامت تک آنے والے لوگ حج کرتے رہیں گے۔

لفظ **أَرَنَا** رویت یا رائی سے ہے۔ اس کا مصدر رائی بھی آتا ہے۔ اگر رویت مصدر لیاجتے تو اس کا معنی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اے اللہ! ہمیں مناسک حج دکھا دے اور رائی مصدر ہو تو اس کا معنی نزل سے جاننا ہوگا: **الْمَسَّ إِلَى الْبَيْتِ** سے رویت قلب مراد ہے تو یہاں بھی ارنانا کا معنی یہ ہوگا کہ ہمیں مناسک حج کا علم عطا فرما۔ **وَتُبَّ عَلَيْنَا** اور ہمارا

توبہ قبول فرما، مہربانی کے ساتھ ہم پر جوع فرما۔ اِنَّكَ اَنْتَ لِتَوَابُ الرَّحِيْمُ بِيْكَ
 تو ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یعنی مہربانی کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔ تو از حد مہربان ہے۔
 باپ اور بیٹے کی دعا کے دو حصے مکمل ہوئے۔ تیسرے حصے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ
 علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست کی گئی ہے۔ جو اگلے درس میں آئے گی۔

اَللّٰہُ
درس پنجاہ دیکھو

انبیاء
آیت ۱۲۹

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول بھیج،
جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور انہیں پاک
کرتے۔ بیشک تو زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

گزشتہ
پیش
جس وقت حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھائے تھے، تو ساتھ
ساتھ دعا بھی مانگ رہے تھے۔ دعائے بعض حصے گزشتہ درس میں بیان ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں
نے عرض کیا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ عمل قبول فرمائے۔ اِنَّكَ
اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ تو سنتا بھی ہے اور ہر شخص کی نیت اور اندوے کو بھی جانتا ہے دونوں
باپ بیٹے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور عرض کیا کہ ہمارے اس عمل کا مقصد محض تیری رضا ہے۔ لہذا تو ہم
سے یہ عمل قبول کر لے۔

دعائے دوسرے حصے میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے ہمارے پروردگار!
ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے۔ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اے ہمارے پروردگار!
میں سے ایک ایسی جماعت بنا جو تیری فرمانبردار ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی دعا کو شرف
قبولیت بخشا۔ اور حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام کی اولاد میں امت مسلمہ پیدا کی۔ بنیادی طور پر
اس امت مسلمہ میں عرب ہی شامل ہوئے۔ جو کہ اسمعیلی نسل کے قریش تھے، اس کے بعد انصاریہ
نہیں شامل ہوئے۔ اور پھر جو لوگ بھی ان کے ساتھ ملتے ہیں۔ وہ سب اس امت میں شامل
ہیں۔ اس دعائے ابراہیمی کا نتیجہ کئی ہزار سال بعد نکلا جب اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ
علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

دعا کے قیامت میں عرض کیا "وَإِنَّمَا مَنَّا رِجَالٌ" اور ہمیں مناسک حج بھی کھائے
تاکہ ہمارے بعد آنے والے بھی اسی طریقے کے مطابق بیت اللہ شریف کا حج کرتے رہیں۔ نیز
یہ دعا کی "وَتَبَّ عَلَيْنَا نَا" اے اللہ! ہماری توبہ قبول فرمائے کیونکہ اِنَّكَ أَنْتَ الثَّوَابُ الرَّزِيَّةُ
تو توبہ قبول کرنے والا اور ہم ہمارے سے بدترت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا کر سکتے تھے۔ "صاحبزادے
حضرت اسماعیل علیہ السلام آئیں کہ کہہ کر دعا میں شامل تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام
کی بعثت یسوع

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا ہو چکی تھی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا
مِّنْهُمْ اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔ یہاں
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست پہلے اور رسول کی
بعثت کی دعا بعد میں کیوں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ
کی درخواست اپنی اولاد میں سے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ قریش عرب حضرت ابراہیم اور حضرت
اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہی ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کی داغ بیل ڈالی۔ پھر
ان کے ساتھ انصار مدینہ شامل ہوئے۔ اور پھر باقی اقوام عالم کو امت مسلمہ کی رکنیت حاصل ہوئی۔
چونکہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کی بعثت امت مسلمہ میں سے مطلوب تھی۔ اس لیے امت کا
ذکر پہلے کیا اور بعثت نبوی کا بعد میں کیا۔ سورہ جمعہ میں اسی قسم کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ
نے احسان جتلاتے ہوئے فرمایا: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ
اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے عرب کے ناخوندہ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا۔ ظاہر ہے
کہ عرب کے اکثر لوگ کھنٹے پڑنے سے عاری تھے۔ کرنی اکاؤنٹ آدمی ہی نوشت و خواند سے
واقف تھا۔ لہذا اس مقام پر انہوں کا ذکر کیا۔ مگر مخاطب وہی قریش ہیں۔ جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی نسل میں سے تھے۔

عظیم الشان رسول

لفظ رَسُولٌ اسم نکرہ ہے۔ اور اس سے عظمت کا اظہار ہوتا ہے لہذا اس کا معنی
صرف رسول نہیں۔ بلکہ عظیم الشان رسول ہوگا۔ دوسری آیت میں بھی یہ لفظ نکرہ کے طور پر ہی
استعمال ہوا ہے۔ جیسے بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ اس میں مِّنْهُمْ
کی قید سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ میں سے ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا ہے۔

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں سے اُمت مسلمہ بنائی۔ اور پھر ان میں سے الرَّسُولُ نہیں بلکہ رَسُوْلٌ یعنی نہایت عظمت والا رسولِ مبعوث فرمایا۔ یہ ایک عام سنت اللہ بھی ہے کہ ہر نبی اپنی قوم میں سے مبعوث ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ایسا ہی مذکور ہے۔ مثلاً عاد، ثمود، صالح علیہ السلام کی قوم قوم ابراہیم، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی قومیں، غصیکہ ہر نبی اپنی ہی قوم میں ہوا ہے کہیں باہر سے نہیں آیا۔ چنانچہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی ہی قوم قریش میں سے مبعوث فرمایا۔ ایسا ہونا منطقی طور پر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اپنی ہی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے نبی کے اخلاق و اطوار کو ہر شخص جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اُس کے اخلاص کی بنا پر نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی بعثت کی سعادت بھی آپ کی اپنی قوم کو حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی اپنی ہی قوم میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اُسی جنس میں سے یعنی انسان ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرف مبعوث ہونے والا نبی انسان ہی ہوگا۔ کسی غیر نسل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو، تو امت کو نبی کے اتباع میں سخت دشواری پیش آ سکتی ہے۔ یا بعض معاملات میں اتباع ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی فرشتہ یا جن کو ان لوگوں کی طرف نبی مبعوث کیا جائے۔ تو یہ نسل ہی مختلف ہوگی۔ نبی اور امت کے مادہ تخلیق میں فرق ہوگا۔ ان کی بود و باش اور عادات و مفصل میں فرق ہوگا۔ ان کی ضروریات مختلف ہوں گی۔ لہذا نبی کا اتباع کیسے ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ نبی کا اپنی قوم کی جنس سے ہونا کوئی عار کی بات بھی نہیں ہے۔ علم عقائد والے نبی کی تعریف یہ نکلتے ہیں الرَّسُولُ اِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اِلٰی الْخَلْقِ لِتُبْلِغَ الْاَحْکَامِ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف احکام شرعیہ پہنچانے پر مقرر کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے جس انسان کو منتخب فرماتے ہیں۔ اس پر وحی نازل فرماتے ہیں اور اس کی شان کو بلند فرماتے ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ باطل عقائد وضع کر لیے ہیں کہ نبی کو انسان کہنے سے اس کی نفوذ باللہ تو مین ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ نبی کا انسان ہونا تو انسانیت

نبی انسان
ہی ہوتا ہے

کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو کہنا اِنِّیْ خَالِقُ بَشَرٍ مِّنْ طِیْنٍ میں
بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ اس میں تکثیر کی کون سی بات ہے۔ نہ معلوم لوگوں نے یہ
کیسے سمجھ لیا ہے کہ بنی کو بشر کہنے سے بنی کی توہین ہو جائے گی۔ اس پر ضرور ہے کہ بنی ایک
عام انسان کی طرح نہیں ہوتا۔ جس میں ہر نیک و بد شامل ہوتا ہے۔ بلکہ بنی کو تمام امت پر فضیلت
حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ محصور ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسانیت یا بشریت کا تعلق ہے۔
قرآن پاک نے بار بار اس کی تصدیق کی ہے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اَللّٰهُ تَعَالٰی
خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان بشریت کرایا ہے۔ دوسری جگہ آپ ہی کی زبان سے کسلا یا
”هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُکُمْ“ آپ فرمادیتے کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان
ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ نہ میں عالم الغیب ہوں۔ نہ مختار کل ہوں۔ نہ میرے قبضے میں
خزانے ہیں۔ نہ تمہاری فرمائش پوری کرنا میرے بس میں ہے۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول اور
انسان ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی یہی کہتے ہیں کہ میں بھی
تمہاری طرح انسان اور بشر ہوں۔ جس طرح تم کسی کی اولاد ہو اسی طرح میرے بھی۔ میں باپ ہیں
جس طرح تمہاری نسل سے تمہاری اولاد ہے۔ اسی طرح میری بھی ہے۔ تمہاری بھی ضرورت
زندگی میں اور میری بھی ہیں۔ باقی انسانوں پر پیش آنے والی دادرست بیماری، صحت وغیرہ
انبیاء علیہم السلام پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ تمام طبعی امور حتیٰ کہ موت و حیات بھی سب پر طاری
ہوتی ہے۔ البتہ فرمایا کہ بنی کو امت پر فضیلت ہے: ”یُوْخِیْ اِلَیَّ“ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔
اور یہ بہت بڑی عزت و اکرام والی چیز ہے۔ جو اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کام
کے لیے منتخب کر لے۔ اس سے زیادہ فضیلت والی اور کوئی چیز نہیں غرضیکہ انبیاء کرام علیہم السلام
بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ مگر انسانیت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انسان کہنے میں ان کی
توہین نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان تو وہ ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت بخشی۔
اسی لیے تو فرمایا ”وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیَّ اٰدَمَ“ ہم نے آدم کے بیٹے یعنی انسان کو عزت بخشی۔

امنی خواہ کتنا بھی نیک کلام صالح اور پاک باز ہو۔ وہ معصوم نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ عام انسان تو گنہگار ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف بنی ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔ اس صفت کے بغیر نبی بنی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس میں معصومیت معفود ہو تو اس کا اتباع ممکن نہیں لہذا کوئی بدترین شخص بھی نبی کی تہن نہیں کر سکتا۔ وہ تو معصوم ہے۔ اگر کوئی شخص نبی کے درجے میں برابر کی کا دعویٰ کرے تو وہ مومن نہیں رہتا۔ مگر ہمارے ہی بھائیوں نے نبی کو انسانیت کے دائرے سے خارج کر کے نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ کا خطاب دے دیا۔ بھائی یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے۔ وَجَعَلُوا لَكَ مِنْ عِبَادِهِ حُجُجًا اِنَّ اللّٰہَ کے لیے اُسی کے بندوں میں جبر و بنا یا اور مشرک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو خالق ہے۔ باقی سب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی کمال صفت کا ظہور ہے۔ اس کو خدا کا جبر و بنا یا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی فضیلت عطا ہے۔

فرمایا اے ہمارے رب! امت مسلمہ میں انہی میں سے ایک رسول بھیج کیسٹ مِلُوا عَلَیْہُمْ اٰیٰتِکَ جو ان پر تیری آیات قدرت کرے۔ آیت سے مراد احکام یا فرمان ہے جو نبی پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ بزرگم علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولا کریم! جس عظیم الشان نبی کی بعثت کی دعا کر رہا ہوں اس کا پہلا فرض یہ ہو کہ وہ تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور انہیں تیرے احکامات آگاہ کرے۔ کیونکہ نبی کیلئے اللہ تعالیٰ کا عام حکم ہے یَاٰیٰہَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آپ پر نازل ہوا آپ اُسے آگے امت تک پہنچا دیں۔

تلاوت قرآن پاک

تلاوت کے دو معنوم ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا مقصد احکام کو دوسروں تک پہنچانا یا دوسروں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ اور اس کا دوسرا مقصد خود اپنی ذات کے لیے تلاوت ہے جس طرح ہم قرآن پاک کو کلام الہی ہونے کی وجہ سے ثواب کے لیے پڑھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جس قدر بار بار تلاوت کرے گا۔ تنہا ہی ثواب کا اعتبار ہوگا۔ خود لفظ قرآن کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ کتاب جو بار بار بخیر پڑھی جائے۔

اللہ تعالیٰ کی آیت جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ وہی ہے جسے حضور علیہ السلام کی ذات والا صفات پر نازل ہوتی تھیں۔ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ گھڑے باہر تشریف لاتے اور کاتبان وحی میں سے جو بھی قریب ہوتا اسے طلب فرماتے اور حکم کرتے کہ اس آیت یا سورۃ کو فلاں مقام پر لکھو تو وہ لکھ دیتے۔ بعض اوقات آپ عام مجلس میں تشریف لاتے اور اعلان فرماتے کہ اچھی ابھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا ہے بعض اوقات ایسا ہوتا کہ مجمع عام میں تشریف فرما ہوتے اور آپ پر وحی کی کیفیات طاری ہو جاتیں۔ آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور پھر تہنیزی دیر بعد آپ ارشاد فرماتے کہ یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ حضرت زینہ، حضرت علی، حضرت عثمان یا جو بھی کاتب مل جاتا اسے تحریر کر دیتے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ عظیم الشان رسول تیری آیات کی تکرار کرے گا۔ اب دوسری بات یہ بتائی کہ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ کہ وہ رسول امت کو کتاب کی تعلیم دے گا۔ کسی کتاب کو صرف پڑھ کر سنا دینا اور چیز ہے۔ اور اس کی تعلیم دینا دوسری بات ہے۔ یہاں پر کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے۔ اور علم محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ امام بخاری فرماتے ہیں إِنَّمَا يُعَلِّمُ بِالْعَلَمِ علم خود بخود حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ سیکھنے سے آتا ہے۔ اور جو لوگ خود بخود سیکھتے ہیں۔ استاد کی مدد حاصل نہیں کرتے۔ صرف کتاب میں پڑھ کر عالم بنا چاہتے ہیں۔ وہ علم میں کچھ سہتے ہیں اور ان میں اکثر گمراہ ہوتے ہیں۔ ان میں کما حقہ علم کی نکتہ نہیں آتی۔ علم حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ سلف صالحین نے حصول علم میں جس قدر محنت کی ہے اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال تک اس حالت میں رہا کہ رات کو ریاس لگتی تھی تو رات بھر ایک پیالہ پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ کہیں مطالعہ میں غفلت نہ آجائے۔ اگر غنودگی طاری ہوگئی تو مطالعہ اور صومارہ جائے گا۔ چالیس چالیس سال تک لوگوں نے اتنی بڑی بڑی محنت کی ہے۔ تب جا کر علم حاصل ہوا ہے۔

بہر حال تعلیم ایک اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر انسان میں کمال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ

اس قسم کے نجات تعلیم کے ذریعے مل جاتے ہیں۔ کہیں کسی حکم کو خاص کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خصوصیت بیان کرنی ہوتی ہے۔ جو کہ استاد کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمت میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بعض چیزیں جنات کے قبیلے سے ہوتی ہیں۔ انسان ذرا سی توجہ کرے، تو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور بعض ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو آسانی سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔

میسے فرمایا: **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ** وہ ذاتِ خداوندی جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔ یہاں پر ہدایت اور دین حق کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی معمول چیز نہیں ہے جو ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اے اللہ! انہیں میں سے رسول بھیج جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری دعائے ممتی **وَلْيُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** ایسا رسول مبعوث فرمایا جو کتاب کے علاوہ انہیں حکمت کی تعلیم بھی دے۔ حکمت کی تشریح میں مفسرین کرام کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد انوارِ قلوب یا باطنی باتوں کا جاننا ہے۔ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ حکمت عقل کی دلیل اور دل کی بصیرت کا نام ہے۔ حضرت ام المکث فرماتے ہیں: **مَعْرِفَةُ الدِّينِ وَالْفِقْهُ فِيهِ** الوترِ بَعْدَ لَدُنْهِ یعنی حکمت نام ہے دین کی معرفت۔ اس کی سمجھ اور اس کے اتباع کا۔ عام طور پر حکیم کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔ **مِنْ أَنْفَعِ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ حِكْمٌ** وہ ہے جس نے علم اور عمل میں نفعی حال کر لیا اور کمال کا معنی ماہر فی الفن ہے۔ خواہ وہ بے عمل ہو۔ مگر حکیم وہ ہوگا جو علم اور عمل میں مادی ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں کہ شریعت الہیہ میں جتنی مصلحتیں اور دین کے جتنے احکام ہیں ان کو پہچاننے کا نام حکمت ہے۔ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنا بھی حکمت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کو بھی حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض کہتے

ہیں۔ کہ تمام چیزوں کو ان کی حقیقت کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے
 اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا لَعَلَّنا نَعْلَمُ الْحَقَّ حَقًّا لَعَلَّنا نَعْلَمُ الْحَقَّ حَقًّا لَعَلَّنا نَعْلَمُ الْحَقَّ حَقًّا
 سمجھنے لگیں۔ بزرگان دین کی دعائیں آتا ہے۔ کہ ہمیں چیزیں اس طرح دکھا۔ جس طرح وہ واقعہ
 میں ہیں۔ بسا اوقات آدمی کسی چیز کو سمجھتا کچھ ہے، مگر حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔ امام ابن عربیہؒ
 جو کہ لغت کے اہم ہیں وہ فرماتے ہیں۔ کہ ہر وہ چیز جو تمہارے لیے نصیحت کا باعث بنے۔ یا نہیں
 بُرائی پر زجر کرے یا کسی قبیح کام سے روکے یا کسی بزرگی کے کام کی طرف دعوت دے۔ وہ سب
 حکمت ہے۔ اہم راغب جو لغت اور تفسیر کے اہم ہیں فرماتے ہیں الْحِكْمَةُ إِصَابَةُ
 الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْدُ حَقٌّ كَوَعْدٍ أَوْ عَمَلٍ كَالْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْدُ حَقٌّ كَوَعْدٍ أَوْ عَمَلٍ كَالْحَقِّ بِالْعِلْمِ
 ہیں کہ قول اور عمل میں برابری کا نام حکمت ہے۔

اہم بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ ایسی چیز جس کے ذریعے انسان کے
 نفس کی تکمیل ہوتی ہو۔ حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ
 اللَّهِ یعنی حکمت کی جڑ اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ جس انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا
 ہو جائے۔ سمجھ لو کہ اس میں حکمت کی بنیاد قائم ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے۔ مَنْ
 خَلَصَ لِلَّهِ رُبْعَيْنِ يَوْمًا جَسَدُهُ يَوْمَئِذٍ خَلَصَ لِلَّهِ رُبْعَيْنِ يَوْمًا جَسَدُهُ يَوْمَئِذٍ خَلَصَ لِلَّهِ رُبْعَيْنِ يَوْمًا
 کی جڑ سے متابع المعكمة من قلبه على لسانه حکمت کی سوتیلی اس کے دل
 کی طرف سے اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گی۔

بعض محققین کہتے ہیں۔ حکمت نام ہے معرفۃ افضل الاشیاء بافضل
 العلوم افضل چیز کو افضل علم کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سب افضل
 چیز اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ اور سب افضل وہ علم ہے جس سے انسان کو
 حضور قلب حاصل ہو جائے۔ اگر اس کے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ خدا تعالیٰ کی

ذات اور اس کی صفات کو پہچان لے گا اور سمجھ جائے گا کہ یہ شخص حکیم ہے۔ تاہم عام فہم معنی میں حکمت، الشوری، کجہ اور پستے کی باتوں کو کہتے ہیں ایسی باتیں احکام ہوتے ہیں۔ ان کی مصلحتیں اور ان کے اثر بھی ہوتے ہیں۔ ان کے غوامض ہوتے ہیں۔ اس میں سنت بھی شامل ہے۔ اور حضور نبی کریم علیہ وسلم نے یہ تمام باتیں کھائی ہیں اس لیے فرمایا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وہ رسول جو لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

دعا کا جو محتاج جزو تھا وَيُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک کرے۔ یہ لفظ بڑے دور رس معانی ترکہ نفس کا حامل ہے۔ پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ اُن سے تمام رذائل دور ہو جائیں۔ اور تمام فضائل ان میں پیدا ہو جائیں۔ رذائل میں خفاق، بد اخلاق، گندگی، معاصی، بد انعمائی، اور دیگر تمام شریر چیزیں آتی ہیں جن میں سب سے پاکیزگی مطلوب و مقصود ہے۔ تزکیہ اسی کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام۔ اس موقع پر یہ بات سمجھائی کہ کسی قوم میں فوز و فلاح اور سعادت تزکیہ کے بغیر نہیں آسکتی۔ لہذا انہوں نے امت مسلمہ کے لیے تزکیہ کی دعا کی۔ اور پھر آپ کی دعا کا اثر بھی دیکھئے حضور نبی اکرم علیہ السلام کے اولین مخاطبین کی جہالت مثالی تھی۔ ان کی خباثت، جہالت اور ہٹ دھرمی سب کچھ عیاں ہے۔ مگر اس تزکیہ کی بدولت کیسے کیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے تن من و عن ہر چیز دین پر قربان کر دی۔ ایک دوسرے مقام پر تزکیہ کو یوں بیان فرمایا خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کر لیں تُطَهِّرُهُمْ و تُزَكِّيهِمْ وہ ظاہری اور باطنی ہر دو پہلوؤں سے پاک ہو جائیں گے۔ غرضیکہ تزکیہ سے مراد ظاہری پاکیزگی بھی ہے۔ اور باطن کی پاکیزگی بھی ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ لے اللہ! ان میں ایسا رسول بھیج جو تیری آیات پر حرکت کرے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا آخری حصہ تزکیہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے بیعت اور

اس کو دعائے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ بزرگان دین کی بیعت حصول تزکیہ کا ایک ذریعہ ہے جو کہ حضرت علیؑ سے چلا آ رہا ہے۔ بزرگان دین مرید کو وظیفہ بتاتے ہیں۔ عبادت و ریاضت کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اور ضروری پرہیز بھی بتاتے ہیں۔ تاکہ مرید باطنیوں سے پاک ہو جائے اور اس میں خوبیاں ابھر ہو جائیں۔ مگر آج پیری مریدی ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بیعت ایک

رہی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ فاسق فاجر، بے نماز، بیٹراور کتے پالنے والے گدی نشین ہیں۔ اور جہلا سے بیعت لے رہے ہیں۔ نہ پیر کو احکام الہی کا علم ہے۔ نہ مرید کے پلے کچھ پڑتا ہے۔ بس چند رسوم ادا کر کے پیری مریدی کے بندھن میں بندھ گئے۔ نہ پیر نے تربیت کی، نہ حلال و حرام کی تمیز سکھائی، تو تزکیہ کیسے ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے جن لوگوں سے بیعت لی تھی۔ اُس کا کوئی مقصد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں سے ان شرائط پر بیعت لیں کہ کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ گناہ کی باتوں سے پرہیز کریں گے۔ جو ری نہیں کریں گے۔ بدکاری نہیں کریں گے۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا اگر ان شرائط کے مطابق مرد اور عورتیں بیعت کریں۔ تو ان کی بیعت لیں اور جو ان شرائط کو پورا نہ کریں ان سے بیعت نہ لیں۔ مگر آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ بیعت بھی ہو رہی ہے۔ اور کفر، شرک، بدعات کی بھی فراوانی ہے۔ کوئی پیر مرید سے نہیں پوچھتا کہ کیا کرے جو۔ قبریں پکی بن رہی ہیں، گنبد تعمیر ہو رہے ہیں۔ ان پر قوالی ہو رہی ہے۔ گانے گائے جاتے ہیں۔ قبروں پر چادریں چڑھتی ہیں، سجدے ہوتے ہیں۔ بتائے اب تزکیہ کہاں سے آئے گا۔ بزرگان دین نے ان باتوں کا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے تو اپنے لیے جھوٹا بھی پسند نہ کیا۔ اس دنیا کی پوری زندگی مسافرو کی طرح گزار دی۔ مگر آج ان کی قبروں پر عالیشان گنبد بنائے جاتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں کی تعلیم یہ تھی کہ مرد کے لیے سونا اور ریشم حرام ہے، انکی قبروں پر سونے کے دروازے اور ریشم کی چادریں چڑھائی جا رہی ہیں۔ کیا وہ بزرگ ان حضرات سے سبزا نہیں ہوتے ہوں گے۔ وہ تو ساری عمر ایمان کی دعوت دیتے رہے، کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، مگر ہم ان کے بعد کیا کر رہے ہیں۔ غرضیکہ پیغمبر کا ایک فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے۔

حضور علیہ السلام کے پاس ایک شخص آیا۔ حضور! میں نے فلاں جگہ پر جانور ذبح کرنے کی منت مانی ہے کیا اسے پورا کروں۔ آپ نے پوچھا۔ اُس جگہ کبھی کوئی بت تو نہیں تھا یا کسی زمانے میں وہاں کوئی بزرگ تو نہیں بیٹھا تھا۔ لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے وہاں پر جانور ذبح کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ زمانہ جاہلیت

ہیں وہاں کوئی تھان ہو جس کی پوجا ہوتی ہو۔ کوئی بزرگ کسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تو درخت کی پوجا ہونے لگی۔ آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی۔

الغرض! حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل علیہ السلام نے دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی تعریف فرمائی۔ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اے مولا کریم! تو ہی کمال قدرت کا مالک ہے۔ عزیز کا معنی غالب ہے۔ یعنی ہر چیز پر تیرا ہی غلبہ ہے۔ اور حکیم سے مراد کمال حکمت کا مالک بھی تو ہی ہے۔ تیرے سب امور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری دعا کو قبول فرما اور امت مسلمہ قائم کر اور پھر ان میں عالیشان رسول بھیج جو تیری آیات پڑھے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تذکیہ کرے۔

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٠﴾
إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ اسَلَمْتُ لِلرَّبِّ الْعَلَمِينَ ﴿١٣١﴾
وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَبْنِي إِنَّ اللَّهَ
اصْطَفَى لَكُمْ الَّذِينَ فَتَا تَمُوتُونَ إِلَّا وَانْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٢﴾
أَفَرَأَيْتُمْ شُهُودًا إِذَا حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ
لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ
وَاللَّهُ آبَاؤُكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهُ وَاحِدًا
وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُكْسِلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

ترجمہ: اور نہیں اعراض کرتے، ابراہیم (علیہ السلام) کی امت سے علاوہ شخص جس
نے اپنے نفس کو یوقوت بنایا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پرفراہ دنیا میں
بیشمار آخرت میں البتہ نیکو کاروں میں شمار ہوگا ﴿۱۳۰﴾ جب اُس کے رب نے فرما دیا
ہو جاؤ۔ تو اُس نے کہا میں فرما نہ رہا ہوں چکا ہوں رب العلمین کے لیے ﴿۱۳۱﴾ اور ابراہیم
(علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں کو اس امت پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ اور یعقوب (علیہ السلام)
نے بھی۔ اور کہائے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین کو چن لیا ہے پس
تم نہ مردہ مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو ﴿۱۳۲﴾ کیا تم حاضر
تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کو موت آئی تھی جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے
کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے، تو انہوں نے کہا کہ ہم عبادت کریں گے
تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد، ابراہیم، اسمعیل، اور اسحق (علیہم السلام)

کے معبود کی۔ وہی ایک معبود ہے اور ہم اس کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں (۱۳۳) یہ ایک عجبت ہے جو گزرتی ہے۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اُس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تم نے کیا۔ درمیان سے اُن باتوں کے متعلق نہیں یہ پچ جائے گا جو کچھ وہ کرتے تھے (۱۳۴)

اللہ تعالیٰ نے پہلے بیت اللہ شریف کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر کا ذکر فرمایا۔ اور پھر اسی ضمن میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دُعا کا ذکر کیا۔ دُعا میں سب سے پہلے عمل کی قبولیت اور اور پھر اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق طلب کی گئی تھی۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹے کی اولاد میں سے اُمتِ مسلمہ کے قیام اور پھر اُن میں سے ایک عظیم الشان رسول کی بعثت کی دُعا تھی۔ اور پھر اُن فراموش کا ذکر تھا جو آخری رسول انجام دے گا۔

یہاں پر مرکزی مسئلہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی ہے۔ کیونکہ اہل کتاب آپ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ یہ مرکزی مسنون آگے دُور تک جائے گا۔ ابتدا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دُعا کا ذکر ہے۔ اور پھر اس دُعا کے مصداق کا بیان ہے۔ تمہیں کہ دُعا کے خلیل سے ظاہر ہے۔ کہ وہ ذات، والصفات صریح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہو سکتی ہے آپ ہی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا خاندان قریش اُنی نسل سے ہی پھیلا رہا تھا۔ انہیں میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کا قیام فرمایا۔ اور دُعا کے مطابق انہیں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت کے بارے

آپ کی بعثت کے متعلق مندرجہ ذیل آیت میں آپ کی ابتدا کے بارے میں پوچھا۔ حضور! آپ کی ابتداء کیسے ہوئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اَنَا دَعَوَةٌ إِلَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَرُءُوفٍ أَمِّي وَبَشَارَةٌ عِيسَىٰ یعنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا، اپنی ماں کے خواب اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق ہوں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُنی دُعا کا ذکر ہے۔ جو گزشتہ دس میں گزر چکی ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۚ (۱۳۵) اللہ! ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

حضور علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے آپ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا۔ کہ ان کے پہلو

سے ایک ایسی روشنی نکلے گی جس سے شام اور بصری کے مہلات روشن ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی گردنیں نظر آرہی ہیں۔ اس حدیث کی ترجمانی مولانا الطاف حسین حالیؒ نے اپنی طویل نظم مرد و جزر اسلام میں خوب کی ہے۔

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہو یا دعائے غلیل و نوید مسیح

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی واضح کر دیا ہے۔ آپؐ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ میں تمہاری طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ میں اپنے سے پہلی کتاب توراة کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ ”وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ“ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں۔ جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہو گا۔ عبرانی اور سریانی زبان میں احمد کو فارقلیط کہا گیا ہے جس کا معنی دنیا بھر کا تعریف کیا ہوا۔

شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتیؒ غالب کے شاگرد تھے اور علوم دینیہ میں حضرت مولانا شاہ ابھن صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۶ء کی جنگ آزادی میں آپؒ زیر تعلیم تھے۔ مگر اس ہنگامے کی وجہ سے اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ آپ کا شمار قومی شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اسلام کے عزت و زوال کی داستان نہایت مؤثر انداز میں نظم کی صورت میں پیش کی ہے۔ آج کل لوگ میلادِ ثوانی کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی مدح کے نام پر کفریہ اور شرکیہ کلمات کہہ جاتے ہیں۔ ایسی تمام نعتوں کے مقابلے میں مولانا حالیؒ کا یہ ایک ہی شعر کافی ہے۔ حدیث کے مخزن کو ایک شعر میں کمال طریقے سے سمو کر حضور علیہ السلام کی تعریف کی ہے۔

تفسیر معالم التنزیل میں شانِ نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ کے بھائی کے دو بیٹے بھی صاحبِ علم تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ توراة میں یہ بیان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں بنی اسرائیل اور بنی اسمعیل میں ایک نبی مبعوث کروں گا۔

ہمیت کا شان
نزول

کا ارشاد گرامی ہے۔ مَنْ مَاتَ عَلَى شَيْءٍ ابْتَغَى اللَّهُ عَلَيْهِ جَوْشَخْصٍ جَسَّ عَقِيدَةٍ پرمے گا، اُمّی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ لہذا تمہاری موت دین حق پر آنی چاہیے۔ تاکہ روزِ محشر یہی دین لے کر اٹھو۔

یہودیوں کے لٹریچر میں اس وصیت کے ضمن میں حضرت اسحق علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کہ انہوں نے بھی اپنی اولاد کو ایسی ہی وصیت کی تھی۔ جب ان کا وقتِ موجود آ پہنچا، تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تم کو اس خدا کا واسطہ دیتا ہوں، جس کی صفاتِ الٰہیہ عظیم، قیوم اور عزیز ہے۔ اور جو آسمان و زمین کے درمیان ہر چیز کا خالق ہے۔ تم اُمّی خدا کا خوف رکھنا اور اُسی کی عبادت کرنا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی وقتِ آخر اپنے بیٹوں کو پاس بلا کر کہا۔ مجھے خدا شہ ہے۔ کہ تم میں سے کوئی بت پرستی اور شرک کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تو بیٹوں نے جواب دیا۔ سن اے اسرائیل! اے ہمارے باپ! ہمارا خدا وہی ہے جو سَمَوِیْنَ سَزَل ہے۔ اور جس طرح ایک خدا تعالیٰ پر تیرا ایمان ہے۔ اُسی طرح ایک خدا پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ بہر حال یہ حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت کا ذکر تھا۔ جو اس آیت میں بیان ہوا۔

اگلی آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ یہود و نصاریٰ کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ کہ تم ابراہیم، اسمعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام کو ماننے والے ہو۔ انہوں نے یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی۔ ان کی تعلیم تو واضح طور پر توحید پر مبنی تھی۔ فرمایا اس واقعہ کو یاد کرو وَاخْرَجْتُمُوهُمْ مِنْ دَارِ اِذْ حَضَرَ يٰعَقُوبُ الْمَوْتُ كَمَا تَمَّ اس وقت موجود تھے۔ جب یعقوب علیہ السلام کے پاس موت آئی۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِي جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے یہودیوں کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا مجھے شبہ ہے کہ تم میں کوئی شرک کی طرف میلان

جب تک وہ خود نہیں کھائے پئے گا۔ اسی طرح یسوع و نصاریٰ کے آباؤ اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک یہ خود ہیٹ دھرمی چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو نہ اپنائیں۔ فرمایا وَلَا تُسَلُّوْنَ عَصَاكَ اَنْتَ لَا یَعْمَلُوْنَ تَمَّ سے یہ نہیں پرہیز جاتے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد کا دین کیا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود ان کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگی۔ تمہارے اعمال کی باز پرس تمہیں سے ہوگی۔

وَقَالُوا كُذِّبُوا هُوَ مَا أَفَعَا لِي قَهْتَدُوا قَدْ بَلَغَ إِلَهُ قَدْرَهُ
 حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا
 أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَ
 يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أَفَعَىٰ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أَفَعَىٰ النَّبِيُّونَ
 مِنْ زَيْبٍ سَعًى لَا تَفَرَّقْ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ
 ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا
 وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيهِمُ اللَّهُ وَهُوَ
 السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً
 وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

ترجمہ: اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ، ہر بات پابان کے لئے
 پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ہرگز نہیں، بلکہ ہم قتلِ ابراہیم کی پیروں کریں گے جو ایک طرف
 (جھکنے والے رہتے تھے) اور شرک کرنے والوں میں نہیں تھے ﴿۱۳۵﴾ (اے ایمان والو!)
 اور ہم ایمان لائے ہیں اشد پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف اشارہ کی گئی ہے۔ اور یہ
 ابراہیم، اسماعیل، اسحق، یعقوب (علیہم السلام) ایمان کی اولاد پر اشارہ کی گئی ہے (اور
 ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو موسیٰ، عیسیٰ (علیہم السلام) اور دوسرے نبیوں کو
 ان کے رب کی طرف سے دی گئی ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق
 نہیں کرتے۔ اور ہم اسی پر درگاہ کی پیروں کرنے والے ہیں ﴿۱۳۶﴾ پس اگر یہ
 لوگ ایمان لے آئیں جیسا کہ ہم ایمان لائے۔ تو کوئی شک یہ ہر بات پابان کے اور انہوں نے
 درگاہ کی پس پشت مٹا لفت میں ہیں۔ پس مقترب اللہ تعالیٰ نسبت کرے گا آپ
 کے لئے ان سے۔ اور وہ مسخنے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۳۷﴾ (ہم نے)

اللہ کا ہمک اختیار کیا ہے۔ اور کون زیادہ بہتر ہے اللہ سے یا بتیار ہنگ کے

اللہ ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں (۱۳۸)

گزشتہ صفحہ پر

یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں کو وہ ملتِ ابراہیمی کے مخالف تھے۔ خصوصاً اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اپنی یہودیت اور نصاریت کو ہی ملتِ ابراہیمی خیال کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی یہی چیز اختیار کرنی دعوتِ مسیح تھی۔ مریضہ طبعہ کے اطراف میں بسنے والے یہودیوں میں ایک بڑا عالم عبد اللہ بن مسور یا مشور زمانہ تھا۔ اس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ یہودیت اختیار کر لیں ہدایتِ پابائیں گے۔ دلیل اُسی بھی یہی تھی کہ وہی اصل ابراہیمی طریقے پر قائم ہیں۔ ماریجہ ان کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت تورات کی بجڑی ہوئی شکل ہے۔ اور نصاریت انجیل کی مسخ شدہ صورت۔ انہوں نے آسمانی کتابوں میں شرک کی آمیزش کر کے اپنے مذہب کو باطل کر لیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف خالی نسبت پر ہی اتارتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل عقائد کو رد فرمایا ہے۔

اہل کتاب کا باطل کی طرف دعوت یہ تھا کہ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارًا تَهْتَدُوا۔ وہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ۔ ہدایتِ پابائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو رد فرماتے ہوئے نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کی دعوت کے جواب میں قُلْ بَلَّ مَلَكًا أَبَدًا۔ حنیف! آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہارا باطل مذہب اختیار کر لیں۔ اور اگر اس میں بگاڑ نہ بھی پیدا ہوا ہو تو بھی تورات اور انجیل تو منسوخ ہو چکی ہے۔ اب قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جو کہ پہلی کتابوں کی مسخ شدہ ہے لہذا اب تورات اور انجیل پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ یہودیت کا باطل طریقہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایجاد ہوا تو وہ یہودیت۔ ہرگز ان کا طریقہ نہیں بھیجے اختیار کیا جاسکے۔ اسی طرح موجودہ نصاریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو سو سال بعد ایجاد ہوئی ہے۔ موجودہ نصاریت کا پیش کردہ عقیدہ تثلیث ہرگز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نہیں ہے۔ لہذا یہ دونوں مذہب کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہیں۔

یہ ہدایت

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہر طریقہ ابراہیمی نہیں ہے۔ بَلَّ مَلَكًا أَبَدًا۔ حنیف! ہم تو اصل ملتِ ابراہیمی کی پیروی کریں گے۔ اس حقیقی ملت کو اختیار کر کے اپنی پروردگار

ہیں گے پہلی آیتوں میں گنہگار ہے کہ صحیح ملتِ ابراہیمی ہی ملتِ اسلام ہے۔ وَمِنْ ذَٰلِكَ
عَنْ مَلَكٍ رَّبِّهِمْ اَلَا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَا رَحْمَةَ لِّمُتَعَبِّينَ اور اس ملت سے انحراف نہ
کر لی بیوقوف ہی کر سکتا ہے۔ اور ان کا طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ ہے۔ اور اس
آخری دور میں تہذیبِ محمدی ہی ملتِ ابراہیمی کی اصل بنائیں گے۔ لہذا ہم تو اس ملت کا اتباع کریں
گے جو حضرت ابراہیم خلیفہ علیہ السلام کی ملت ہے۔ اور یہ اب شریعتِ محمدی کی شکل میں ہمارے
پاس موجود ہے۔

لفظِ ضعیف
کا معنی

ضعیف عربی زبان میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے پاؤں میں کمی ہو۔ اور وہ چلتے وقت
ایک طرف کو مائل ہو جاتا ہو۔ اس کو احف بھی کہتے ہیں۔ لفظِ ضعیف اُسی مانے سے ہے۔ اور
اس کا معنی ہے۔ ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والا یعنی یکسو۔ اور اصطلاحاً ضعیف اُس شخص
کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر حضرت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ ضَعْفٌ
لِللّٰهِ غَيْرُ مُشْرِكِيْنَ بِہٖ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی یہی آیا ہے۔ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ آپ ترک کرنے والوں میں نہ تھے۔ مگر جس یودیت اور نہایت
کی دعوت تم سے ہے ہو۔ وہ تو شرک سے آلودہ ہے۔ تم تو خدیجہ الوہیت کے قابل ہو
جسہں تشبیہ پائی جاتی ہے۔ لہذا ہم تمہارا شرک از دین قبول نہیں کر سکتے بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی کا اتباع
کریں گے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ضعیف تھے اور شرک سے پاک تھے۔

شاہِ راز اللہ محنتِ دہلوی اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ضعیف وہ شخص ہو
جسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو۔ حج کرنے والا ہو۔ نماز میں بیت اللہ شریف کی طرف رخ
کرنے والا ہو۔ فتنہ کرنے والا ہو۔ اور محرماتِ نکاح کو حرام سمجھتا ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی
تفسیر میں ملتِ ابراہیمی کی چالیس خصوصیات بیان کی ہیں جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں پر بحث کرے
وے سے مراد یہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانے ہو۔ بہ حالِ حضرت ابراہیم علیہ السلام
ضعیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ فرمادیں کہ تم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت

کا نباح کریں گے۔ تمہاری خود ساختہ یہودیت و نصرانیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پان بات

فرمایا کہ آپ اُن کو اہل کتب ابراہیمی کی تشریح بھی کر دیں۔ فَقُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ یعنی یوں کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر یعنی ہماری بنیادیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں سمجھتے۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ احوال و حرام میں کسی چیز میں اس کا شریک نہیں بناتے۔ بر خلاف اس کے بنی اسرائیل نے حلال و حرام کا منصب پارہ یوں کے پرہ کر رکھا ہے۔ جسے پارہ کی حلال کرے وہ حلال ہے۔ اور جس چیز کو پارہ کی حرام قرار دے، وہ حرام ہو جاتی ہے، حالانکہ تحلیل و تحریم تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ منصب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہاں جب نبی کسی چیز کی حلت و حرمت کا فتویٰ دیتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کردہ حکم کے مطابق ایسا کرتا ہے۔ خود اپنی مرضی سے کسی چیز کو حلال و حرام قرار نہیں دیتا۔ یہودی چونکہ حلال و حرام کا اختیار اپنے اجداد اور بہان کر سہیتے ہیں۔ اس لیے وہ تحلیل و تحریم میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تینوں
بیان

اہل ایمان کو خطاب ہو رہا ہے کہ ایمان باللہ کے بعد تمام کتب کا دیہ پر ایمان لانے کا بھی اعلان کرو و وَمَا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اِلَّا مَا هُمْ اِسْتَأْذَنُوا جو ہماری طرف نازل کی گئی یعنی قرآن پاک وَمَا اَنْزَلْنَا اِلَّا اِنْشَاءً وَاِنْشَاءً وَاِنْشَاءً اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر مکمل آسمانی کتابیں تو یہ ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر چھوٹے چھوٹے صحیفے بھی نازل فرمائے۔ چنانچہ قرآن میں سورہ ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا ذکر آتا ہے۔ یہاں پر اسی صحائف کا ذکر ہے۔ کہ جس طرح انجیل کتبہ کا دیہ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح صہبہ آسمانی، ایمان بھی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اصل ذکر سے اس آیت میں نصرت ابراہیم علیہ السلام کی آیتیں آتی ہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد اراغی سے جو کچھ فرمایا، اسے سب پر اور ان پر نازل ہوئے وہی ہیں۔

ایمان لانے کا شیوہ :-

فرمایا ہمارا ان کتابوں پر بھی ایمان ہے وَمَا أَوْلَىٰ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ حُرْمَتُی اور
عیسیٰ علیہما السلام کو عطا کی گئیں۔ یعنی توراۃ اور انجیل وَمَا أَوْلَىٰ النَّبِيُّونَ مِنْ دُونِهِمْ
اور اس چیز پر بھی ایمان لائے جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے دی
گئی۔ غرضیکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ اُگے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح انسان پر جس وقت اور جو کچھ اپنے پیغمبروں
کے ذریعے بھیجا ہے۔ سب پر ایمان فاعلام ہے۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہاں
ایک ایمان لانے کا تعلق ہے۔ تم زبور، توراۃ اور انجیل پر ایمان رکھو مگر وَلِیَعْلَمَ الْقُرْآنُ
عمل کرنے کے لیے تمہارے لیے قرآن پاک کافی ہے۔ یعنی سابقہ کتب پر عمل کرنے کی ضرورت
نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک نے سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔
اب قابل عمل احکام صرف قرآن کریم کے ہیں۔

اہم شافعی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں چار
تورہ عظیم کتابیں ہیں۔ یعنی زبور، توراۃ، انجیل اور قرآن کریم اور سو چھوٹی کتابیں صحیفے ہیں۔ جو حضرت
آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے۔ ایسے ہی صحیفوں
کا ذکر حضرت یونس، حضرت الیوب، حضرت سلیمان علیہم السلام اور دیگر کئی انبیاء کرام کے ساتھ بھی
آتا ہے۔ موجودہ مجموعہ کتب مقدسہ بائبل کہتے ہیں، اس میں ۳۹ صحائف شامل ہیں۔ ان کتابوں
اور صحائف میں اگرچہ بہت کچھ تحریف و تزیین ہو چکا ہے۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور
ہمارا ان سب پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بذریعہ وحی انبیاء کرام پر نازل فرمائے۔

رسول اللہ پر ایمان

آگے اس بات کا اقرار ہے لَا تَفْشَقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ہمارا ان تمام
رسولوں پر بھی مکمل ایمان ہے۔ جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔ بلکہ ان انبیاء کرام پر بھی ایمان ہے
جن پر کوئی باقاعدہ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ اور ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے جھقیقت
یہ ہے کہ ایمان مکمل اُسی صورت میں ہوتا ہے۔ جب تمام انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان ہو

کسی پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا۔ یہ تو کفر کے مترادف ہے۔ بنی اسرائیل اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ دو بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر تو ایمان لائے مگر نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ دیکھو! اہل اسلام تمام سابقہ انبیاء کرام پر یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام و دیگر سب پر ایمان رکھنے کے ساتھ نبی آخر الزمان علیہ السلام پر بھی ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ دو دو نصاریٰ آخر نبی کے منکر ہیں۔ اس لیے یہ کافر ٹھہرے ہیں۔ لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ كَمَا مَطْلَبُ یہ ہے کہ ہمارے تمام انبیاء کرام پر یکساں ایمان ہے۔ ہم کسی میں بھی تفریق نہیں رکھتے۔ جو انبیاء کرام ہیں تو ہم کی طرف اور جس زمانے میں بھی مبعوث ہوئے، اگرچہ ہم انہیں جانتے نہیں مگر ان کی بعثت کے یکساں طور پر قائل ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل ایمان! تمہارے برحق ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور اس کی تمام کتابوں کو برحق مانتے ہو۔ اور ان میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے۔ وَخُنَّ لَهُ مُسْلِمُونَ اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں جس نے تمام انبیاء اور کتابیں نازل فرمائیں۔ اور یہی ملتِ ابراہیمی کا اصول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار دیا۔ اور فرمایا فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُ بِهِ اگر یہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ بھی اُسی طرح ایمان لائے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو فَقَدْ اهْتَدَوْا تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے گویا نزولِ قرآن کے زمانہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہ معیارِ قرار پائے مگر بعد میں آئے والوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ بھی انہیں کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ بھی اُسی معیار پر پرکھے جائیں گے۔ چونکہ اُس زمانے کے یہود و نصاریٰ صحابہ کے معیار پر پورے نہ اُترے۔ وہ اس طرح تمام انبیاء کرام اور تمام کتابوں پر ایمان نہ لائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایمان لائے تھے۔ لہذا وہ مردود ہوئے۔ آج بھی جو کوئی صحابہ کرام کے طریقے کے خلاف کرے گا۔ گمراہ ہوگا۔ اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے ناجیِ گمراہ کے متعلق فرمایا مَا أَنَا عَلَيْهِمْ وَأَصْحَابِي

مبارق

یعنی نجات یافتہ وہی لوگ ہوں جو میرے اور میرے عتاب کے طریقے پر ہوں گے۔ باقی سب گمراہ ہوں گے۔ صحابہ میں سے آپ نے خلفائے راشدین المدین کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔
 کیونکہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام خطہ زمین پر دین کو استحکام بخشا۔ واقعہ یہ کہ جس تک کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو مسلمانوں سے ٹکرے سکے۔ سب مغلوب ہو چکے تھے۔ نہ صرف
 دلیل سے بلکہ سیاسی طور پر اسلام غالب آچکا تھا۔ یہ تو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے امین چیلش
 کی وجہ سے حالات نے پٹا کھایا۔ ورنہ پچاس سال تک اسلام ہزول سے غالب رہا۔

الغرض! یہ دو نصاریٰ کو فرمایا کہ تمہارا دین اور تمہارا ایمان درست نہیں ہے بلایت
 حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی دین حق پر اسی طرح ایمان لے آؤ، جس طرح اہل
 ایمان لاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ اپنی عند اور بہت دھرمی پر اڑے رہو گے تو ہدایت نہیں
 پاؤ گے۔

اہل ایمان
 کی کامیابی

فرمایا اگر یہ مکمل ایمان لانے کی بجائے وَإِنْ تَوَلَّوْا اگر یہ روگردانی کریں گے فَإِنَّكُمْ
فُتِنَ فِي شِقَاقِ تو یہ محض خند اور اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہ تو منصف مزاج ہیں
 اور نہ ہی حقیقت کے طلبکار ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے چاہیں۔ ان کی پروا نہ کریں فَيَكْفِيَنَّهُمُ
اللَّهُ ان کی طرف سے ہر شرف و د کے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا۔ آپ کو
 ان کی شرارتوں اور جیل ساز یوں سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو لوگ آپ کے متبع ہیں۔ وہ بھی ہامون ہو
 گے۔ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ آپ کے دشمن ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ آپ اور آپ کے
 ساتھی بالآخر کامیاب و کامران ہوں گے۔ چنانچہ اہل کتاب نے دیکھ لیا کہ عورتوں سے ہی عیسائی
 اسلام پورے عرب اور پھر اُدھی دنیا تک پھیل گیا۔ وہی اہل کتاب جو آپ کے خلاف طح طرح کی
 سازشیں کرتے تھے۔ انہیں مدینہ طیبہ اور دیگر قلعوں سے نکلنا پڑا۔

ملوکیت کی
 فطریات

صحابہ کرامؓ نے جو معیار قائم کیا تھا وہ بڑے اونچے درجے کا معیار تھا۔ اور اس پر کار بند
 رہنا ہی آسان نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں آنے والے لوگ اس معیار کو قائم نہ رکھ سکے اور خلافت کی بجائے

ملوکیت کا راستہ اختیار کر لیا۔ خلافت راشدہ کے طریقے کو پس پشت ڈال دیا اور عیاشی و فحاشی والا طریقہ اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی طرح یہ بھی ذلیل ہوئے۔ یہ درست ہے کہ بعد میں کچھ اچھے لوگ بھی آئے اور اسلام کو وقتی طور پر تقویت بھی حاصل ہوئی۔ مگر یکثیت مجموعی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ آگئی اور ہر صاحبِ اقتدار اپنی من مانی کرنے لگا۔ چوبہ کی افضل حق ہماری قوم کے بڑے مدبر انسان ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بڑے ذکھ کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بنی امیہ کا دور آیا تو انہوں نے خلافت راشدہ کے نفیس فرش کی جگہ شنشہ بیت کاٹاٹ بچھا دیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جو معیار حق صحابہؓ نے قائم کیا تھا اس میں زوال آگیا۔ اور امت میں اتفاق و اتحاد کا دامن مارا رہ گیا۔ جنگ اُمد میں اگرچہ شکست کا من کرنا پڑا مگر صبیحہ کرام نے **وَأَمُّهُمْ شَوْزَى بَيْنَهُمْ** پر عمل کر کے زمرن اس شکست کو برداشت کیا۔ بلکہ اپنے اتحاد کو اور مضبوط کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام عرب سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا۔

اہم البو بخیر جسام فرماتے ہیں کہ جس معاملہ میں وحی کے ذریعے رہنمائی نہ کی گئی ہو، اُس معاملے میں نبیؐ کے لیے بھی واجب ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرے۔ مگر ملوکیت کے راستے پر چل نکلنے والے صاحبِ اقتدار لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کا کہاں حق پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ تو اہلس کے راستے پر چلنے والے ہیں۔ کابل مصر اور بخارا وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں کے ملوک نے کس قدر ظلم کیے۔ اسلام کے صحیح طریقے کو چھوڑ کر باطل طریقے پر چل نکلے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر صدیوں سے زوال مچایا ہوا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو فرمایا کہ اگر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنی ضد پر اڑے رہیں تو آپؐ گھبراہٹیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔ ان کے مقابلے میں وہ تمہارے لیے کفایت کرے گا۔ **وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی دعا کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ اُس سے کچھ مخفی نہیں۔

مبغوثہ

فرمایا یہ آپ کو یہودیت اور نصرا نیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ آپ انہیں فرمایا بھیجے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ تمہاری باطل یہودیت اور نصرا نیت سے ہمارا کیا تعلق۔ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی دھاتی رنگ از قسم شہنشاہ نیلایا پیدا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی جلالت کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ رنگ ان کے اقوال و افعال اور اعمال پر کار کی وجہ سے اور چمکتا ہے۔ ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ یہودیت اور نصرا نیت والا رنگ نہیں جو کہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں تختی کا اظہار کرتے ہیں

فرمایا: وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ ہوگا۔ جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے۔ یہ ملت ہر ابھی کا رنگ ہے جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے۔ جو اس ملت پر صحیح معنوں میں کار بند ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سحر گزار ہیں۔ جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ وَنَخْنُ لَهُ عَبِدُ وُن اس لیے ہم اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

الْم

درس پنجاہ چہار

البقرة

(آیت ۱۳۹، ۱۴۱)

قُلْ اَتَحَاجُّوْنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا اَعْمَالُنَا
وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَحَنٌّ لَّهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُولُوْنَ اِنْ
اَبْرٰهٖمَ وَاسْمٰعِیْلَ وَاسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا
یُھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی قُلْ ؕ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ
مَا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے (اہل کتاب سے) کیا تم ہم سے ساتھ اللہ کے
بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی ہے۔ اور ہمارے
لیے ہمارے اعمال ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اور ہم اُسی کے لیے اخلاص
کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ کیا تم یوں کہتے ہو کہ (حضرت) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور
یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، آپ فرما دیجئے کیا تم زیادہ
جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ جو اس کو اپنی کو چھپاتا ہے۔
جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔ اور اللہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے۔
جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک جماعت ہے جو گنہگار ہیں۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے،
جو اس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے جو تم نے کیا۔ اور تم سے ان کاموں
کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ جو وہ کرتے تھے ﴿۱۴۱﴾

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو اپنے ہل مذہب کی زن
دعوت دیتے تھے کہ یہودی نصرانی بوجہ و توحیدیت پہاؤ گے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ
نے اہل ایمان سے کہلویا کہ ہم تو ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں اور اسی پر کار بند رہیں گے۔

۱۴۱

رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حالانکہ گذشتہ آیات میں گدڑ چکا ہے۔ کہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ
بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ اللہ جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے

_____ کسی ایک فرد یا قوم نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی رحمتیں صرف
انہیں کے لیے ہیں۔ اسی چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کھڑا کر کیا تم اللہ تعالیٰ کے پاس میں ہم سے
جھگڑا کرتے ہو۔ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ اس
میں جھگڑے کی کون سی بات ہے۔ اگر اس نے ایک زمانے میں کسی ایک خاندان کو برتری عطا
کی ہے۔ تو دوسرے زمانے میں دوسرے خاندان کو شرف بخشا ہے۔ کیونکہ وہ ساری مخلوق کا رب ہے
اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ وہ سب کا مالک ہے۔ لہذا تم میں آپس میں مخالفت نہیں پیدا کرنی
چاہیے۔ اور اگر تم نے ضرور جھگڑا ہی کرنا ہے۔ تو وَلَنَا أَعْمَالٌ وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ
ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ یعنی ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار
ہیں۔ اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ اور ہم تو صرف اُسی خالق و مالک
کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

اخلاص
فی الدین

اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہی ملتِ ابراہیم علیہ السلام کا بنیادی اصول ہے۔ تم
باطل نظریات کی طرف دعوت دیتے ہو۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کیا جائے۔ یہ ممکن
نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لا محدود ہے۔ وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے فیضیاب کئے
کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ بجز اللہ ہم نے ایمان تسلیم کر کے اپنے اندر اخلاص پیدا کیا
ہے۔ اور صحیح معنوں میں ملتِ ابراہیمی میں شامل ہونے میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے
اخْلَصْ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلٌ مِنَ الْعَمَلِ یعنی اپنے دین میں اخلاص پیدا
کر۔ تمہارا مقدر عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف مخلص عمل ہی قابل

قبول ہوتا ہے۔ ریاکاری اور دکھادے کا عمل ہمیشہ مردود ہوتا ہے۔ اہل کتاب کے عقائد اخلاص سے خالی ہیں۔ وہ ضدی اور عنادی میں۔ لہذا ہماری ان سے مصالحت نہیں ہو سکتی۔ مشرکین کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِہ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارا دین۔ اب صلح کی گنجائش نہیں۔ یہاں بھی اہل کتاب کو فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں اور ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں گویا یہ ایک چیلنج ہے کہ آئندہ جہاد کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا۔

انبیائے سابقین کا عقیدہ

اہل کتاب کا دعویٰ تھا کہ پہلے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے ہیں۔ وہ سب کے سب انہیں کے عقیدہ پر یہودی یا نصرانی تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان کے اس غلط دعوے کا جواب دے رہے ہیں۔ اَمْ تَقُولُوْنَ كَيْفَ يَكُنْ لَكُمْ دِينُكُمْ وَاسْمِعِيْلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَاَنَّهُمْ اَوْھُوْدًا اَوْ نَصٰرًا کہ حضرت ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ لَیْسَ بِغیرِ اَبِیْہِمْ فرمادیں کہ اس دعوے کے متعلق اَنْتُمْ اَعْلَمُ اِمَّا اللہ کی قسم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ کہ انبیائے سابقین کس طریقے پر تھے۔ فرمایا یہ حضرات یہودی تھے اور نصرانی بلکہ وہ تو ضعیف تھے۔ یعنی خاص اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے تھے۔ تمہاری یہ یہودیت یا نصرانیت تو تورات اور انجیل کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اور انبیائے متعلقین سے صدیوں بعد کی پیداوار ہے۔ ان کا ان باطل عقائد کے ساتھ کیا تعلق وہ تو خالص ملت اسلامیہ پر کاربند تھے۔ اور اُن کی تبلیغ کر کے سب سے خاص طور پر جب الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تو پہلے بھی کسی درس میں آچکے ہیں۔ مَا كَانَ اِبْرٰھِیْمُ يَھُودَیًّا وَلَا نَصْرٰنًیًّا وَلَکِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ یعنی آپ تو منصف اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔ آپ مشرکین میں سے قطعاً نہیں تھے۔ لہذا ان کی نسبت یہودیت یا نصرانیت کی طرف کرنا نہایت ہی قبیح حرکت ہے۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے نبی یہودیت اور نصرانیت کا باطل طریقہ کیسے اپنا کتے میں۔ جو انکار نبوت، عقیدہ تبشیر اور تفریق بین الانبیاء والا طریقہ ہے۔ ایسے باطل عقائد تمہیں مبارک ہوں۔ انبیائے سابقین ان سے مبرا تھے۔

اگے اہل کتاب کی ایک در زیادتی کو بیان فرمایا۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَبَ شَهَادَةً
عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ اسْ تُخْصِ سَ بڑھ کر کون ظالم ہوگا۔ جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے
گواہی موجود ہو۔ اور وہ اُسے چھپائے۔ یہ گواہی کون کی تھی۔ جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے۔
گواہی حضور علیہ السلام کی بعثت۔ قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے بائے میں تھی۔ آگے
آئے گا کہ بنی اسرائیل ایسا جان بوجھ کر کر لیتے تھے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ
یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے تھے۔ جس طرح اپنے بیٹوں کو۔
مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ
کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم
نہیں کرتے تھے۔ گویا توراۃ نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی۔ اُسے
چھپاتے تھے۔ انہیں کے متعلق فرمایا۔ کہ اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے۔ جو اپنے پاس
موجود شہادت کو چھپا جائے۔

شہادۃ کا چھپانا ویسے بھی گناہ ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ
شہادت کو چھپانے والے کا دل گنہگار ہے۔ بلکہ صحیح گواہی دینا تو ضروری ہو جاتا ہے بغیر
بجرب کہ وہ دین کے متعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ
اللہ تعالیٰ کے لیے شہادۃ کو قائم کرو۔ اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ظالموں میں
شمار ہو گے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی طرف سے کتاب شہادت کو سورۃ احزاب میں یوں بیان
فرمایا یُخَذُّونَ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ اس نبی اُمی کی
پیش گوئیاں اور حال توراۃ اور انجیل میں ان کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ حق بات کو
چھپا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی قبیح حرکات کا علم نہیں بلکہ وہ تو
رجیز کو جانتا ہے۔ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ وہ غافل نہیں ہے تمہارے
تمام کارروائی کو جانتا ہے۔ اور مناسب وقت پر تم سے مواخذہ کرے گا

یہ آیت گذشتہ سے پوچھتے درس میں بھی آئی ہے۔ یہاں اس کو دہرایا جا رہا ہے

اماموں کے ساتھ نسبت کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہی سال شارح طریقت کا ہے۔ اپنی نسبت بلند خاندانوں کی طرف کرتے ہیں۔ مگر ان کی ایک خوبی بھی نہیں پائی جاتی۔ آج چشتیہ اور قادریہ سلسلہ کی طرف نسبت کرنے والے کتنی لغو بات میں ملوث ہیں۔ یکیشیخ عبدالقادر جیلانی کا یہی طریقہ تھا۔ ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مواظظ اور دیگر تصنیفات ہیں۔ ایک ایک نقطے ایمان اور حقیقت پر پک رہی ہے۔ کفر اور شرک سے بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے مگر ان کی طرف نسبت کرنے والے کفر و شرک اور بدعت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے عرس منے جاسے ہیں۔ ان کی قبروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ رسومات باطلہ کا دور دورہ ہے۔ مگر نسبت ان کی طرف ہے۔ ایسی نسبت کیا فائدہ ملے گی۔

چشتی اپنے آپ کو خواجہ محمد حسین الدین چشتیؒ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ملک میں خواجہ محمد حسین الدین چشتیؒ، خواجہ فرید الدین گنج، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جیسے مشائخ کے ذریعے اسلام کی آبیاری ہوئی۔ ان کے ذریعے برصغیر کے کتنے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ کتنے لوگوں کا حلق باللہ قائم ہوا۔ ایسے بزرگوں کا اس خطہ ارضی پر کتنا احسان ہے۔ مگر تاج انہیں کے پرکار چشتیہ خاندان کی طرف نسبت کرنے والے راگ، رنگ اور گانے بجانے میں مشغول ہیں۔ قوالی کا نام دے کر کتنی ہی رسوم باطلہ کو اپنا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا۔ یہ خالی نسبت کام نہیں آئیگی۔ جب تک ان بزرگوں کے نقش قدم پر نہ چلیں گے۔ اسی سپر کو یودیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اہل ایمان کو سمجھایا گیا ہے۔ کہ وہ بھی یودیوں کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ بلکہ اپنے اندر حقیقی ایمان بیدار کریں۔

ہمارے ہاں امام ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت کر کے حنفی کہلانے والے لوگوں کی اکثریت ہے۔ مگر ان میں سے کتنے ہیں جو صحیح معنوں میں امام صاحب کے طریقے پر چلے جاتے ہیں۔ محض حنفی کہلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ جب تک آپ کا اتباع نہ ہوگا، اسی طرح امام شافعیؒ کی طرف نسبت کرنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنے طریقے پر قائم نہیں ہیں۔ دل میں تعصب بھرا ہوا ہے۔ لاکھ شافعی کہلا رہے ہیں، کچھ فائدہ نہیں۔ اس قسم کی خالی نسبت تو وہی یودیوں والی نسبت ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے۔ کہ ایمان لانے کے باوجود یہودیت کا راستہ

اعتیار نہ کریں۔ اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم ہیں۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کا نام لے لے کر فرمایا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المطلب خبردار! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن لوگ اعمال لے کر آئیں۔ اور تم محض خاندانی تعلق اور رشتہ داری لے کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں تمہیں نہیں پہچانوں گا۔ آج اپنی فکر کرو۔ اَلْهَذَا ذُو الْاَنْفُسِ كُفْرًا مِّنَ الشَّارِ اِتٰنِ جَانُوں کو دوزخ سے پہنچا لو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایمان کو درست کرو۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرو۔ اس طرح تم کو آخرت میں درجات نصیب ہوں گے

فرمایا یہ امت ہے جو گزر چکی۔ جو کچھ اس امت نے کھایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کھایا وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ان کے اعمال کے تعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کب کرتے تھے۔ بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔ تم سے سوال ہوگا۔ کہ تم نیکی اور توحید پر کار بند تھے یا نہیں۔ تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں۔ تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرک و افعال کی طرف بدلتے تھے۔ تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی بھگڑنے میں مصروف رہتے۔ آج اپنا محاسبہ کرو۔ قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائیگا۔

نمازِ مسنون ^{کلاں}

تالیف

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی

دَامَتْ بَرَکَاتُہُمْ

نمازِ مسنون غلہ کے بعد نمازِ مسنون کلاں ایک ایسی مفید اور نماز کے موضوعات کا مجموعہ ہے جو
 انسان کے تمام ضروری مسائل مع قوی دلائل از کتاب و سنت احادیث و مسند و تفسیر و احکام
 دینی و فقہی و فہم بہین عظام رحمہ اللہ تھیلے اور امر مجتہدین رحمہ اللہ تھیلے کے مضبوط اقوال سے
 مزین ہے جس میں طہارت اذان، اوقات نماز، فرائض، سنن و استحبات، رکعات و
 مسندات، کھڑا ہونا ہے۔ ارکان، واجبات و سنن کی پوری حکمت اور ضرورتی مباحث
 و مسائل۔ جمعہ و عیدین، نماز جنازہ اور نوافل وغیرہ کے جملہ اہم مباحث اور اس کے
 ساتھ ذکر دعوات اور خطبات کا ایک بہترین نصاب درج ہے۔
 امام قلینین کے علاوہ علماء کرام، اساتذہ عظام اور خصوصاً علماء علم دین کے بچے ایک نعت
 غیر مترقبہ ہے جس کا انداز بیان اور زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔
 عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، سیدی جلد بندی و قیمت ۱۶۰/- روپے

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

محلف اروق گنج، گوجرانوالہ

ملنے کے ہیں

۱۔ ادارہ نشر و اشاعت مدرستہ نصرۃ المسلمین گوجرانوالہ

۲۔ مکتبہ دروس القرآن فائق گنج، گوجرانوالہ

علماء کرام، طلباء عظام اور عوام الناس کے لیے گرانقدر علمی تحفہ

شمائل ترمذی

مع اردو ترجمہ و شرح

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ

مقدمہ، اضافہ، حاشیہ

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

یہ کتاب حضور ﷺ کے شمائل و خصائل کے شعبہ میں امام ترمذیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے جو کہ مدارس میں درس نظامی کے نصاب میں بھی داخل ہے اس کتاب کے کل چھپن ابواب ہیں جن میں سے ابتدائی چھپیس ابواب کی شرح نہایت دلنشین اور اچھوتے انداز میں منظر عام پر آگئی ہے۔ کتاب کی احادیث پر اعراب، سلیس اردو ترجمہ، عمدہ تشریح اور حواشی میں روایات کے اسماء و کنی، القاب، سن مولید و وفیات کے علاوہ بہت سے علمی، تحقیقی مواد پر مشتمل و محتوی ہے۔ عمدہ کتابت، نفیس طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ ۵۰۸ صفحات پر مشتمل جلد اول کی قیمت صرف ۱۳۰ روپے ہے باقی ابواب کی شرح انشاء اللہ العزیز جلد دوم میں شائع ہوگی۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان

معالم العرفان و ذرور القرآن

الطبعة

مفتی محمد رفیع صوفی عبد الحمید سواتی صاحب

رہنمائی

بایں احمد نائی صاحب

مترجم

الحاج علی دین صاحب (پیر سواتی)

زیر انتظام

انجمن مجاہدان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

مترجم سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

طرازی

محمد انور بٹ ایڈووکیٹ

ماہم مکتبہ (پشاور)

محمد رفیع صاحب Ph: 221943

مکتبہ ذرور القرآن گوجرانوالہ